'اُمُّ المُسَبِّحات'

یعنی

سورۃُ الحدید

کی

مختصر تشریح

از

ڈاکٹر اسرار احمد

مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب ـــــ حصہ ششم

اُمتِ مسلمہ سے خطاب کے ضمن میں
قرآن حکیم کی جامع ترین سورت
یعنی

اُمُّ المُسَبِّحات

سورۃُ الحدید

کی مختصر تشریح

از

ڈاکٹر اسرار احمد

مرتّب:

حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

فہرست

باب اوّل 7

چند تمہیدی امور

خصوصاً نظمِ قرآن کے حوالے سے

باب دوم ﴿آیات ۷ تا ۱۱﴾ 19

ذات وصفاتِ باری تعالیٰ کا بیان

جامع ترین انداز اور بلند ترین علمی اور فلسفیانہ سطح پر

باب سوم ﴿آیات ۱ تا ۶﴾ 95

خالق و مالکِ ارض و سماوات اور ذاتِ اوّل وآخر وظاہر وباطن

کے انسانوں سے دو تقاضے: ایمان و اِنفاق

باب چہارم ﴿آیات ۱۲ تا ۱۵﴾ 135

میدانِ حشر کی تاریکیوں میں اہلِ ایمان کے نور کی کیفیت ——اور

ایمان کے دعوے داروں کی اہل ایمان اور منافقین کے مابین تفریق

باب پنجم ﴿آیات ۱۶ تا ۱۹﴾ 165

مسلمانوں کو آمادۂ عمل کرنے کے لیے ترغیب و ترہیب ——اور

سلوکِ قرآنی......منزل بمنزل

باب ششم ﴿آیات ۲۰ تا ۲۴﴾ 240

حیاتِ دُنیوی کے ناگزیر مراحل ——اور

حیاتِ دنیوی اور حیاتِ اُخروی کا تقابل

باب ہفتم ﴿آیت ۲۵﴾ 273

قرآن حکیم کی عظیم ترین ''انقلابی'' آیت

ارسالِ رُسل اور انزالِ کتاب و میزان کی غرض و غایت:

قیامِ عدل وقسط

باب ہشتم ﴿آیات ۲۶ تا ۲۹﴾ 311

ترکِ دنیا و رہبانیت کی نفی ——اور

نجات اور فوز وفلاح کی واحد راہ: اتباعِ محمد ﷺ

36۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 5869501-03

باب اوّل
مشتمل بر

چند تمہیدی امور

خصوصاً نظمِ قرآن کے حوالے سے!

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ...... امَّا بَعد:
اعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اس سے قبل کہ ہم اس سورۂ مبارکہ کا سلسلہ وار لفظ بہ لفظ مطالعہ شروع کریں، حسب معمول چند تمہیدی امور کی طرف توجہ دلانی ضروری ہے۔ سب سے پہلی بات یہ کہ مصحف میں اس سورۂ مبارکہ کا مقام کیا ہے۔ ایک جملے میں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن حکیم کی سورتوں کے مکی و مدنی سورتوں پر مشتمل جو سات گروپ ہیں، ان میں سے چھٹے گروپ کی مدنی سورتوں میں اوّلین اور جامع ترین سورۃ، سورۃ الحدید ہے۔ لیکن اس ایک جملے کی کسی قدر وضاحت کی ضرورت ہے۔

سورتوں کی گروپ بندی

یہ بات تو متفق علیہ ہے کہ قرآن حکیم کی سورتیں تعداد میں ۱۱۴ ہیں۔ یہ ۱۱۴ سورتیں دو طرح کے گروپس میں تقسیم کی گئی ہیں۔ ایک تقسیم تو وہ ہے جو قدیم ہے، دورِ نبویؐ اور دورِ صحابہؓ سے اس تقسیم کا ذکر موجود ہے۔ یہ قرآن مجید کی سورتوں کی سات منزلوں یا سات احزاب میں تقسیم ہے، جبکہ مختلف گروپس میں قرآن حکیم کی سورتوں کی ایک تقسیم اور ہے جس کی طرف قرآن میں تدبر کرنے والے بعض حضرات کی توجہ ماضی قریب ہی میں منعطف ہوئی ہے، اور وہ یہ ہے کہ مکی اور مدنی سورتوں کے بھی قرآن مجید میں سات گروپس ہیں۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ قرآن حکیم میں پہلے تمام مکی سورتیں اور پھر تمام مدنی سورتیں آ گئی ہوں، یا اس کے برعکس پہلے تمام مدنی سورتوں کو جمع کر لیا گیا ہو اور پھر تمام مکی سورتوں کو جمع کر لیا گیا ہو۔ اگرچہ بعض اعتبارات سے یہ ترتیب تو نظر آتی ہے کہ طویل سورتیں پہلے ہیں اور چھوٹی سورتیں بعد میں ہیں، لیکن اس میں بھی کوئی معین قاعدہ کلیہ نہیں ہے، بلکہ مختلف مقامات پر فرق و تفاوت نظر آتا ہے۔ تو اب یہ مکی اور مدنی سورتوں کے جو مختلف گروپس بنتے ہیں ان پر جب غور کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ بھی تعداد میں سات ہی ہیں۔

جہاں تک سات منزلوں یا سات احزاب کا تعلق ہے وہ گویا حجم کے اعتبار سے پورے قرآن حکیم کو سات حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے کہ جو شخص ہر ہفتے میں ختمِ قرآن کر لینا چاہتا ہو، جیسا کہ بہت سے صحابہؓ کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ اس کا التزام کرتے تھے، تو سہولت رہے کہ ہر روز اگر ایک حزب یا ایک منزل کی تلاوت ہوتی رہے تو ایک ہفتے میں قرآن مجید ختم ہو جائے۔ اس تقسیم میں چونکہ سورتوں کو پورا پورا شامل کیا گیا ہے اس لیے یہ سات منزلیں حجم میں بالکل مساوی نہیں ہیں۔ پہلی منزل سوا پانچ پاروں کی ہے، باقی ہر منزل کم و بیش چار پاروں پر مشتمل ہے۔ اس تقسیم میں چونکہ سورتوں کی فصیلیں نہیں توڑی گئیں لہٰذا کچھ فرق و تفاوت ہے۔ البتہ دَورِ نبویؐ کی اس تقسیم میں ایک حسن نظر آتا ہے کہ سورۃ الفاتحہ کے بعد پہلی منزل میں تین سورتیں، دوسری منزل میں پانچ، تیسری میں سات، چوتھی میں نو، پانچویں میں گیارہ اور چھٹی منزل میں تیرہ سورتیں ہیں، جبکہ ساتویں منزل ''حزبِ مفصل'' کہلاتی ہے جو ۶۵ سورتوں پر مشتمل ہے۔

اس تقسیم سے معلوم ہوتا ہے کہ دورِ نبویؐ میں سورتوں کو ایک وحدت کی حیثیت سے برقرار رکھنے کی طرف بڑی توجہ تھی اور سورتوں کا توڑنا پسندیدہ نہیں تھا۔ اِس وقت جو ہمیں قرآن مجید تیس پاروں میں منقسم نظر آتا ہے، جنہیں ''سی پارے'' (تیس ٹکڑے) کہا جاتا ہے، یہ دورِ صحابہؓ کی شے نہیں ہے، بلکہ بعد کی تقسیم ہے۔ جب مسلمانوں میں تلاوت کا ذوق وشوق کم ہو گیا اور مسلمانوں نے سمجھا کہ اگر ہر مہینے ایک

قرآن مجید ختم کر لیا جائے تب بھی بڑی بات ہے تو غالباً کسی مصحف کے صفحات گن کر اسے تیس حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اور چونکہ یہ بعد کا کام ہے لہٰذا اس تقسیم میں دورِ نبویؐ اور دورِ صحابہؓ والا حسن برقرار نہیں رہ سکا اور سورتوں کی فصیلیں ٹوٹ گئی ہیں' بلکہ ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک سورت کی ایک آیت ایک پارے میں ہے اور بقیہ پوری سورت اگلے پارے میں چلی گئی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ سورۃ الحجر (پارہ ۱۳+ ۱۴) کے ساتھ یہ حادثہ ہوا ہے۔

سات احزاب کے علاوہ قرآن حکیم کی سورتوں کی ایک گروپ بندی اور بھی ہے۔ قرآن مجید میں ہمیں مکی اور مدنی سورتیں گڈمڈ نظر آتی ہیں' لیکن ان میں بڑی معنویت پنہاں ہے۔ چنانچہ ایک ترتیب میں آنے والی مکی اور مدنی سورتوں کو جمع کر کے اگر گروپ بندی کی جائے تو اس طرح بھی سات گروپ وجود میں آتے ہیں۔ اس طرح سے وجود میں آنے والے ہر گروپ کا آغاز ایک یا ایک سے زائد مکی سورتوں سے ہوتا ہے اور اختتام ایک یا ایک سے زائد مدنی سورتوں پر۔ یہ گروپ بندی معنوی لحاظ سے ہے' چنانچہ اس میں حجم کا لحاظ نہیں ہے۔ کوئی گروپ بہت طویل ہے اور کوئی بہت مختصر۔ لیکن اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مکی اور مدنی سورتوں کے اجتماع سے وجود میں آنے والے ہر گروپ کا کوئی ایک مرکزی مضمون ہوتا ہے جسے اس گروپ میں شامل مکی اور مدنی سورتیں مل کر مکمل کرتی ہیں۔ اس مضمون کا ایک رُخ اس گروپ کی مکی سورتوں میں بیان ہوتا ہے تو دوسرا رُخ اسی گروپ کی مدنی سورتوں کے ذریعے سامنے آتا ہے۔ یوں دونوں مل کر اُس مضمون کی تکمیل کرتے ہیں۔

پہلے اور آخری گروپ میں ایک عجیب عکسی (reciprocal) نسبت ہے کہ پہلے گروپ میں مکی سورت صرف ایک ہے' یعنی سورۂ فاتحہ جو نہایت مختصر سورۃ ہے اور کُل سات آیات پر مشتمل ہے' جبکہ مدنی سورتیں چار ہیں جو بہت طویل ہیں اور تقریباً سات پاروں پر پھیلی ہوئی ہیں' یعنی البقرۃ' آل عمران' النساء اور المائدۃ۔ اس کے بالکل برعکس ہے آخری گروپ جو آخری دو پاروں پر محیط ہے۔ اس کا آغاز سورۃ الملک سے ہوتا ہے اور تقریباً یہ پورے دونوں پارے مکی سورتوں پر ہی مشتمل ہیں' صرف آخر میں چھوٹی چھوٹی چند سورتیں مدنی ہیں۔ یہ تو تھا معاملہ پہلے اور آخری گروپ کا' درمیانی گروپوں میں بھی بڑا توازن نظر آتا ہے۔

دوسرا گروپ اور آخری سے دوسرا یعنی چھٹا گروپ اس پہلو سے نہایت متوازن ہیں کہ ان میں مکی اور مدنی سورتوں کا تناسب تعداد اور حجم کے اعتبار سے قریباً مساوی ہے۔ چنانچہ دوسرے گروپ میں الانعام اور الاعراف مکیات ہیں' جبکہ الانفال اور التوبۃ مدنیات۔ جبکہ چھٹے گروپ میں سات سورتیں مکی ہیں جو تقریباً ایک پارے یا اس سے قدرے زائد پر پھیلی ہوئی ہیں' اور دس سورتیں مدنی ہیں جو حجم کے اعتبار سے تقریباً سوا پارہ بنتی ہیں۔ گویا کہ وہی توازن جو دوسرے گروپ میں تھا یہاں چھٹے گروپ میں بھی موجود ہے۔ اس گروپ کے بارے میں یہ بات بڑی نمایاں ہے کہ اس کی مکیات فصاحت و بلاغت' ترکیبِ الفاظ اور صوتی آہنگ (rhythm) کے اعتبار سے قرآن مجید میں منفرد مقام اور نمایاں مرتبے کی حامل ہیں' یعنی سورۃ قٓ' سورۃ الذاریات' سورۃ الطّور' سورۃ النجم' سورۃ القمر' سورۃ الرحمٰن اور سورۃ الواقعہ۔ چنانچہ ان میں ایک سورۃ وہ بھی ہے' یعنی سورۃ الرحمٰن' جسے نبی اکرمﷺ نے ''عروس القرآن'' یعنی قرآن کی دلہن قرار دیا ہے۔ گویا لفظی اور ادبی اعتبار سے قرآن مجید کا حسین ترین حصّہ یہی ہے جو اِس گروپ کی مکیات پر مشتمل ہے۔

اس گروپ کی مدنیات بھی دو اعتبارات سے نمایاں مقام و مرتبہ کی حامل ہیں۔ ایک تو اس پہلو سے کہ مدنی سورتوں کا اتنا بڑا اکٹھ قرآن حکیم میں اور کہیں نہیں ہے' اور دوسرے اس پہلو سے کہ ان سورتوں میں اہم مضامین کے خلاصے آ گئے ہیں جن کی ہمارے نقطۂ نگاہ سے بڑی اہمیت ہے۔ قرآن مجید کے بہت سے اہم موضوعات بالخصوص وہ کہ جو مسلمانوں سے بحیثیتِ اُمتِ مسلمہ متعلق ہیں اور جو طویل مکی اور مدنی سورتوں میں تفصیل کے ساتھ آئے ہیں' ان سب کے خلاصے گویا ان دس چھوٹی سورتوں

---

(۱) جواب ''حقیقت ایمان'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہیں۔

کی شکل میں ہمیں عطا کر دیے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان دس میں سے چھ سورتیں ہمارے اس منتخب نصاب میں شامل ہیں‘ جن میں سے پانچ کا مطالعہ اس سے قبل ہم کر چکے ہیں‘ یعنی سورۃ الصّف‘ سورۃ الجمعۃ‘ سورۃ المنافقون‘ سورۃ التغابن اور سورۃ التحریم‘ جبکہ چھٹی سورۃ (الحدید) ہمارے زیر مطالعہ ہے۔

ان دس سورتوں میں سے پانچ کی اضافی امتیازی شان یہ ہے کہ ان کا آغاز تسبیحِ باری تعالیٰ کے ذکر سے ہوتا ہے‘ ﴿سَبَّحَ لِلّٰہِ﴾ یا ﴿یُسَبِّحُ لِلّٰہِ﴾ کے الفاظِ مبارکہ سے۔ چنانچہ ان کے لیے ایک مجموعی نام ’’المُسَبِّحات‘‘ تجویز کیا گیا ہے۔ یہ پانچ سورتیں سورۃ الحدید‘ سورۃ الحشر‘ سورۃ الصّف‘ سورۃ الجمعۃ اور سورۃ التغابن ہیں‘ جن میں سوائے سورۃ الحشر کے بقیہ چاروں سورتیں ہمارے اس منتخب نصاب میں شامل ہیں۔

سورۃ الحدید۔اُمُّ المُسَبِّحات

اس گروپ کی پہلی سورۃ‘ سورۃ الحدید ہے‘ جو اس سلسلۂ سُوَر کی طویل ترین سورۃ ہے اور چار رکوعوں میں پھیلی ہوئی ہے‘ جبکہ بقیہ نو سورتوں میں سے دو سورتیں تین تین رکوعوں کی ہیں اور باقی سات دو دو رکوعوں پر مشتمل ہیں۔ سورۃ الحدید کو اس پہلو سے اس گروپ کی جامع ترین سورۃ قرار دیا جاسکتا ہے کہ یہ اُن تمام مضامین کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے جو بقیہ سورتوں میں الگ الگ زیر بحث آئے ہیں۔ اس اعتبار سے اگر اسے ’’ اُمُّ الْمُسَبِّحَات ‘‘ کہا جائے تو بات غلط نہ ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ اُمت کے نام قرآن کا جو پیغام ہے‘ یا دوسرے لفظوں میں قرآن حکیم جو کچھ اُمتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے بحیثیتِ اُمت کہنا چاہتا ہے‘ اس کا خلاصہ اس ایک سورۂ مبارکہ میں پورے طور پر موجود ہے۔

سورۃ الحدید کے مضامین کا اجمالی تجزیہ

اس سورۂ مبارکہ کے مضامین کا تجزیہ اصلاً تو سلسلہ وار درس میں آئے گا‘ تاہم آغاز میں اس کے مضامین کا ایک اجمالی تجزیہ آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔

اس کا پہلا حصہ چھ آیات پر مشتمل ہے۔ ذات وصفاتِ باری تعالیٰ کے بیان پر یہ چھ آیتیں میرے علم کی حد تک قرآن حکیم کا جامع ترین مقام ہے۔ اور یہی وہ اصل علم ہے جس کو ’’العلم‘‘ کہا جائے گا‘ اس لیے کہ دین کی جڑ بنیاد ایمان ہے اور ہم حقیقتِ ایمان پر بڑی مفصل بحثیں کر چکے ہیں۔(۱) اگرچہ ایمانیات میں تعدّد ہے‘ اللہ پر ایمان‘ آخرت پر ایمان‘ رسالت پر ایمان‘ کتابوں پر ایمان‘ فرشتوں پر ایمان‘ لیکن اصل ایمان ’’ایمان باللہ‘‘ ہے۔ اسی لیے ایمان مجمل میں صرف ایمان باللہ ہی کا ذکر ہے:

’’ آمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَصِفَاتِہٖ وَقَبِلْتُ جَمِیْعَ اَحْکَامِہٖ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ‘‘.

چنانچہ مجملاً ایمان نام ہے ایمان باللہ کا۔ اور ایمان باللہ کا خلاصہ کیا ہے؟ اللہ کی معرفت! اور اُس کی معرفت ذات وصفات کے حوالے سے ہوگی۔ جامعیت کے اعتبار سے اور فہم وشعور کی اعلیٰ ترین سطح (Highest level of consciousness) پر ذات وصفاتِ باری تعالیٰ کا بیان ان چھ آیات میں ہے جو سورۃ الحدید کے شروع میں وارد ہوئی ہیں۔ اس کی کچھ جھلک ہمیں سورۃ التغابن میں ملتی ہے‘ کچھ جھلک مکی سورتوں میں اور پھر سورۃ الشوریٰ میں ملتی ہے‘ لیکن اس ضمن میں جامع ترین اور بلند ترین بحث ان چھ آیتوں میں ہے۔

سورۃ الحدید کا دوسرا حصہ پانچ آیات (۷ تا ۱۱) پر مشتمل ہے۔ یہاں بھی جامعیت کی انتہا ہے کہ دین کے کُل تقاضے صرف دو الفاظ ’’ایمان‘‘ اور ’’اِنفاق‘‘ کے حوالے سے آ گئے ہیں:

﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَکُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْہِ ط فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَاَنْفَقُوْا لَھُمْ اَجْرٌ کَبِیْرٌ ﴾

یعنی اگر تم یہ دونوں تقاضے پورے کرتے ہو تو تمہارے لیے اجرِ کبیر ہے۔ اور اگر نہیں کرتے ہو تو پھر ملامت ہے‘ زجر ہے اور ڈانٹ ڈپٹ کا انداز ہے کہ: ﴿وَمَا لَکُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ ج﴾ ’’تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں رکھتے!‘‘ کیوں تمہارا اعتماد اور توکل اللہ کی ذات پر قائم نہیں ہے؟ ﴿وَمَا لَکُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ﴾

"تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے!" تم اپنا مال اللہ کے راستے میں کیوں نہیں کھپاتے، کیوں نہیں لگاتے؟

تیسرا حصہ چار آیات (۱۲ تا ۱۵) پر مشتمل ہے جس میں اس تقسیم کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو میدانِ حشر میں ہوجائے گی۔ جن لوگوں نے بھی اس معاملے (ایمان اور انفاق) میں گریز کی راہ اختیار کی تھی وہ منافق قرار پائیں گے اور اہل ایمان سے اس طرح الگ کر دیے جائیں گے جیسے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔ میدانِ حشر میں ایک خاص مرحلہ ایسا ہے کہ جس میں مؤمنین صادقین اور منافقین میں تقسیم ہوجائے گی۔ ایک تقسیم تو مسلمان اور کافر کی ہے، جبکہ ایمان کا دعویٰ کرنے والوں میں پھر تفریق ہوگی کہ کون مؤمنین صادقین ہیں اور کون منافقین! مؤمنین صادقین کو اُن کے قلبی ایمان کی گہرائی کی نسبت سے نور عطا کیا جائے گا، جو کسی کو کم اور کسی کو زیادہ ملے گا۔ حضور ﷺ نے خبر دی ہے کہ اس نور میں اتنا فرق وتفاوت ہوگا کہ کسی کو اتنا نور ملے گا کہ جیسے اس کی روشنی مدینہ منورہ سے صنعاء تک پہنچ جائے اور کسی کو اتنا نور ملے گا کہ جس سے صرف اس کے قدموں کے آگے روشنی ہو جائے۔ اس کی سادہ سی مثال ٹارچ کی ہے۔ اگر اندھیری رات میں آپ کسی پگڈنڈی پر چل رہے ہوں اور آپ کے ہاتھ میں چھوٹی سی ٹارچ ہو تو وہ بھی بہت بڑی نعمت ہے۔ اور اس روز جو نور انبیاءِ کرام علیہم السلام کو ملے گا یا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو عطا ہوگا اُس کا تو کیا ہی کہنا ہے! ظاہر ہے کہ اس نور میں اور ایک عام مسلمان کے نور میں بہت فرق وتفاوت ہوگا۔ بہرحال جن کے دلوں میں کچھ بھی ایمان ہوگا وہ ایک طرف اور جو ایمان سے بالکل خالی ہوں گے، یعنی منافق، وہ دوسری طرف ہو جائیں گے اور ان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی۔ پھر اسی ضمن میں نفاق کی حقیقت اور نفاق کے مختلف مراحل بھی اسی حصے میں بیان ہوئے ہیں کہ کیسے یہ مرض آگے بڑھتا ہے۔ اس ضمن میں یہ جامع ترین مقام ہے۔

سورۂ مبارکہ کا چوتھا حصّہ بھی چار آیات (۱۶ تا ۱۹) پر مشتمل ہے۔ اس میں اصلاح کی ترغیب دی گئی ہے اور حوصلہ افزائی کی گئی ہے کہ اگر تم اپنے باطن میں جھانکو اور محسوس کرو کہ ایمانِ حقیقی موجود نہیں ہے تو بھی گھبراؤ نہیں، ابھی مہلت ہے، کمر ہمت کسو اور اصلاحِ احوال کی کوشش کرو، ایمان کے حصول کی کوشش کرو۔ اس کے لیے راستہ اور طریقہ بھی بتا دیا گیا۔ یوں سمجھئے کہ ان چند آیات میں "سلوکِ قرآنی" جامعیت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔

پھر پانچواں حصّہ پانچ آیات (۲۰ تا ۲۴) پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں حیاتِ دُنیوی اور حیاتِ اُخروی کا تقابل آیا ہے اور انسانی زندگی کے مختلف مراحل یعنی بچپن، اس کے بعد نوجوانی اور پھر جوانی کا دَور، پھر ادھیڑ عمر اور پھر بڑھاپا، ان کو بڑی خوبصورت تمثیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ ہر انسان کو بہرحال ان مراحل سے گزر کر لامحالہ قبر میں جا اترنا ہے۔ یہ زندگی ان مراحل سے گزر کر بہرحال ختم ہو جائے گی اور ایک ابدی زندگی آخرت کی ہے، جس میں انسان کو دو انجاموں میں سے کسی ایک انجام سے دوچار ہونا ہے۔ اس اعتبار سے حیاتِ دُنیوی اور حیاتِ اُخروی کا تقابل آ گیا۔ اور پھر یہ کہ حیاتِ دُنیوی میں انسان کو جو کچھ مصائب اور ناگوار حالات سے سابقہ پیش آتا ہے، اس کی اصل حقیقت کھول کر دکھائی گئی۔

اس سورۂ مبارکہ کا چھٹا حصّہ صرف ایک آیت پر مشتمل ہے اور وہ ہے آیت ۲۵، جس کے بارے میں میرا یہ قول بہت سے احباب کے علم میں پہلے سے ہوگا کہ پوری دنیا کے تمام انقلابی لٹریچر میں اتنا "عریاں" انقلابی جملہ آپ کو نہیں مل سکتا جو سورۃ الحدید کی اس آیت میں ہے۔ یہاں اس انقلابِ عظیم اور اس کے تمام مراحل کا ذکر ہے جو قرآن برپا کرنا چاہتا ہے۔ ہم نے انبیاء کو بھیجا، کتابیں نازل کیں، شریعت اتاری اور پھر یہ میزان نازل فرمائی، آخر کس لیے؟ اس لیے تاکہ عدل اور انصاف قائم ہو۔ اب عدل و انصاف کو قائم کرنے کے لیے انقلاب لانا پڑے گا۔ اس کے لیے جہاں ترغیب ہے، تشویق ہے، دعوت ہے، تعلیم ہے، وہاں لوہے کی طاقت بھی استعمال کرنی پڑے گی۔ ﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ﴾ "اور ہم نے لوہا بھی اتارا"۔ اسی آیت کے حوالے سے اس

سورت کا نام سورۃ الحدید ہے۔ طاقت کے بغیر کبھی بھی نظام نہیں بدلا کرتا۔ اس کے بغیر عدل وانصاف قائم نہیں ہوسکتا۔ طاقت استعمال کرنی پڑتی ہے' جانیں دینی پڑتی ہیں۔ اور درحقیقت اللہ تعالیٰ اپنے ان جان نثار بندوں کا امتحان لے رہا ہے جو ایمان کے دعوے دار ہیں کہ آیا وہ اس نظامِ عدل وقسط کو قائم کرنے کے لیے اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر اور لوہے کی قوت ہاتھ میں لے کر میدان میں آتے ہیں یا نہیں! کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر بات بالکل واضح کر دی گئی کہ انقلابی عمل میں لوہے کی طاقت بھی استعمال کرنی پڑے گی' اس کے بغیر vested interest کبھی بھی جگہ چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دلیل سے قائل ہو جاتے ہیں۔ ایسے سلیم الفطرت لوگ ہر معاشرے اور ہر طبقے میں ہوتے ہیں' لیکن بحیثیت مجموعی ہر نظام میں مستکبرین اور مترفین پر مشتمل جو مراعات یافتہ طبقہ ہوتا ہے وہ کسی صورت اپنی جگہ چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتا' اس کے لیے طاقت کا استعمال لازمی ہے۔

اس سورۂ مبارکہ کا ساتواں اور آخری حصّہ چار آیات (۲۶ تا ۲۹) پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں جہاد وقتال اور انقلاب کے اینٹی کلائمکس یعنی رہبانیت کا ذکر ہے۔

میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہوٗ اللہ ہوٗ اللہ ہو!

اس رہبانیت کی نفی بھی کر دی گئی ہے کہ اگرچہ کچھ نیک دل لوگ اِدھر راغب ہو جاتے ہیں لیکن درحقیقت وہ راستہ جس پر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کے وفادار بندے چلیں' وہ رہبانیت کا راستہ نہیں ہے۔

سورۃ الحدید سے میری ذہنی وقلبی مناسبت

اس سورۂ مبارکہ کے بارے میں اپنا ایک تأثر تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کر رہا ہوں کہ بالکل آغاز میں جبکہ ابھی میں اپنے اس مشن کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا' اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سورۂ مبارکہ کے حوالے سے خصوصی انشراح عطا فرمایا تھا اور اس سے مجھے ایک خصوصی ذہنی وقلبی نسبت اور مناسبت عطا فرما دی تھی۔ یہ میں ۵۷۔۱۹۵۶ء کی بات کر رہا ہوں۔ اُس وقت سے میں مختلف مواقع پر اس کے دروس دیتا رہا ہوں۔

۱۹۵۸ء کا ذکر ہے کہ میں نے کراچی کی ایک محفل میں سورۃ الحدید کا درس دیا۔ اس محفل میں میرے اعزّہ میں سے ایک صاحب موجود تھے جو مجھ سے عمر میں بڑے ہیں' ان کی جماعت اسلامی کی رکنیت قبل از تقسیم ہند سے ہے۔ اس سے پہلے وہ علماءِ دیو بند میں سے خاص طور پر تھانوی حلقے سے وابستہ تھے۔ گویا کہ مذہبی اور دینی مزاج شروع سے ہے۔ انہوں نے جب میرا درس سنا تو اُس وقت کہا تھا کہ آپ کو اللہ نے قرآن مجید کے ساتھ جو مناسبت عطا کی ہے اس کے پیش نظر آپ میڈیکل پریکٹس اور دوسرے سارے دھندے چھوڑیں اور اب صرف دین کے پڑھنے اور پڑھانے میں لگ جائیں' آپ کے سارے اخراجات میرے ذمہ رہیں گے۔ بہرحال میں نے تو اس بات کو اُس وقت ہنس کر ٹال دیا تھا' لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اصل میں انسان کو قرآن مجید کی جو نعمت بھی ملتی ہے وہ محض پڑھنے پڑھانے سے نہیں ملتی' بلکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو قرآن حکیم کی جو تھوڑی بہت سمجھ دے دی ہو اُس پر وہ عمل کر رہا ہو تو پھر اس پر مزید دروازے کھلتے ہیں اور فہم قرآن کے کچھ اور پہلو منکشف ہوتے ہیں' پھر آدمی جب اپنے عمل میں اضافہ کرتا ہے تو پھر اور چیزیں سامنے آتی ہیں۔ اس طرح یہ درجہ بدرجہ انکشاف ہوتا ہے۔

مولانا مودودی مرحوم نے تفہیم القرآن کے مقدمہ میں بڑی پیاری بات لکھی ہے کہ قرآن مجید ایسی کتاب نہیں ہے جسے کوئی شخص اپنی لائبریری میں آرام کرسی پر بیٹھ کر لغت کی کتابوں اور ریفرنس بکس کی مدد سے سمجھ لے۔ قرآن اپنے آپ کو اس طور سے reveal کرتا ہی نہیں۔ وہ تو آپ کو جس جدوجہد میں لگانا چاہتا ہے اس میں آپ بالفعل لگ جائیے اور اس کے ساتھ ساتھ قرآن کا مطالعہ بھی کرتے رہیے اور اس کا درس بھی دیتے رہیے' تو واقعہ یہ ہے کہ رفتہ رفتہ پھر یہ گرہیں کھلتی چلی جاتی ہیں اور نئے نئے مضامین کا انکشاف ہوتا ہے۔ گویا۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے!

میرے بہت سے احباب نے بارہا مجھ سے کہا ہے کہ آپ قرآن مجید کی تفسیر لکھیں۔ میں نے ان سے صاف صاف کہا ہے کہ میرا یہ مقام ہی نہیں ہے۔ آج بھی میں سمجھتا ہوں کہ میرا یہ مقام نہیں ہے۔ البتہ سورۃ الحدید کے بارے میں میرے دل میں ایک آرزو پوشیدہ ہے کہ کبھی اللہ تعالیٰ موقع دے دے تو میں اس سورۂ مبارکہ کے مضامین کو اور جو بھی اس کے مختلف حقائق ودقائق مجھ پر منکشف ہوئے ہیں، قلم بند کر دوں۔ آپ بھی دعا کریں اللہ تعالیٰ مجھے اس کی توفیق عطا فرمائیں!

تمہیدی امور میں سے آخری بات یہ کہ مجھے اس سورۂ مبارکہ کے درس کے آغاز کے موقع پر ایک خوف بھی محسوس ہو رہا ہے، اور یہ خوف دو اعتبارات سے ہے، ایک تو طوالت کا خوف ہے کہ ہوسکتا ہے بات بڑھتی چلی جائے۔ میں حتی الامکان کوشش کروں گا کہ بات ایک حد تک رہے اور میری کوشش یہی ہوگی کہ بارہ نشستوں میں اس سورۂ مبارکہ کی تکمیل ہو جائے، لیکن میں اس کا یقین نہیں رکھتا، اللہ تعالیٰ جو چاہے گا وہی ہوگا۔ مزید برآں مجھ پر اس کی عظمت کا رعب بھی ہے، خاص طور پر اس کے پہلے حصے کو بیان کرنا واقعتاً آسان کام نہیں ہے۔ آپ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ انشراح عطا فرمائیں!
اب ہم اس سورۂ مبارکہ کا سلسلہ وار درس شروع کر رہے ہیں۔

بابِ دوم
مشتمل بر

سورۃ الحدید کی پہلی چھ آیات

جن میں

ذات وصفاتِ باری تعالیٰ

کا بیان

جامع ترین انداز

اور بلند ترین علمی اور فلسفیانہ سطح پر

وارد ہوا ہے

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرَّجیم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ وَہُوَ
الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ A لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ
یُحۡیٖ وَیُمِیۡتُ ۚ وَہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ B
ہُوَالۡاَوَّلُ وَالۡاٰخِرُ وَالظَّاہِرُ وَالۡبَاطِنُ ۚ وَہُوَ بِکُلِّ
شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ X ہُوَالَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ
فِیۡ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ ؕ یَعۡلَمُ مَا
یَلِجُ فِی الۡاَرۡضِ وَمَا یَخۡرُجُ مِنۡہَا وَمَا یَنۡزِلُ مِنَ
السَّمَآءِ وَمَا یَعۡرُجُ فِیۡہَا ؕ وَہُوَ مَعَکُمۡ اَیۡنَ مَا
کُنۡتُمۡ ؕ وَاللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ Δ لَہٗ مُلۡکُ
السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَاِلَی اللّٰہِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ E
یُوۡلِجُ الَّیۡلَ فِی النَّہَارِ وَیُوۡلِجُ النَّہَارَ فِی الَّیۡلِ ؕ وَہُوَ
عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ Φ﴾

پہلی آیت۔ تسبیح باری تعالیٰ کا مفہوم

سورۃ الحدید کا پہلا حصہ ابتدائی چھ آیات پر مشتمل ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کا آغاز ان پُرشکوہ الفاظِ مبارکہ سے ہوتا ہے: ﴿سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ﴾ ''تسبیح بیان کرتی ہے اللہ کی ہر وہ شے جو آسمانوں اور زمین میں ہے''۔ اس کا پہلا لفظ ''سَبَّحَ'' ہے۔ اس لفظ پر گفتگو اگرچہ سورۃ الصّف' سورۃ الجمعہ اور سورۃ التغابن کے ضمن میں ہو چکی ہے' لیکن بہرحال اب جبکہ ہم اس کا مطالعہ کر رہے ہیں تو میں تیزی کے ساتھ چند باتیں دہرا دینا چاہتا ہوں۔ اس کا ترجمہ ہم کرتے ہیں ''اللہ کی تسبیح کرتی ہے' پاکی بیان کرتی ہے ہر شے جو آسمان اور زمین میں ہے''۔ لیکن جان لینا چاہیے کہ لغوی طور پر لفظ ''سَبَّحَ'' کا مفہوم کیا ہے! سَبَحَ یَسۡبَحُ عربی زبان میں آتا ہے کسی شے کے تیرنے کے لیے۔ تیرنا پانی میں بھی ہو سکتا ہے' ہوا میں بھی اور خلا میں بھی۔ یعنی کوئی شے اپنی سطح پر برقرار رہے' نیچے نہ گرے۔ اگر پانی کی سطح پر ہے تو گویا کہ وہ تیر رہی ہے' اگر نیچے جائے گی تو ڈوب جائے گی۔ اسی طرح کوئی شے اگر خلا میں یا فضا میں حرکت کر رہی ہے' لیکن اپنے مدار پر برقرار ہے' اپنی سطح پر قائم ہے تو یہ ہے سَبَحَ یَسۡبَحُ یعنی تیرنا۔ یہ فعل لازم ہے۔ اس سے باب تفعیل میں ''سَبَّحَ یُسَبِّحُ'' آتا ہے' یعنی کسی شے کو تیرانا۔ یہاں پر اب یہ فعل متعدی بن گیا۔ کسی شے کو اس کی اصل جگہ پر' اس کی سطح پر برقرار رکھنا' اسے نیچے نہ گرانا یا نیچے نہ گرنے دینا۔ یہ اس لفظ کا لغوی مفہوم ہے۔

اللہ کی تسبیح کے کیا معنی ہیں؟ اللہ کا جو مقامِ بلند ہے' اسے اس پر برقرار رکھا جائے۔ کوئی ایسا تصور اُس کی ذات یا صفات کے ساتھ شامل نہ ہو جائے جو اُس کے شایانِ شان نہ ہو اور اس کے مقام سے فروتر ہو۔ اللہ کو اس کے اصل مقامِ رفیع پر برقرار رکھنا اللہ کی تسبیح ہے۔ اس کو اب ہم اس طور سے بیان کرتے ہیں کہ تسبیح سے مراد یہ کہنا ہے کہ اللہ پاک ہے' اعلیٰ ہے' ارفع ہے' ہر عیب سے مبرّا ہے' منزّہ ہے' نہ اس میں کسی اعتبار سے کوئی عیب ہے نہ کسی لحاظ سے کوئی نقص ہے۔ نقص اور عیب میں یہ فرق

ہے کہ عیب وہ شے ہے جو کہ ناپسندیدہ ہے اور نقص صرف کمی کا نام ہے۔ نہ کسی اعتبار سے اسے کوئی احتیاج لاحق ہے‘ جس کو ہم اپنی زبان میں کہیں گے کہ اس کی کَنّی کسی سے دبتی نہیں ہے‘ وہ مستغنی ہے‘ اس کو کسی کی کوئی احتیاج نہیں۔ تو اس بات کا اقرار کرنا کہ اللہ تعالیٰ ہر احتیاج سے‘ ہر عیب سے‘ ہر نقص سے‘ ہر کوتاہی سے اعلیٰ‘ ارفع‘ منزّہ اور مبرّا ہے‘ یہ تسبیح ہے۔

تسبیح کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تسبیحِ قولی ہے۔ جو ہم کہتے ہیں سُبْحَانَ اللّٰہِ‘ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ‘ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی‘ یہ تسبیح قولی ہے۔ یعنی زبان سے اللہ کی پاکی کا اور اللہ کے ہر اعتبار سے ایک ہستی کامل ہونے کا اقرار کرنا۔ جبکہ ایک تسبیحِ حالی ہے کہ کائنات کی ہر شے گویا اپنے وجود سے اللہ کی تسبیح کر رہی ہے کہ میرا خالق‘ میرا صانع‘ میرا ڈیزائنر‘ میرا Creator ایک ہستی کامل ہے کہ جس کے علم میں‘ قدرت میں‘ حکمت میں کہیں کوئی کمی نہیں۔ اس لیے کہ تصویر حقیقت میں اپنے مصور کے کمالِ فن یا نقصِ فن کا مُنہ بولتا ثبوت ہوتی ہے۔ اگر اس کے فن میں کوئی کمی ہے تو اس کی غمازی بھی تصویر کر دے گی۔ اور اگر اس کا فن کمال پر ہے‘ نقطۂ عروج پر ہے تو بھی اس کی تصویر زبانِ حال سے بول رہی ہوگی۔ تو یہ کُل کائنات اس معنی میں اللہ کی تسبیح کر رہی ہے۔

تسبیحِ حالی کا یہ مفہوم تو بالکل سمجھ میں آ جاتا ہے‘ لیکن قرآن مجید کے بعض مقامات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو کوئی زبان بھی دے رکھی ہے جس سے وہ اُس کی تسبیح کر رہی ہے۔ یہ بات اگرچہ ہماری سمجھ میں نہ آئے لیکن ایک تو قرآن مجید میں صراحت سے مذکور ہے کہ جب حضرت داؤد علیہ السلام حمد کے ترانے الاپتے تھے تو اس میں پہاڑ بھی ان کے ساتھ شریک ہو جاتے تھے اور پرندے بھی شامل ہو جاتے تھے۔ یہ قرآن مجید کی نصِ قطعی ہے۔ مزید برآں سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۴۴ میں ارشاد ہے: ﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِیْهِنَّ﴾ ’’اللہ کی تسبیح تو ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ ان آسمانوں اور زمین میں ہے‘ سب کر رہے ہیں‘‘۔ اب یہ تو مثبت پہلو ہوا‘ منفی طور پر پھر فرمایا: ﴿وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰـکِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ﴾ ’’نہیں ہے کوئی شے مگر وہ تسبیح کر رہی ہے اس کی تحمید کے ساتھ‘ لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھ سکتے‘‘۔ تو تسبیحِ حالی تو ہماری سمجھ میں آ رہی ہے‘ معلوم ہوا کہ کائنات کی ہر شے تسبیح قولی میں بھی مشغول ہے۔

قرآن مجید کے ایک اور مقام سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو قیامت کے دن لوگوں کے اعضاء کو بھی زبان دے دے گا‘ اور ان کے ہاتھ‘ ان کے کان‘ ان کی آنکھیں‘ ان کے اپنے اعضاء و جوارح اور ان کی اپنی کھالیں ان کے خلاف گواہی دیں گی۔ اور جب وہ کہیں گے: ﴿لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَیْنَا﴾ ’’(ہمارے اپنے اعضاء ہو کر) تم ہمارے خلاف گواہی کیوں دے رہے ہو؟‘‘ تو یہ اعضاء و جوارح جو جواب دیں گے قرآن مجید میں وہ قول نقل ہوا ہے: ﴿قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَیْءٍ﴾ (حٰمٓ السجدۃ: ۲۱) ’’وہ کہیں گے کہ آج ہمیں بھی نطق اور گویائی عطا فرما دی ہے اللہ نے جس نے ہر شے کو نطق اور گویائی عطا فرمائی ہے‘‘۔

یہ مختلف مقامات ہیں جن کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی ہر شے کو اللہ نے کوئی زبان بھی دی ہوئی ہے۔ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ حیوانات کی اپنی زبان ہے‘ آخر وہ ایک دوسرے کو اپنی بات سمجھاتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ آخر ایسے جانور بھی ہیں جو کالونیاں بنا کر مل جل کر رہتے ہیں‘ ان کا پورا نظام ہے‘ ان کا پورا کا پورا سِوِک (civic) سسٹم ہے‘ چاہے چیونٹیاں ہوں یا شہد کی مکھیاں ہوں‘ تو کیسے ممکن ہے کہ ان کی باہم گفتگو نہ ہوتی ہو! تو اس اعتبار سے یہ تسبیح‘ تسبیحِ حالی بھی ہے اور تسبیحِ قولی بھی۔

یہاں ’’سَبَّحَ‘‘ صیغۂ ماضی ہے۔ اس کے بعد دو اور سورتوں یعنی سورۃ الحشر اور سورۃ الصّف میں یہ لفظ اسی طرح آیا ہے‘ لیکن پھر سلسلۂ **مُسَبِّحات** کی آخری دو سورتوں (الجمعہ اور التغابن) میں یہ لفظ مضارع کے صیغے ’’یُسَبِّحُ‘‘ میں ڈھل گیا۔ ’’یُسَبِّحُ‘‘ کا لفظ ایک بار سورۃ الحشر کے اختتام پر بھی آیا ہے۔ اس طرح ان سورتوں میں تسبیح کا ذکر تین مرتبہ فعل ماضی میں ہوا اور تین ہی مرتبہ فعل مضارع میں۔

قرآن مجید ''مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ''یعنی ''آسمانوں اور زمین میں'' کے الفاظ کُل کائنات کی تعبیر کے لیے استعمال کرتا ہے۔ ہم فلسفیانہ زبان میں اس کے لیے کون و مکاں' کُل کائنات' The Total Universe جیسے مختلف الفاظ استعمال کریں گے' لیکن قرآن مجید نے اپنا اسلوب بہت سادہ رکھا ہے' کیونکہ اس کے مخاطبِ اوّل ایک ایسی قوم کے افراد تھے کہ جن کے ہاں پڑھنے لکھنے کا کوئی رواج نہیں تھا' فلسفہ اور منطق تو ان کے لیے بہت ہی بعید شے تھی۔ اس حوالے سے قرآن نے وہ انداز اختیار کیا جو فطرت کے بالکل قریب ترین اور سادہ ترین انداز ہے۔ چنانچہ آپ کو قرآن مجید میں کہیں کائنات کا لفظ نہیں ملے گا' جب بھی قرآن کُل کون و مکاں کہنا چاہتا ہے ''مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ'' کے الفاظ استعمال کرتا ہے' تاکہ ایک عام بدو بھی اس کو سمجھ لے' لیکن اس سے مراد کُل کائنات ہے' جس کے لیے ہم اگر زیادہ فلسفیانہ لفظ استعمال کریں تو ''کون و مکاں'' ہے' یعنی یہ جو بھی ٹائم اینڈ سپیس کمپلیکس (Time&Space Complex) موجود ہے اس میں ہر شے اللہ کی تسبیح میں مشغول ہے۔

اختیارِ مطلق اور حکمتِ کاملہ

آیت کے آخری ٹکڑے پر غور کیجیے: ﴿وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ﴾ ''اور وہ زبردست ہے' حکمت والا ہے۔'' اللہ تعالیٰ کے یہ دونوں اسماء اِن سورتوں میں بہت تکرار کے ساتھ آئے ہیں۔ سورۃ الصّف کے شروع میں بھی آئے' سورۃ الجمعہ کی پہلی آیت کا اختتام بھی ان دونوں اسماء کے ساتھ ہوا۔ سورۃ الحشر تو اس اعتبار سے بہت عجیب ہے کہ اس کے آغاز میں بھی تسبیح ہے' آخر میں بھی تسبیح ہے۔ پہلی آیت کے الفاظ ہیں: ﴿سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۚ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ﴾ اور آخری آیت کا اختتام ان الفاظ پر ہو رہا ہے: ﴿یُسَبِّحُ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ﴾ یعنی پہلی اور آخری دونوں آیتوں کے آخری الفاظ ''وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ'' ہیں۔ اسی طرح سورۃ التغابن کا اختتام بھی انہی الفاظ پر ہو رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اَسماء وصفات جو قرآن مجید کی اکثر آیات کے آخر میں آتے ہیں' یعنی جن پر آیات کا اختتام ہوتا ہے' بالعموم جوڑوں کی صورت میں آتے ہیں' جیسے وَھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ' وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ' وَھُوَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ ۔ تو یہ مختلف جوڑے آپ کو ملیں گے۔ یہ اگر الف لام کے ساتھ ہوں تو اسماء شمار ہوں گے اور بغیر الف لام کے' تنوین کے ساتھ ہوں' جیسے غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ تو صفات شمار ہوں گے۔ تو یہاں فرمایا: ﴿وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ﴾ ''وہ زبردست ہے' حکیم ہے''۔

ان دونوں اسماء کی باہم مناسبت کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے اسماء کو جوڑا گیا ہے تو کسی مناسبت کی وجہ سے جوڑا گیا ہے۔ ان دونوں اسماء میں بہت گہرا ربط ہے۔ ''عزیز'' کہتے ہیں ایسی ہستی کو جس کا اختیار مطلق ہو' جس کی اتھارٹی کو چیلنج کرنے والا کوئی نہ ہو' آخری اختیار اُس کے پاس ہو۔ لفظ ''حکیم'' کے دو مفہوم ہیں۔ ''ح ک م'' مادہ سے لفظ حکمت بھی بنا ہے اور اسی سے حکومت اور حاکم بھی بنا ہے' تو لفظِ حکیم اپنے اندر بہت سے معنی رکھتا ہے۔ لیکن یہاں پر عام طور پر ترجمہ کیا جاتا ہے: حکمت والا' دانا۔ ہمارے عام مشاہدے اور انسان کے عمومی تصور سے یہ بات سامنے آتی ہے' خاص طور پر پولیٹیکل سائنس میں یہ بحث بڑی تفصیل کے ساتھ آتی ہے کہ جہاں بھی اختیار ہوگا اس کے ناجائز استعمال کا احتمال ہوگا۔

> *"Authority tends to corrupt and absolute authority corrupts absolutely."*

یہی وجہ ہے کہ دستور سازی میں سب سے اہم اور سب سے پیچیدہ مسئلہ یہی ہوتا ہے کہ جہاں کوئی اتھارٹی ہو وہاں کوئی روک تھام اور احتساب کا نظام بھی ہونا چاہیے' ورنہ یہ کہ اگر صاحبِ اختیار بدعنوان ہو جائے' جہاں کسی کی ذات میں زیادہ اختیارات مرکوز ہو جائیں اور اس کے دماغ کے اندر خناس پیدا ہو جائے تو وہ لامحالہ ان اختیارات کا

ناجائز استعمال کرے گا۔ لٰہذا checks & balances ہونے چاہئیں۔ چنانچہ مملکتوں کے جو دستور بنتے ہیں ان میں سب سے نازک مسئلہ یہی ہوتا ہے کہ اختیارات میں ایک توازن ہو' بیلنس ہو' اور جہاں اختیار ہو وہیں پر کوئی احتساب کا نظام بھی موجود ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات ہمارے اس تصور سے وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے اور اس کا اختیارِ مطلق حدود و قیود سے ماوراء ہے۔ البتہ جہاں وہ اختیارِ مطلق کا مالک ہے وہیں الحکیم بھی ہے' اس کی حکمت بھی کامل ہے۔ اس کا اختیارِ مطلق الل ٹپ استعمال نہیں ہوتا' حکمتِ کاملہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ کسی زمانے میں تو میں اس مفہوم کو ادا کرنے میں ذرا غیر محتاط الفاظ استعمال کر جاتا تھا کہ ''اس کا اقتدار اس کی حکمت کے تابع ہے''۔ یا یہ کہ ''اس کا اختیارِ مطلق حکمت کاملہ کے تحت استعمال ہوتا ہے''۔ لیکن یہ الفاظ ہمیں استعمال نہیں کرنے چاہئیں' کیونکہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات اپنی جگہ پر مطلق ہیں' کوئی صفت کسی دوسری صفت کے تابع نہیں ہے۔ اس لیے کہ جو تابع ہوئی وہ پھر مطلق نہ رہی' بلکہ محدود ہوگئی۔ اس لیے یہاں تعبیر کا بہتر انداز یہ ہوگا کہ جہاں اس کے اندر اختیارات کا ارتکاز ہے اس کے ساتھ ہی حکمت کاملہ بھی موجود ہے۔ تو اس کا اختیار حکمت کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ یہ ہے درحقیقت ان دونوں اسماء میں باہمی ربط۔

اُمت مسلمہ کی سب سے بڑی ذمہ داری

ان سورتوں (مُسَبِّحات) میں خطاب اُمت مسلمہ سے ہے اور اُمت مسلمہ کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ایسا سیاسی نظام یعنی نظامِ حکومت قائم کریں جس میں اللہ تعالیٰ کا دین بتمام و کمال قائم ہو جائے۔ اسی حوالے سے ان سورتوں میں اللہ تعالیٰ کے ان دو اسماء (اَلۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ) کو بار بار لایا گیا ہے۔ اسی طرح آپ دیکھیں گے کہ ان چھ آیات میں دو مرتبہ یہ الفاظ آ رہے ہیں: ﴿لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ﴾ ''آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے''۔ یہ الفاظ دوسری آیت میں بھی آئے ہیں اور پھر چھٹی آیت میں بھی۔ درحقیقت اللہ کی بادشاہت کا یہ تصور ہمارے دورِ زوال میں مسلمانوں کے ذہنوں سے نکل گیا۔ عقائد اور عبادات کی اہمیت تو پیش نظر رہی لیکن اللہ کی حاکمیت پر مبنی نظام قائم کرنے کا تصور خلافت راشدہ کے بعد رفتہ رفتہ ذہنوں سے محو ہوتا گیا۔ اس لیے کہ جب خلافت ختم ہوئی تو ملوکیت کا آغاز ہوگیا۔ اُس وقت اللہ کی حاکمیت کے قیام کے لیے کچھ کوششیں ہوئیں' حضرت حسین h نے کوشش کی' حضرت عبداللہ بن زبیر i نے کوشش کی' اس کے بعد اس سلسلے میں کئی اور کوششیں ہوئیں' لیکن یہ سب کوششیں دُنیوی اعتبار سے ناکام ہوگئیں' اگرچہ یہ سب لوگ اپنی جگہ پر اُخروی اعتبار سے کامیاب ہیں۔ جب یہ تمام کوششیں ناکام ہوگئیں تو مسلمانوں نے ذہناً تسلیم کر لیا کہ اب یہ حکومت اور ریاست کا معاملہ تو عصبیت کے بل پر چلے گا۔ کوئی قبائلی عصبیت مضبوط ہے تو وہ قبیلہ آ کر حکومت کر لے گا۔ کوئی شہنشاہ بابر آئے گا اور ہندوستان کے تخت پر متمکن ہو جائے گا اور اس طرح مغلیہ سلطنت کی بنیاد پڑ جائے گی۔ یہ چیزیں تو قبائلی عصبیت اور قوت کی بنیاد پر تسلیم کر لی گئیں' تو اس کے نیچے نیچے اب دین کیا رہ گیا؟ اب دین میں عقائد ہیں' عبادات ہیں اور کچھ نکاح و طلاق کے مسائل ہیں' اللہ اللہ خیر صلاّ۔

دورِ خلافتِ راشدہ کے بعد نظامِ حکومت میں جو تبدیلی آ چکی تھی اس کا اندازہ ذرا صحیح بخاری کی اس حدیث سے کیجیے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرما رہے ہیں: ''میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے علم کے دو برتن حاصل کیے۔ ان میں سے ایک برتن سے تو میں نے خوب تقسیم کیا' لیکن اگر دوسرے برتن کا مُنہ بھی کھول دوں تو میری گردن اڑا دی جائے گی''۔ اور حضرت ابوہریرہؓ کا تو ۵۹ ھ میں انتقال بھی ہوگیا تھا جبکہ ابھی حضرت امیر معاویہؓ کی حکومت تھی۔ گویا ابھی ننگی ملوکیت کا دَور تو آیا بھی نہیں تھا۔ حضرت معاویہؓ کے دورِ حکومت کو اگرچہ ہم دورِ خلافت راشدہ میں شامل نہیں سمجھتے' لیکن آپؓ بہرحال صحابیٔ رسولؐ ہیں' کاتبِ وحی ہیں' اپنی ذات کے اعتبار سے ایک صحابی کی حیثیت سے جو اُن کا منصب ہے اس پر انگلی نہیں اٹھائی جا سکتی۔ اس کے باوجود اُن کے دورِ حکومت میں نظام کی تبدیلی اس درجے آ چکی تھی کہ حضرت ابوہریرہؓ کہہ رہے ہیں کہ اگر میں دوسرے برتن کا مُنہ بھی کھول دوں تو میری گردن اڑا دی جائے گی۔

اس کے بعد تو معاملہ یہاں تک پہنچا کہ رفتہ رفتہ اللہ کی حکومت کا تصور ہی مسلمانوں کے ذہن سے نکل گیا اور دین کا تصور صرف یہ رہ گیا کہ اللہ کو ایک مانو' اللہ کے لیے نماز پڑھو' اللہ کے لیے روزے رکھو' اللہ کے لیے حج کرو۔ یہ ساری چیزیں تو برقرار رہیں مگر اللہ کی حکومت کو قائم کرنا ہمارے ذہنوں سے نکل گیا۔لیکن ان سورتوں میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ اسماء ''اَلْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ'' بار بار لائے جا رہے ہیں۔اور ''اَلْحَکِیْمُ'' کا دوسرا مفہوم ذہن میں رکھیے تو اس کے معنی حاکم کے ہو جائیں گے۔گویا العزیز بھی حاکم' الحکیم بھی حاکم۔حاکم اور حکیم میں وہی نسبت ہوگی جو عالم اور علیم میں ہے۔عالم اسم فاعل ہے' علیم اسی سے صفتِ مشبّہ ہے۔اسم فاعل میں کوئی فعل وقتی طور پر ہوتا ہے اور اگر وہی فعل کسی کے اندر دائم ہو جائے تو پھر وہ صفت مشبّہ بن جاتا ہے۔عالم : کسی شے کا جاننے والا اور علیم : جس میں یہ صفت مستقل اور پائیدار ہو گئی ہو۔اسی طرح حاکم وہ ہے جس کی حکومت قائم ہے' اور حکیم جس کی حکومت میں دوام ہے' استقلال ہے' ہیشگی ہے' پائیداری ہے۔تو اس اعتبار سے یہ دونوں الفاظ مترادف ہو جائیں گے اور ''وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ'' کا مفہوم ہوگا کہ وہ زبردست ہے اور وہ حاکمِ حقیقی ہے۔

اقتدار و اختیار اللہ کا

دوسری آیت میں فرمایا:

﴿ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾B

''اسی کے لیے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی' وہ زندہ کرتا ہے اور موت دیتا ہے' اور وہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

آیت کے آغاز میں جو حرفِ جار ''ل'' آیا ہے یہ عربی میں بہت سے معنوں میں آتا ہے' لیکن ایسے مقامات پر یہ اکثر و بیشتر دو معنوں کا حامل ہوتا ہے۔یہ لام تملیک کے لیے بھی ہو سکتا ہے اور استحقاق کے لیے بھی۔تملیک کا مفہوم ہے ''کسی شے کا مالک ہونا''، جیسے ھٰذَا الْقَلَمُ لِیْ ''یہ قلم میرا ہے'' یعنی میں اس کا مالک ہوں' یہ میری ملکیت ہے۔اور استحقاق یہ ہے کہ کسی کو اُس کا حق پہنچتا ہو۔اسی کو آپ انگریزی میں کہتے ہیں: de facto & de jure۔چنانچہ ﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ کا مفہوم ہوگا کہ آسمانوں اور زمین کی حکومت اور بادشاہی de facto بھی اسی کی ہے اور de jure بھی اسی کی ہے۔اسی کو حاکمیت کا حق پہنچتا ہے اور بالفعل بھی وہی حاکم ہے۔اسی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ مالک ہو اور بالفعل بھی وہی مالک ہے۔

اب دیکھئے کہ یہ لفظ ''ملک'' بھی دونوں معنی دیتا ہے۔''م ل ک'' ہی سے ملکیت اور مالک ہے' اور اسی سے مُلک ہے' یعنی حکومت' بادشاہی۔اسی لیے سورۃ الفاتحہ کی قراءت میں بھی ''مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ'' اور ''مَلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ'' دونوں قراءتیں موجود ہیں۔''مَلِک'' بادشاہ ہے اور ''مالِک'' کسی شے کی ملکیت کا حق رکھنے والا۔اور دونوں میں منطقی ربط یہی ہے کہ جو کسی شے کا مالک ہے اسی کو اختیار حاصل ہے کہ اسی کی مرضی کے مطابق اس میں تصرف ہو۔اس پہلو سے اللہ کی بادشاہی ''مُلک یا ملوکیت'' اور اللہ کی ملکیت دونوں باہم لازم و ملزوم ہیں۔اور ''لَهٗ'' میں یہ دونوں پہلو ہیں۔

دورِ حاضر کا سب سے بڑا شرک

میں اپنے ''خطباتِ خلافت'' اور دیگر خطابات میں یہ بات بڑی تفصیل سے واضح کر چکا ہوں کہ غیر اللہ کی حاکمیت کا تصور اِس دَور کا سب سے بڑا شرک ہے۔بادشاہی صرف اللہ کے لیے ہے۔اور اسی کی بہترین تعبیر علامہ اقبال نے اس طرح کی ہے ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی' باقی بتانِ آزری!

چاہے وہ فردِ واحد ہو' جو فرعون یا نمرود بن گیا ہو اور چاہے وہ حاکمیت جمہور کا تصور ہو۔یہ بات سمجھانے کے لیے میں نے بارہا یہ تمثیل دی ہے کہ گندگی کی کوئی ٹنوں وزنی گٹھڑی خواہ ایک شخص کے سر پر رکھی ہو اور خواہ اسے تولہ تولہ' ماشہ ماشہ تمام لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے' گندگی تو گندگی رہے گی۔فرعونیت اور نمرودیت یہ تھی کہ ایک فرد اقتدارِ اعلیٰ کا مدعی

تھا۔ فرعون نے کہا تھا: ﴿اَلَیۡسَ لِیۡ مُلۡکُ مِصۡرَ وَھٰذِہِ الۡاَنۡھٰرُ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِیۡ﴾ (الزخرف: ۵۱) ''کیا مصر کی حکومت میری نہیں ہے؟ اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہہ رہی ہیں؟'' یعنی یہ آب پاشی اور آب رسانی کا سارا نظام میرے اختیار میں ہے' جس کو چاہوں پانی دوں' جس کا چاہوں موگہ بند کر دوں۔ یہ تھا فرعون کا دعویٰ جس کو قرآن مجید نے تعبیر کیا کہ اس نے خدائی کا دعویٰ کیا: ﴿اَنَا رَبُّکُمُ الۡاَعۡلٰی﴾ ــــ لیکن یہی معاملہ آج یہ صورت اختیار کر چکا ہے کہ خدائی کا دعویٰ تقسیم ہو گیا ہے' اسے تمام لوگوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ نظری اعتبار سے سب حاکم ہیں۔ عوام کی حاکمیت (Popular Sovereignty) ہے' لیکن جان لیجیے کہ اسلام کے نزدیک حاکمیت صرف اللہ کی ہے۔ ﴿لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ﴾ آسمانوں اور زمین کی حاکمیت کا حق' حکومت کا حق صرف اُسی کو حاصل ہے اور بالفعل بھی وہی حاکم ہے۔

انسانی اختیار کی اصل حقیقت

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو تھوڑا سا اختیار دیا ہے اور وہ اسی کے بل بوتے پر حاکم بن کر بیٹھ گیا ہے' حالانکہ اگر آپ حقیقت کے اعتبار سے غور کریں تو معاملہ بالکل وہی نظر آتا ہے جس کو محاورے میں کہا جاتا ہے کہ چوہے کو ہلدی کی گانٹھ مل گئی تھی اور وہ پنساری بن کر بیٹھ گیا تھا۔ کیا حکومت ہے انسان کی! اپنے وجود پر تو اس کا اختیار چل نہیں رہا۔ اس کے اپنے جسم کا پورا نظام اللہ کے قانون میں جکڑا ہوا ہے۔ وہ اگر چاہے کہ میرے جسم کے فلاں حصے پر بال نہیں اگنے چاہئیں تو اسے اس کا بھی اختیار نہیں۔ وہ تو اگیں گے' آپ ان کو روک نہیں سکتے۔ آپ کی انتڑیوں کے اندر حرکت آپ کے اختیار میں نہیں ہے' وہ تو کوئی اور ہی قانون ہے' کسی اور ہی کی مرضی ہے جس کے تحت ان میں حرکت ہو گی۔ آپ کا دل آپ کے اختیار میں نہیں ہے' جب بند ہو جائے گا تو پھر آپ کی مرضی سے دھڑکنے والا نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ ہمارا اپنا پورا وجود اسی قانونِ خداوندی کے اندر جکڑا ہوا ہے۔ اذنِ ربّ کے بغیر پتا تک نہیں ہلتا۔ ہمارے اپنے وجود کے اندر بھی پورے کا پورا نظام اسی قانون کے شکنجے میں ہے۔ لیکن اللہ نے بس ایک اختیار دے رکھا ہے: ﴿اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوۡرًا﴾ یعنی چاہو تو شکر گزاری کی راہ اختیار کرو اور چاہو تو ناشکری کی روش اختیار کرو۔ یہ اسی کی دی ہوئی آزادی ہے' لیکن ہم نے ہلدی کی اس گانٹھ کے برتے پر اپنی بادشاہی کا تخت جما لیا ہے۔

ملحدین کے تصورِ موت وحیات کی تردید

آگے فرمایا: ﴿یُحۡیٖ وَیُمِیۡتُ﴾ ''وہی زندہ رکھتا ہے اور مارتا ہے۔'' نوٹ کیجیے کہ زمین و آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے' اگر میں یہ کہتا ہوں ''ہم مرتے ہیں' ہم جیتے ہیں۔'' گویا کہ موت اور زندگی کی نسبت ہم اپنی طرف کر رہے ہیں۔ یوں سمجھ لیجیے کہ یہ محجوبیت ہے' یعنی ہم پردے میں آ گئے' اوٹ میں آ گئے' اور یہی گمراہی ہے' جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ (اللہ تعالیٰ) ہمیں زندہ رکھے ہوئے ہے اور وہ جب چاہے گا ہم پر موت وارد کر دے گا۔ یہ کمالِ معرفت ہے۔ جیسے کسی نے کہا ہے ''مردی و نامردی قدمے فاصلہ دارد'' اسی طرح ہدایت میں اور ضلالت میں فرق صرف اتنا ہی ہے کہ ''اللہ جلاتا ہے' اللہ مارتا ہے'' اور ''ہم جیتے ہیں' ہم مرتے ہیں''۔ چنانچہ قرآن مجید میں کفار و مشرکین کا ایک قول نقل ہوا ہے' جسے ہم کہیں گے کہ یہ آج کے مادہ پرست ملحد انسان کا موقف ہے۔ فرمایا: ﴿وَقَالُوۡا مَا ھِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنۡیَا نَمُوۡتُ وَنَحۡیَا وَمَا یُھۡلِکُنَاۤ اِلَّا الدَّھۡرُ﴾ (الجاثیۃ: ۲۴) ''اور انہوں نے کہا زندگی بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے' ہم خود ہی جیتے اور خود ہی مرتے ہیں اور ہمیں نہیں ہلاک کرتا مگر زمانہ''۔ یہاں ''نَمُوۡتُ وَنَحۡیَا'' میں نسبت اپنی طرف ہے کہ ہم جیتے ہیں' ہم مرتے ہیں۔ اگر نسبت بدل کر یہ کہا جائے کہ ﴿یُحۡیٖ وَیُمِیۡتُ﴾ ''وہی زندہ کرتا ہے (یا زندہ رکھتا ہے) اور وہی موت وارد کرتا ہے'' تو اس فعل کی نسبت اللہ کی طرف ہو گئی اور یہی ہدایت ہے' یہی معرفت ہے' یہی توحید ہے۔

آیت کے آخر پر فرمایا: ﴿وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ﴾ ''اور وہ ہر شے پر قادر ہے۔''

مؤمن کا مطلوب ومقصود۔ معرفتِ ربّ

میں نے عرض کیا تھا کہ معرفتِ الٰہی ہی درحقیقت انسان کی سب سے زیادہ مطلوب ومقصود شے ہونی چاہیے' اس لیے کہ جتنی معرفت ہوگی اتنا ہی درحقیقت ہمارا عملی رویہّ بھی درست ہوگا۔ جتنا اللہ کی عظمت کا انکشاف ہوجائے گا اتنی ہی ہمارے اندر اللہ کے سامنے فروتنی اور سرافگندی کی کیفیت پیدا ہوجائے گی۔ کسی شاعر نے کہا ہے ع ''ان کا غرور دیکھ کر بن گئے خاکسار ہم!'' یہاں لفظ ''غرور'' تو مناسب نہیں' ''ان کا عروج دیکھ کر'' کہہ لیجیے۔ جتنا اللہ کی عظمت کا انکشاف ہوگا اتنا ہی انسان کے اندر تواضع' فروتنی اور گردن جھکا دینے کی کیفیت پیدا ہوگی۔ اس اعتبار سے اصل شے جو مطلوب ومقصود کے درجے میں ہے وہ معرفت ربّ ہے۔ بلکہ ہمارے ہاں بہت سے مفسرین اور صوفیاء نے ''عبادتِ ربّ'' اور ''معرفتِ ربّ'' کو مترادف قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ﴾ کی جو تفسیر کرتے ہیں وہ یہی ہے کہ ''وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْرِفُوْنِ'' یعنی ''میں نے نہیں پیدا کیا ہے انسانوں کو اور جنوں کو مگر اس لیے کہ میری معرفت حاصل کریں''۔ اس لیے کہ معرفت حاصل ہوجائے گی تو اس کا منطقی نتیجہ عبادت کی صورت میں نکلے گا۔ اگر کسی شخص کو اللہ کے حسن وجمال کی کوئی جھلک کبھی نصیب ہوجائے تو کیسے ممکن ہے کہ وہ کسی اور کے حسن کا گرویدہ ہو! کسی اور کی محبت اس کے دل میں کیسے گھر کرے گی! ابن سینا کا ایک بڑا پیارا جملہ ہے ''اگر تم چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے انوار وتجلیات میں سے تمہیں کوئی حصہ ملے تو تمہیں اپنی خلوتوں میں ریاضت کرنی پڑے گی' توجہ کرنی ہوگی' لو لگانی ہوگی' مراقبے کرنے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے کبھی کوئی کرن تمہیں بھی نصیب ہوجائے''۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ انسان کو کبھی حقیقی معرفتِ ربّ کی کوئی چمک اور اس کی کوئی جھلک اگر مل جائے تو پھر اس کے لیے کسی اور سے دل لگانے اور کسی اور کی محبت میں گرفتار ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ تو اس معنی میں ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ﴾ اور ''وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْرِفُوْنِ'' میں کوئی فرق نہیں ہے۔ معرفت حقیقی ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ اسی کی محبت میں گرفتار ہیں' اسی کی رضا جوئی میں اپنی پوری زندگی صرف کردیں گے' اسی کی یاد سے آپ کے دل کو راحت اور سکون واطمینان نصیب ہوگا۔ ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾.

اللہ تعالیٰ کی معرفت کے ضمن میں اب ایک بات اور نوٹ کیجیے۔ معرفتِ ربّ کو دو حصوں میں تقسیم کیجیے' ایک معرفتِ ذات اور ایک معرفتِ صفات۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کا کوئی تصور کسی انسان کے لیے قطعاً ممکن نہیں۔ یہ ہمارے لیے out of bounds ہے۔ اس پر سے پردہ آخرت میں اٹھے گا۔ چنانچہ آخری نعمت جو اہل جنت کو نصیب ہو گی وہ اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا۔ گویا حور وقصور اور جنت کی جتنی نعمتوں کا بھی تذکرہ ہے' ان سب سے کہیں بڑھ کر اور آخری شے اللہ تعالیٰ کا دیدار ہے۔ بہرحال معرفتِ ذات ہمارے لیے ناممکن ہے' ہم اُس کی ذات کی کنہ تک رسائی حاصل نہیں کرسکتے۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے اس ضمن میں ایک بات کہی تھی' اور وہ چونکہ شعریت میں ڈھلا ہوا جملہ تھا' لہٰذا اس پر حضرت علی ؓ نے گرہ لگا کر شعر بنا دیا۔ حضرت ابوبکرؓ کی طرف یہ قول منسوب ہے: ''العجز عن درک الذات ادراکٌ'' یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کے ادراک سے عاجز ہوجانے کا جب انسان کو احساس ہوجائے تو یہی ادراک ہے۔ یعنی معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد! یہی درحقیقت علم ہے کہ ہمیں یہ معلوم ہوجائے کہ اللہ کی ذات کا کوئی تصور' کوئی تخیل اور کوئی فہم ہمارے لیے ممکن نہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے مذکورہ بالا قول پر حضرت علیؓ نے ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے: ''والبحث عن کنہ الذات اشراکٌ'' یعنی اللہ کی ذات میں اگر کھوج کرید کروگے تو کہیں نہ کہیں شرک میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ اس لیے کہ جب کھوج کرید کروگے تو جو تمہارا اپنا ذہنی تصور ہے اس کا کوئی نہ کوئی ہیولا قائم کروگے' اور وہ اللہ تو نہیں ہے' اللہ تو تمہارے تصور سے ماوراء ہے' تم نے کوئی تصور قائم کیا تو تم نے گویا خود اپنا ایک خدا بنا لیا' اور یہی تو شرک ہے۔ ایک بُت تراش نے جو بُت بنایا ہے تو اپنے خیال میں تو خدا بنایا ہے' مگر بُت کو وہ اپنے خیال کے مطابق ایک انسانی صورت دے رہا ہے۔ اس پر بُت اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

مرا بر صورتِ خویش آفریدی — برونِ خویشتن آخر چہ دیدی؟

یعنی تُو نے تو ایک خدا بنانا چاہا تھا' لیکن تو نے اپنی ہی شکل میں مجھے بھی ڈھال دیا۔ تیرے دو ہاتھ تھے' میرے بھی دو ہاتھ بنا دیے' تیرے دو پاؤں تھے' تو نے میرے بھی دو پاؤں بنا دیے' تیری دو آنکھیں تھیں' تو نے میری بھی دو آنکھیں بنا دیں۔ تو نے اپنے سے باہر بھی کچھ دیکھا؟ تو واقعہ یہ ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں بھی یہ اعتراف کہ وہ ہماری رسائی سے ماوراء' وراء الوراء' ثم وراء الوراء' ثم وراء الوراء ہے' یہی علم اور معرفت ہے۔ خاص طور پر حضرت مجددِ الف ثانیؒ کے جو مکاتیب یعنی خطوط ہیں ان مکتوبات شریفہ میں یہ الفاظ بار بار آتے ہیں۔ اس لیے کہ واقعتاً تصوف کے وہ گوشے جو اِس کھوج کرید کی طرف لے جاتے ہیں' وہ گمراہی اور شرک کی طرف لے جاتے ہیں' جبکہ والبحث عن کنہ الذات اشراکٌ۔

اب رہ گیا ہمارے پاس صرف ایک معاملہ کہ ہم اللہ کو صرف اس کے اسماء و صفات کے حوالے سے پہچان سکتے ہیں۔ اسماء بھی درحقیقت اللہ کے صفاتی نام ہیں۔ یہ بحث ہم سورۃ الفاتحہ کے ضمن میں کیا کرتے ہیں کہ ایک رائے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اسم ذات ''اللہ'' ہے اور باقی تمام کے تمام اسماء صفاتی ہیں۔ رحیمٌ صفت ہے' جبکہ الرحیم اس کا ایک نام بن گیا۔ اسی طرح علیمٌ صفت ہے' العلیم اس کا نام ہو گیا۔ قادرٌ صفت ہے اور القادر اس کا نام ہو گیا۔ چنانچہ تمام اسماءِ حسنیٰ صفاتی نام ہیں' بلکہ میری رائے تو ان حضرات کے ساتھ ہے جو ''اللہ'' کو بھی صفاتی نام سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اِلٰــہٌ سے ''الالٰہ'' اور اس سے ''اللہ'' بنا ہے۔ تو درحقیقت اللہ تعالیٰ کے تمام کے تمام اسماء صفاتی ہیں۔ ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی معرفت کا جو بھی خزانہ ہے یا اس کا جو بھی ذریعہ ہے وہ صرف اسماء و صفات ہیں۔ چنانچہ ایمانِ مجمل کے الفاظ یاد کیجیے: آمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَصِفَاتِہٖ ''میں ایمان لایا اللہ پر (میں نے مانا اللہ کو) جیسا کہ وہ اپنے اسماء وصفات سے ظاہر ہے''۔ یہی ایمان باللہ ہے۔ باقی اُس کی ذات سے کوئی بحث نہیں۔

صفاتِ باری تعالیٰ کی کیفیت وکمیت؟

اب تیسرے درجے میں ایک بات اور ہے۔ اللہ کی صفات کی بھی ہم نہ تو کمیت کو جانتے ہیں نہ کیفیت کو۔ یہ ہمارے علم اور فہم کی محدودیت ہے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ اللہ قادر ہے —— لیکن کتنا قادر ہے؟ ہمارے ذہن کے اندر اس کا کوئی تصور نہیں آ سکتا' اس لیے کہ سنار کی ترازو ماشے تولے ہی تول سکتی ہے' ٹنوں کا وزن نہیں تول سکتی۔ چنانچہ اللہ کی قدرتِ مطلق کا ہمارا ذہن کیا تصور کر سکتا ہے؟ اسی طرح ہم یہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ''البصیر'' ہے' دیکھنے والا ہے' وہ ''السَّمیع'' ہے' سننے والا ہے۔ لیکن وہ کیسے سنتا ہے' یہ ہم نہیں جانتے۔ کیا اس کے کوئی کان ہیں؟ معاذ اللہ! کیا وہ ہماری طرح sound waves کا محتاج ہے کہ waves آ کر کان کے پردے سے ٹکرائیں تو کچھ سنائی دے گا؟ معاذ اللہ! تو وہ کیسے سنتا ہے؟ دیکھنے کے لیے کیا وہ کسی روشنی کا محتاج ہے کہ اس کے ذریعے آنکھ کے پردے (retina) کے اوپر جا کر عکس بنتا ہے؟ معاذ اللہ! تو وہ کیسے دیکھتا ہے؟ نہ ہم کمیت جان سکتے ہیں' اس لیے کہ وہ تو ہمارے تصور سے ماوراء ہے۔ وہ علیم ہے تو کتنا علیم ہے؟ کتنا علم ہے اس کا؟ ہم کیسے ناپیں گے' کیسے تولیں گے؟ پھر وہی بات کہوں گا کہ سنار والی ترازو پر یہ ٹنوں وزن کیسے تولا جائے گا! اس حوالے سے یہ ہماری درماندگی ہے۔ قرآن کریم ہماری اس درماندگی کا علاج لفظ ''کُل'' سے کرتا ہے۔ ﴿وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ . ہمارے پاس اس کے سوا کوئی لفظ ہے ہی نہیں کہ ''وہ ہر شے پر قادر ہے''۔ اور آگے چل کر آئے گا: ﴿وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ﴾ ''وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے''۔ بس ''ہر'' کے لفظ میں یا ''کُل'' کے لفظ میں پناہ لینے کے سوا ہمارے پاس کوئی اور چارۂ کار نہیں ہے۔ نہ ہم یہ جان سکتے ہیں کہ اس کی قدرت کتنی ہے' نہ ہم یہ جان سکتے ہیں کہ اس کی قدرت کی کیا کیفیت ہے۔ اس کا علم کتنا ہے؟ ہم نہیں جان سکتے۔ اس کے علم کی نوعیت کیا ہے؟ معاذ اللہ' ہم کیا جانیں!

زیرِ مطالعہ آیت کے اختتام پر الفاظ آئے ہیں: ﴿وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ B﴾ اور اس سے اگلی آیت ان الفاظ پر ختم ہو رہی ہے: ﴿وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ X﴾ اور ان

دوصفات (علم اور قدرت) کو یوں کہنا چاہیے کہ یہ ''اُمّ الصفات'' ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے بہت سے اسماءِ صفت علم ہی سے متعلق ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ خبیر ہے' سمیع ہے' بصیر ہے۔ اور یہ سب علم ہی کے تو شعبے ہیں۔ اسی طرح القابض' الباسط' الرافع' الخافض' یہ سب درحقیقت ''وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ'' ہی کی تو شرح ہیں۔ بس ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ کسی بھی شے کے بارے میں اگر ہمارے ذہن میں یہ وسوسہ پیدا ہو جائے کہ اللہ یہ کیسے کرے گا؟ تو معلوم ہوا کہ ''وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ'' پر ہمارا ایمان نہیں ہے۔ اس کی قدرت تو مطلق ہے' boundless اور limitless ہے۔ کوئی شے اس کے لیے مشکل نہیں۔ اسی طرح ہر شے اس کے علم میں ہے۔ اور صفت علم کو تو آپ دیکھیں گے کہ اگلی آیات میں کیسے دہرا دہرا کر لایا گیا ہے: ﴿یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْھَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْھَا ؕ وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ ؕ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ﴾ یہ وہی اس کی صفتِ علم ہی تو چلی آ رہی ہے اور ﴿وَھُوَ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ میں بھی اسی صفتِ علم ہی کا تو تذکرہ ہو رہا ہے۔

انہی دوصفات (علم اور قدرت) کے حوالے سے جان لیجیے کہ ایمانیات میں تقدیر پر ایمان ((وَاَنْ تُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ)) درحقیقت انہی دونوں صفات پر ایمان کا منطقی نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ اب اگر میں یہ سمجھوں کہ میں اس پیالے کو اللہ کے اِذن کے بغیر اٹھا سکتا ہوں تو گویا میں نے اپنی قدرت کو اللہ کی قدرت کے مقابلے میں لا کھڑا کر دیا اور یہی شرک ہو جائے گا۔ میں نے ارادہ ضرور کیا ہے کہ اس پیالے کو اٹھا لوں' لیکن جب تک اذنِ ربّ نہ ہو' اس کی توفیق اور اس کی تیسیر نہ ہو' میں اسے نہیں اٹھا سکتا۔ گویا کہ اللہ کی قدرت تمام قدرتوں کے اوپر محیط ہے' حاوی ہے' ان کے اوپر مستولی ہے' چھائی ہوئی ہے۔ اسی طرح کل مجھے جو کچھ کرنا ہے وہ اللہ کے علم میں ہے۔ وہ عالِم ما کان وما یکون ہے۔ ہر شے اس کے علم میں ہے۔ اس کے لیے ماضی' حال' مستقبل ہے ہی نہیں۔ یہ زمانے تو ہمارے لیے ہیں' اس کا علم تو بسیط ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ چونکہ جو کچھ میں کل کرنے والا ہوں وہ اللہ کے علم میں ہے' لہٰذا میں مجبور ہوں کہ وہ کروں۔ یہ جبر وقدر کی بحث ہے' اس کو علیحدہ کر لیجیے۔ یہ اُس کا Pre-knowledge ہے' جو Pre-determination کو مستلزم نہیں ہے۔ اللہ ہر شے کو جانتا ہے اور ہمیشہ سے جانتا ہے۔ ہر شے جو ہونے والی ہے وہ اُس کے علم کامل کے اندر ازل سے موجود ہے' لیکن اس کے معنی جبر کے نہیں ہیں' لہٰذا Pre-Determination کو Pre-Knowledge سے علیحدہ کر لیجیے۔ عام طور پر ذہنوں کے اندر جو اشکال پیدا ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ ان دونوں چیزوں کو لازم وملزوم سمجھ لیا جاتا ہے۔

تیسری آیت ___ مشکل ترین مقام

سورۃ الحدید کی تیسری آیت قرآن حکیم کے مشکل ترین مقامات میں سے ہے۔ ذات وصفات باری تعالیٰ کی بحث یہاں اعلیٰ ترین علمی سطح پر آئی ہے۔ فرمایا:

﴿ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ﴾

''وہی ہے اوّل (پہلا) اور وہی ہے آخر (پچھلا)' وہی ہے ظاہر (انتہائی نمایاں بھی اور غالب بھی) اور وہی ہے باطن (انتہائی مخفی اور چھپا ہوا)۔''

یہ آیت مبارکہ ہے جس کے بارے میں امام رازی کی پوری بحث کا تفصیل سے مطالعہ کیا جائے تو واقعتاً محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اس آیت کی عظمت کے سامنے کھڑے تھر تھر کانپ رہے ہیں۔ اور انہوں نے الفاظ بھی ایسے پیارے لکھے ہیں: ''اِعْلَمْ اَنّ ھٰذَا المَقام مقامٌ غامضٌ عمیقٌ مھیبٌ''۔ یعنی ''جان لو کہ یہ مقام بڑا غامض ہے' عمیق ہے' مہیب ہے''۔ اس کی حقیقت کا سمجھنا آسان کام نہیں ہے۔ اس آیت کے مفہوم ومعنی پر تو ان شاء اللہ اگلی نشست میں بحث ہو گی۔ اس وقت میں چاہتا ہوں کہ اس سے متعلق چند بنیادی باتیں آپ ذہن نشین کر لیں۔ یہ درحقیقت فلسفۂ وجود سے متعلق آیت ہے اور فلسفے کا سب سے مشکل مسئلہ ماہیّتِ وجود ہے۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ ماہیّتِ زمان اور ماہیّتِ وجود' یہی فلسفے کے دو ایسے مسئلے ہیں جو لاینحل ہیں اور مشکل ترین ہیں اور چونکہ بہت سے حضرات کو اس کا ذوق نہیں ہوتا لہٰذا وہ اس موضوع پر گفتگو کو بھی وقت کا ضیاع سمجھتے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ الفاظ قرآن میں آئے ہیں' لہٰذا ان پر غور و

فکر ضروری ہے۔ قرآن مجید صرف عوام کے لیے ہدایت نہیں ہے' خواص کو بھی تو ہدایت یہیں سے ملے گی اور جن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عقل ودیعت ہوئی ہے وہ جاننا چاہتے ہیں کہ کائنات کیا ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ وجود کی حقیقت کیا ہے؟ وجود کی ماہیّت کیا ہے؟ یہ سوالات ہیں جن پر انسان غور کرتا چلا آ رہا ہے' اور اس بارے میں مختلف آراء بنی ہیں' مختلف فلسفے وجود میں آئے ہیں' جن میں وحدت الشہود بھی ہے' وحدت الوجود بھی ہے' پھر ثنویت بھی ہے اور تثلیث بھی ہے۔ اس پر تو بعد میں گفتگو ہو گی' اس وقت جو بات میں نوٹ کرانا چاہتا ہوں وہ صرف ظاہری الفاظ کے حوالے سے ہے۔

تین امتیازی فرق

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے اسماء عام طور پر جوڑوں کی شکل میں آتے ہیں ۔جیسے وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ' وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ' اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۔اس ضمن میں صرف تین استثناءات ہیں اور وہ تینوں انہی سورتوں میں ہیں۔ یہاں چار اسماء اکٹھے آ رہے ہیں: ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ ۔اسی طرح سورۃ الجمعہ کی پہلی آیت میں بھی چار اسماء اکٹھے آئے ہیں: ﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ﴾ ۔تیسرا استثناء سورۃ الحشر کی آخری تین آیات ہیں' جن میں سے درمیانی آیت تو یوں سمجھئے کہ قرآن مجید میں اسماء باری تعالیٰ کا عظیم ترین اور حسین ترین گلدستہ ہے: ﴿اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ﴾ یہاں آٹھ اسماء تسلسل کے ساتھ چلے آ رہے ہیں۔

دوسرا فرق یہ نوٹ کیجیے کہ عام طور پر اسماء باری تعالیٰ آیات کے آخر میں آتے ہیں' لیکن یہاں آیت کی اصل جو main body ہے وہ درحقیقت انہی اسماء پر مشتمل ہے۔ اس کی کوئی اور مثال قرآن مجید میں نہیں ہے۔

تیسرا فرق جو اہم ترین ہے' وہ نوٹ کر لیجیے کہ قرآن مجید میں اس ایک مقام کے سوا کہیں بھی اسماءِ باری تعالیٰ کے درمیان حرفِ عطف نہیں آیا۔ سورۃ الحشر کی مذکورہ بالا آیت میں آٹھ اسماءِ حسنیٰ آئے ہیں لیکن درمیان میں کہیں حرفِ عطف نہیں ہے' کوئی فصل نہیں ہے "اَلْمَلِكُ وَالْقُدُّوْسُ" نہیں ہے۔ قرآن مجید میں ہر جگہ "وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ" ہی آیا ہے' کہیں "وَهُوَ الْعَزِيْزُ وَالْحَكِيْمُ" نہیں آیا۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ نے اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے بڑی پیاری بات کہی ہے۔ جیسے کہ میں نے ایک بات عرض کی تھی کہ اللہ کے تمام اسماء وصفات مطلق ہیں' کوئی کسی کا تابع نہیں' ایسے ہی دوسری بات نوٹ کر لیجیے جو مولانا فراہیؒ نے لکھی ہے کہ اللہ کی تمام صفات اس کی ذات میں بیک وقت موجود ہیں' جبکہ واؤ باہم فصل کر دیتا ہے' واؤ سے تو مغائرت پیدا ہوتی ہے۔ یہ نحو کا قاعدہ ہے کہ عطف معطوف اور معطوف الیہ میں مغائرت کا سبب بنتا ہے۔ اور دنیا میں ہم یہ جانتے ہیں کہ صفات عموماً جمع نہیں ہوتیں۔ ایک شخص ایک ہی وقت میں منتقم اور غفور تو نہیں ہو سکتا۔ یہ کیفیات تو مختلف ہوں گی۔ لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات میں یہ تمام شانیں بیک وقت اور بتمام وکمال موجود ہیں۔ اسی لیے کہیں فصل نہیں ہے' کہیں حرفِ عطف نہیں لایا گیا' سوائے اس مقام کے۔

اسماء باری تعالیٰ کے ضمن میں اس آیت مبارکہ میں بقیہ تمام قرآن مجید سے یہ تین امتیازی فرق ہیں' ان کو نوٹ کر لیجیے۔ باقی اس آیت مبارکہ پر مفصل گفتگو ان شاء اللہ آگے آئے گی!

تکملۂ مباحث

گزشتہ نشست میں اگرچہ ہماری گفتگو تیسری آیت تک پہنچ گئی تھی لیکن پہلی دونوں آیتوں کے بارے میں بھی بعض اہم باتیں رہ گئی تھیں۔ آج ہمیں پہلے ان کا قرض ادا کرنا ہے' پھر آگے بڑھنا ہے۔

پہلی آیت مبارکہ جو اِس سورۃ کا "مطلع" ہے' اس میں یہ بحث تو مکمل ہو گئی کہ سَبَحَ يَسْبَحُ اور سَبَّحَ يُسَبِّحُ کا لغوی مفہوم کیا ہے اور اللہ کی تسبیح سے کیا مراد ہے۔ پھر یہ کہ یہ تسبیح قولی بھی ہے اور حالی بھی' اور قرآن حکیم میں یہ فعل مضارع میں بھی آئی ہے اور فعل ماضی میں بھی۔ گویا اس کائنات کی ہر شے ہر آن اللہ کی تسبیح کر رہی ہے'

ہمیشہ سے کرتی چلی آ رہی ہے اور ہمیشہ کرتی رہے گی۔ یہ مضمون تو سامنے آ گیا' لیکن غور کرنا ہوگا کہ اس مضمون کی اہمیت کیا ہے؟ اس قدر اہتمام اور شدّ و مد کے ساتھ پانچ سورتوں کے آغاز میں جو یہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے' اس کا کیا سبب ہے؟

جان لیجیے کہ اصل میں یہ الفاظ حصولِ معرفتِ ربّ کے ذریعے اور طریقے پر بحث کر رہے ہیں۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں' انسان کے لیے اللہ کی معرفت ہی اصل مطلوب و مقصود ہے' جب صحیح معرفت حاصل ہو جائے گی تو اس کا ظہور اعمال سے خود بخود ہونا شروع ہو جائے گا اور انسان حق عبادت بھی ادا کر سکے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ معرفت کے حصول کا طریقہ کیا ہے؟

اللہ کی معرفت کے حصول کے دو راستے ہیں:

(۱) عقلی اور منطقی راستہ (Rational Approach)

(۲) قلب اور روح کے ذریعے اللہ کو پہچاننا (Mystic Approach)

اگرچہ ہمارے صوفیاء کا اصل میدان تو مؤخر الذکر ذریعہ ہی ہے' لیکن قرآن مجید نے اسے زیادہ نمایاں نہیں کیا' اگرچہ اس کو تسلیم کیا ہے اور اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور یہ قرآن مجید کا ایک عام اسلوب ہے کہ بعض چیزوں پر زیادہ زور دیتا ہے اور انہیں زیادہ نمایاں کرتا ہے اور بعض سے وہ سرسری طور پر گزر جاتا ہے۔ اس میں بھی یقیناً کوئی نہ کوئی حکمت ہوتی ہے اور کوئی سبق مضمر ہوتا ہے۔ مثلاً ارشادِ ربّانی ہے: ﴿وَفِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ ۲۱﴾ (الذّٰریٰت) ''اور تمہارے وجود میں بھی (ہماری نشانیاں ہیں)' کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟'' کبھی اپنے باطن میں جھانکو تو سہی! اقبال نے اس کی تعبیر اس طرح کی ہے ع ''اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی!''

حقیقت کا ادراک اور معرفتِ ربّ انسان اپنے باطن سے کر سکتا ہے۔ اسی کے لیے meditation اور مراقبے ہیں۔ صوفیاء نے جو راستے اختیار کیے ان کو قرآن نے اصولاً مانا ہے۔ ایک حدیث' جو اگرچہ محدثین کے نزدیک مستند نہیں ہے' مگر صوفیاء اسے تسلیم کرتے ہیں' اس میں یہ مضمون اس طرح آیا ہے: ((مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ)) ''جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے ربّ کو پہچان لیا''۔ اور قرآن مجید میں یہ مفہوم موجود ہے۔ اسی سلسلۂ سُوَر میں یعنی سورۃ الحشر کے آخری رکوع میں ہے کہ:

﴿وَلَا تَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ نَسُوا اللّٰہَ فَاَنۡسٰہُمۡ اَنۡفُسَہُمۡ ؕ﴾ (آیت ۱۹)

''اور تم ان لوگوں کی مانند نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تب اللہ نے انہیں اپنے آپ سے غافل کر دیا۔''

گویا اللہ کی معرفت کا نتیجہ معرفتِ نفس ہے۔ اپنے آپ کو بھی انسان تبھی پہچانے گا اگر اللہ کو پہچانے گا۔ اسی کا عکس (converse) یہ ہے کہ اگر آپ اپنے آپ کو پہچانیں گے تو اللہ کو پہچانیں گے۔ گویا یہ بات دونوں طرف سے صحیح ہے۔ اس لیے کہ روحِ انسانی کا ذاتِ باری تعالیٰ سے ایک خاص ربط و تعلق ہے جس کے لیے قریب ترین تمثیل یا تشبیہہ یہ ہے کہ سورج اور اس کی شعاعیں کروڑوں میل کا سفر کر کے زمین تک پہنچ رہی ہیں' بلکہ آگے بھی نامعلوم کہاں تک جاتی ہیں' لیکن ہر شعاع کا تعلق سورج کے ساتھ برقرار ہے۔ تو ارواحِ انسانیہ بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ایک ربط و تعلق رکھے ہوئے ہیں۔ گویا اللہ کو پہچاننے کا ایک راستہ یہ بھی ہے کہ انسان اپنی روح کی گہرائیوں اور پہنائیوں میں غور و فکر کرے۔

تاہم جیسا کہ میں نے عرض کیا' قرآن مجید میں معرفت ربّ کے عقلی و منطقی ذریعے کو زیادہ واضح کیا گیا ہے۔ لیکن پھر استدلال اور منطق کی بھی دو قسمیں ہیں:

۱) استخراجی منطق (Deductive Logic): اس میں آدمی ایک ایک قدم آگے بڑھا کر دلیل کے حوالے سے فہم و شعور حاصل کرتا ہے۔

۲) استقرائی منطق (Inductive Logic): اس میں انسان کائنات میں موجود تنوّع کے بارے میں اپنے مشاہدات جمع کرتا ہے اور اس سے کوئی نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ قرآن مجید نے induction ہی کو سب سے زیادہ نمایاں کیا ہے۔ چنانچہ ہر شے کو اللہ کی آیت قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ﴾ (آل عمران)

''یقیناً آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں ہوش مند لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔''

یہی مضمون سورۃ البقرۃ میں پوری تفصیل کے ساتھ آیا ہے:

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ وَالْفُلْکِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا وَبَثَّ فِیْھَا مِنْ کُلِّ دَآبَّۃٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ﴾ (البقرۃ)

''یقیناً آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں، اُن کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اُس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے، پھر اس کے ذریعے سے مُردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور (اپنے اسی انتظام کی بدولت) زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں اور اُن بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں، ان لوگوں کے لیے بے شمار نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔''

یہ استقراء ہے۔ اقبال نے اس کی بڑی خوبصورت تعبیر کی ہے: ؎

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ
مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!

ہمارے متکلمین اور فلاسفہ کا طریقہ استخراجی منطق (Deductive Logic) کا تھا اور اب اس کا دور گزر چکا۔ چونکہ سائنس کی بنیاد بھی استقراء (induction) ہے لہٰذا اسی کے حوالے سے اقبال نے اپنے لیکچرز میں کہا ہے کہ ''عہد حاضر کے سائنٹیفک کلچر کا Inner Core قرآنی ہے''۔ اس لیے کہ قرآن مشاہدے کی دعوت دیتا ہے:

﴿اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ﴾ (الغاشیۃ)

''بھلا یہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے؟ آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے اٹھایا گیا؟ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے گئے؟ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی؟''

یہ تمام اللہ کی نشانیاں ہیں۔ ان مشاہدات کے ذریعے معرفتِ ربّ حاصل کرو۔ قرآن مجید میں اصل زور آیاتِ آفاقی اور آیاتِ انفسی کے مشاہدے پر ہے:

﴿سَنُرِیْھِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَھُمْ اَنَّہُ الْحَقُّ ط﴾
(حٰم السجدۃ:۵۳)

''عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی، یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے۔''

اس لیے کہ حضور ﷺ کے زمانے کے بعد Scientific Era شروع ہونے والا تھا۔ (سائنس کی موجودہ ترقی کوئی بہت قدیم نہیں ہے، بلکہ دو تین سو برس کے اندر ہی یہ بہت بڑا دھماکہ ہوا ہے) ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ قرآن مجید اس سائنسی دَور کا فاتح ہے کہ اس نے انسانوں کو غور وفکر کی دعوت دی ہے:

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ ط اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْہُ مَسْئُوْلًا﴾ (بنی اسراء یل)

''کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو۔ یقیناً آنکھ، کان اور دل سب ہی کی باز پرس ہونی ہے۔''

یعنی تم اپنے موقف کی بنیاد توہّمات پر نہ رکھو، بلکہ عقل سے استدلال کرو، سمع وبصر سے کام لو اور نتیجہ اخذ کرو۔ قرآن مجید میں اس پر جو زور دیا گیا ہے، وہ دو وجوہ سے ہے:

۱) عرب جو قرآن کے اوّلین مخاطب تھے، ان کا ذوق منطقی اور فلسفیانہ نہیں تھا۔ وہ ایک اُمّی قوم تھی، جس میں پڑھنے لکھنے کا رواج نہیں تھا۔ وہ قوّتِ کار اور قوّتِ کردار کے

مالک تھے۔ خاص طور پر مکہ کے لوگوں کا معاملہ یہ تھا کہ جب تک کوئی دشمن تھا تو جانی دشمن تھا، لیکن جب کوئی ہاتھ میں ہاتھ دے دیتا تھا تو وہی ''وَلِیٌّ حَمِیْمٌ'' بن جاتا تھا۔ ان کے یہاں کسی قسم کی منافقت نہیں تھی، بلکہ کردار کی بڑی پختگی تھی کہ جو کہہ رہے ہیں وہی کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ فلسفہ اور منطق ان کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ اس حوالے سے بھی قرآن مجید نے Inductive Logic کو نمایاں کیا، اور اس اعتبار سے بھی کہ اب Scientific Era کا آغاز ہونا تھا۔

بہر حال قرآن کا ایک اسلوب وہ ہے جو میں نے بیان کیا کہ ہر شے اللہ کی نشانی ہے، اسے دیکھو اور اس کے ذریعے اللہ کو پہچانو۔

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتر است از معرفتِ کردگار

گویا درخت کا ہر پتا اللہ کی معرفت کا دفتر ہے۔ اسی مضمون کو قرآن نے اس طرح ادا کیا ہے کہ ہر شے اللہ کی تسبیح کر رہی ہے۔ اس کائنات کا ذرہ ذرہ اپنے وجود سے اپنے خالق اور صانع اور موجد کے ایک ہستیٔ کامل ہونے کا اعتراف اور اقرار و اعلان کر رہا ہے اور اسی کے ذریعے سے تم اللہ کی معرفت حاصل کر سکو گے۔ یہ ہے اس مضمون کی اہمیت جو اس سورۂ مبارکہ کی پہلی آیت میں بیان ہوا:

﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ﴾

دوسری آیت کے مرکزی مضمون (اللہ تعالیٰ کے اختیار و اقتدار) پر ہم گفتگو کر چکے ہیں۔ یہ بات دوبارہ نوٹ کر لیجیے کہ یہ بہت اہم مضمون ہے۔ چنانچہ ان چھ آیات میں یہ مضمون بار بار آیا ہے۔ پہلی آیت کا اختتام ہوا: ﴿وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ﴾ ''وہ غالب، حکمت والا ہے''۔ پھر یہ الفاظ ان آیات میں دو مرتبہ آئے ہیں: ﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ''اسی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے''۔ اس کے علاوہ آج ہم پڑھیں گے کہ ﴿ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ﴾ ''پھر وہ عرش پر متمکن ہوا''۔ یعنی اس کائنات کو پیدا کرنے کے بعد وہ کہیں الگ تھلگ ہو کر نہیں بیٹھ گیا کہ اسے اس سے کوئی دلچسپی نہ ہو، جیسا کہ بعض فلاسفہ کا خیال ہے، بلکہ وہی ہے جو تختِ حکومت پر متمکن ہے۔ ان چھ آیات کے اندر چار مرتبہ emphasise کیا گیا کہ اس کائنات کا شہنشاہِ مطلق اللہ ہے اور پوری کائنات میں اسی کی حکومت بالفعل قائم ہے۔ اس وسیع و عریض کائنات کے ایک گوشے میں موجود انسانی زندگی کی اس کائنات کے ساتھ کیا نسبت تناسب بنے گی؟ اور اس میں بھی انسان کی زندگی کا تھوڑا سا حصہ ہے جس میں اسے آزادی (Free Will) دی گئی ہے۔ اور اس ہلدی کی گانٹھ کو لے کر آدمی حاکم (sovereign) بن کر بیٹھ جاتا ہے اور اس کی بنیاد پر بغاوت کرتا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ......﴾ (الروم:٤١)
''خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے۔''

اور درحقیقت اس سورۂ مبارکہ میں جو زور دے کر کہا جا رہا ہے کہ لگاؤ، خرچ کرو اپنے آپ کو اللہ کی راہ میں، تو کس کام کے لیے؟ تاکہ اللہ کی حکومت قائم کی جائے! جسے بائبل کی Lord's Prayer میں اس طرح تعبیر کیا گیا ہے کہ:

Thy Kingdom come,
Thy Will be done on earth
as it is in heavens.

یعنی اے ربّ! تیری مرضی جس طرح آسمانوں میں نافذ ہے اسی طرح زمین پر بھی تیری حکومت قائم ہو جائے! یہ حکومتِ الٰہیہ کا قیام ہے، اسی کا نام اقامتِ دین ہے، اسی کا نام غلبۂ دینِ حق ہے، اسی کا نام تکبیرِ ربّ ہے۔ ان سورتوں میں سارا زور اسی پر ہے کہ ہم نے اپنے رسول کو بھیجا ہی اس لیے ہے کہ اللہ کے دین کو پورے کے پورے نظامِ زندگی پر غالب کر دے۔ یہی مقصدِ بعثتِ محمدیؐ ہے۔ یہی وہ مقصد ہے (نظامِ عدل و قسط کو قائم کرنا) جس کے لیے تمام رسول بھیجے گئے۔ اب ظاہر ہے اس کے لیے جان کھپانی ہوگی، مال خرچ کرنا ہوگا، وقت پڑنے پر نقدِ جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آنا ہو گا اور گردنیں کٹوانی ہوں گی۔

اب آیئے تیسری آیت کی طرف! جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا یہ فلسفۂ وجود سے بحث کرتی ہے جو کہ فلسفے کا مشکل ترین موضوع ہے۔ اس ضمن میں دو باتیں بنیادی طور پر سمجھ لیجیے۔

ایک یہ کہ قرآن دقیق فلسفیانہ مسائل ضمنی طور پر زیر بحث لاتا ہے اور اُن پر زیادہ بحث نہیں کرتا، لیکن لاتا ضرور ہے۔ اس کے بھی دو اسباب ہیں۔ ایک تو یہی بات جو پہلے کہی جا چکی ہے کہ قرآن کے اوّلین مخاطب امّی تھے، لیکن رسول اکرمﷺ کی بعثت تو پوری نوعِ انسانی کے لیے ہے: ﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا﴾ (سبا:۲۸) ''اور (اے نبیؐ!) ہم نے آپ کو تمام ہی انسانوں کے لیے بشیر ونذیر بنا کر بھیجا ہے''۔ اور نہ صرف آپؐ اپنے دَور کے تمام انسانوں کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے بلکہ تا قیامِ قیامت آپؐ ہی کا دورِ رسالت ہے۔ اب ظاہر ہے کہ بنی نوعِ انسان میں ہر طرح کے آدمی ہیں۔ عوام بھی ہیں، خواص بھی ہیں، جاہل بھی ہیں، علماء بھی ہیں، فضلاء بھی ہیں، فلاسفہ بھی ہیں، ہر ذہنی سطح کے لوگ ملیں گے، ہر طرح کی تہذیب اور تمدن سے واسطہ پڑے گا۔ ان سب کی طرف رسالتِ محمدیؐ کی بعثت ہے۔ اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ کاملہ کے تحت جو طریقہ اختیار کیا وہ یہ ہے کہ پہلے ایک قوم کا انتخاب کیا اور اس کے ذہن، فکر، عمل اور اخلاق و کردار کے اندر ایک عظیم انقلاب برپا کیا اور اسے instrument بنایا کہ اب بقیہ نوعِ انسانی تک یہ پیغامِ رسالت تم پہنچاؤ۔ اس میں ظاہر ہے کہ پہلی مخاطب قوم کی ذہنی سطح کو اگر ملحوظ نہ رکھا جاتا تو یہ پیغام خود اُس قوم کی ذہنی سطح سے بالاتر رہتا۔ اس حوالے سے قرآن مجید کا بڑا حصہ اُس قوم کے عقل و شعور کی سطح کے مطابق گفتگو کرتا ہے۔ البتہ چونکہ قرآن حکیم ہمیشہ کے لیے ہدایت ہے اور محمد رسول اللہﷺ کی رسالت پوری نوعِ انسانی کے لیے ہے جس میں علماء و حکماء بھی ہوں گے، لہٰذا قرآن حکیم دقیق فلسفیانہ مسائل کو بھی touch کرتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ بڑے بڑے فلسفیوں کو بھی تو آخر ہدایت یہیں سے نصیب ہونی تھی، بیسویں صدی میں علامہ اقبال جیسے نابغہ عصر کی فکری پیاس بھی آخر اِسی چشمۂ حیواں سے بجھنی تھی، جس نے کہا کہ ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں!

مشرق و مغرب کے سارے فلسفے کھنگالنے کے بعد علامہ اقبال کو اگر آسودگی میسر آئی اور اگر سکون نصیب ہوا تو قرآن مجید کے دامن میں۔ چنانچہ اپنے فلسفۂ خودی کے بارے میں خود ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے یہ فلسفۂ قرآن سے اخذ کیا ہے۔ سید نذیر نیازی نے علامہ اقبال سے دریافت کیا تھا کہ آپ کے اس فلسفہ خودی کا ماخذ کیا ہے اور اس اعتبار سے آپ کس مغربی فلسفی کے خوشہ چین ہیں؟ تو علامہ نے ان سے فرمایا کہ کل فلاں وقت آ جانا، میں تمہیں لکھوا دوں گا۔ سید نذیر نیازی یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں میں بہت خوش تھا کہ مجھے یہ سعادت نصیب ہو رہی ہے کہ شاعر مشرق مجھے اپنے فلسفۂ خودی کا source لکھوائیں گے۔ لیکن جب سید نذیر نیازی علامہ اقبال کی خدمت میں پہنچے تو اقبال نے کہا کہ قرآن مجید نکال لو اور سورۃ الحشر کی آیت ۱۹ کھول کر کہنے لگے کہ میرے فلسفۂ خودی کا ماخذ یہ آیت مبارکہ ہے:

﴿وَلَا تَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ نَسُوا اللّٰہَ فَاَنۡسٰہُمۡ اَنۡفُسَہُمۡ ؕ﴾

''اور ان لوگوں کے مانند نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انہیں خود اپنے آپ سے غافل کر دیا۔''

تو قرآن مجید میں یہ چیزیں بھی موجود ہیں، لیکن ضمنی طور پر آئی ہیں، اس طور سے کہ اس زمانے کا عرب اسے پڑھتے ہوئے ذرا سا تو ٹھٹکے، لیکن اس سے کوئی مفہوم اخذ کر کے آگے نکل جائے، رک نہ جائے، بلکہ گزر جائے۔ البتہ کوئی ایسا شخص جس کے ذہن میں فلسفیانہ مسائل ہوں گے وہ جب آئے گا تو رک جائے گا کہ جاایں جاست! یہ ہے اصل جگہ۔ وہ اس مقام پر غور کرے گا اور اس کی ہدایت اسے وہاں سے مل جائے گی۔ اور ظاہر ہے کہ جو خود فلسفی و حکیم ہے اسے زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہوتی، اس کے لیے تو اشارہ کافی ہے، اس کو راہنمائی کے لیے چند الفاظ مل گئے تو اس کی الجھن حل ہو گئی۔ یہی

وجہ ہے کہ فلسفیانہ مسائل قرآن مجید میں موجود تو ہیں' لیکن اس طرح کہ جن لوگوں کا مزاج فلسفیانہ نہیں وہ وہاں سے گزر جائیں گے' لیکن جن کے ذہن میں سوالات ہیں وہ وہاں رک جائیں گے۔ اب امام رازی' جو بہت بڑے منطقی' فلسفی اور متکلم ہیں وہ اس مقام پر رک گئے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ کہتے ہوئے تھر تھر کانپ رہے ہوں:

اِعْلَمْ اَنَّ ھذا المقامَ مقامٌ غامضٌ عمیقٌ مھیبٌ

''جان لو کہ یہ مقام بڑا عمیق اور گہرا مقام ہے' بڑا پُر ہیبت مقام ہے!''

اور آج کے دَور میں مثلاً مولانا اصلاحی صاحب یہاں سے ایسے گزر گئے جیسے یہاں کچھ ہے ہی نہیں۔ اپنی تفسیر کے اندر وہ حدیث کا سہارا بہت کم لیتے ہیں۔ ان کا اپنا ذوق اور مزاج تفسیر القرآن بالقرآن کا ہے۔ چنانچہ بعض معاملات میں تو انہوں نے متفق علیہ احادیث کو بھی لائق اعتناء نہیں سمجھا اور اٹھا کر پھینک دیا ___ لیکن یہاں صرف ایک حدیث کا سہارا لے کر گزر گئے جیسے اس آیہ مبارکہ میں اور کچھ ہے ہی نہیں۔ بہرحال یہ اصولی بات ذہن میں رکھیے کہ قرآن مجید میں دقیق فلسفیانہ مسائل پر مفصل بحث نہیں ہوتی' بلکہ صرف اشارہ ہوتا ہے۔

فلسفۂ وجود اور اس کی مختلف تعبیرات

یہ بات خاص طور پر یہ نوٹ کیجیے کہ فلسفۂ وجود فلسفے کا دقیق ترین مسئلہ ہے' اور اس کے بارے میں مجھے قطعاً یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں فلسفے کا طالب علم ہوں' نہ یہ میرا مقام ہے کہ میں اس پر authoritative انداز میں کوئی گفتگو کر سکوں' لیکن اس کے باوجود مَیں اس پر کیوں گفتگو کرتا ہوں' اسے سمجھ لیجیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اکابر واسلاف میں سے بہت سے حضرات وحدت الوجود کے قائل ہیں اور عام اہل مذہب کی جو ذہنی سطح ہے وہ وحدت الوجود کو کفر سمجھتے ہیں۔ اس طرح ایک بہت بڑا عقدۂ لاینحل (dilemma) پیدا ہو گیا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ ابنِ عربی کو تو خیر چھوڑ دیجیے کہ ان کی حیثیت کسی مفسر' محدث یا فقیہہ کی نہیں ہے' اگرچہ مجدّد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ جو اُن کے سب سے بڑے ناقد ہیں اور ان کے فلسفے کے جواب میں انہوں نے وحدت الشہود کے نام سے فلسفہ پیش کیا ہے' وہ ابنِ عربی کے علمی اور روحانی مقام کے زبردست قائل ہیں۔ وہ اپنے مکتوبات کے اندر یہ بھی کہتے ہیں کہ میں انہیں (اپنے کشف کے ذریعے) خاصانِ خداوند کے اندر دیکھتا ہوں۔ اور ایک جگہ یہ الفاظ آئے ہیں کہ ''من زَلّہ بردارِ خوانِ ایشانم لٰکن چہ کنم مسئلۂ صفاتِ باری تعالیٰ است!'' (میں تو ان کے دستر خوان کے جھوٹے ٹکڑے کھانے والوں میں سے ہوں' لیکن چونکہ معاملہ صفاتِ باری تعالیٰ کا ہے اور مجھے ان سے اختلاف ہے لہٰذا میں اپنا اختلاف پیش کرنے پر مجبور ہوں)۔ اس کے باوجود میں کہتا ہوں کہ کسی کو ابنِ عربی سے سوءِ ظن ہو' کوئی انہیں مرتد سمجھے یا جو چاہے کہے اس سے کوئی بہت بڑا فرق واقع نہیں ہوتا' لیکن شاہ ولی اللہؒ کو اگر کوئی یہ سمجھے کہ وہ مشرک تھے یا مرتد تھے یا ضال اور مُضِل تھے تو یہ بات بڑی تشویش کی ہے۔ ان کے علاوہ ہماری اور بہت بڑی بڑی شخصیات وحدت الوجود کی قائل ہیں۔ اس حوالے سے میں اپنے درس میں کوشش کیا کرتا ہوں کہ کم سے کم اس درجے تک بات واضح ہو جائے کہ ان حضرات سے سوءِ ظن نہ رہے۔ کوئی فلسفہ ہے' اس سے آپ اختلاف کریں' آپ کو بڑے سے بڑے انسان سے اختلاف کرنے کا حق حاصل ہے' لیکن یہ سمجھنا کہ یہ حضرات گمراہی اور کفر میں مبتلا ہو گئے (معاذ اللہ) بہت بڑی غلطی ہے۔ اس طرح تو پھر ہمارے لیے اپنے اسلاف میں کوئی سہارا نہیں رہے گا۔ اس حوالے سے میں اس موضوع پر گفتگو کیا کرتا ہوں۔ لیکن چونکہ موضوع بہت مشکل ہے اس لیے میں نے عرض کیا تھا کہ خود مجھ پر ایک دہشت کی کیفیت ہے کہ میں اسے بیان کر سکوں گا یا نہیں!

میں اس مسئلہ کو پہلے کچھ مقدمات کے حوالے سے واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اصل مسئلہ کیا ہے۔ جہاں تک خالق کی ایک ہستی کا تعلق ہے کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے' یہ فطرتِ انسانی کے اندر نقش ہے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ: ﴿اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ (ابراھیم: ۱۰)
''کیا اللہ کے بارے میں کوئی شک ہوسکتا ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا

ہے؟'' معلوم ہوا کہ خدا کو ماننا کہ کوئی خالق ہستی موجود ہے' یہ گویا فطرتِ انسانی کے اندر پہلے سے نقش ہے' اسے ہر انسان مانتا ہے چاہے اسے کوئی نام دے دے۔

Call the rose by any name, it will smell as sweet.

اس ضمن میں عوامی سطح پر لوگوں کی گمراہی یہ رہی ہے کہ جب وہ خالق کی ہستی کا قیاس کرتے ہیں تو اپنے بڑے سے بڑے انسان کے تصور سے اوپر نہیں جا سکتے۔ مثلاً کوئی بہت بڑا شہنشاہ ہے تو اس کے بھی کچھ نائبین سلطنت ہوتے ہیں' اس نے انہیں کچھ نہ کچھ اختیارات دیے ہوتے ہیں۔ اسی طرح بڑی سے بڑی شخصیت کے کچھ لاڈلے اور پیارے ہوتے ہیں جن کی بات وہ رد نہیں کر سکتا۔ یہ تصورات انسان نے اپنے ذہن کے حوالے سے اُس خالق کے ساتھ بھی چسپاں کر دیے ہیں کہ اللہ تو وہی ہے' لیکن آلِهَة بھی ہیں' چھوٹے چھوٹے معبود بھی ہیں۔ ''مہادیو'' تو ایک ہی ہے لیکن دیوتا اور دیویاں بھی ہیں جنہیں اس نے اختیارات دے رکھے ہیں' اس لیے کچھ بندگی اور ڈنڈوت ان کی بھی کرو تا کہ وہ بھی راضی ہو جائیں۔ دیوی دیوتاؤں کا تصور اصل میں ایمان بالملائکہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ یہ ہم بھی مانتے ہیں کہ ملائکہ نورانی مخلوق ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تنفیذ کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ ان کے ہاتھ میں کوئی اختیار نہیں ہے۔ ﴿يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ﴾ ''وہ وہی کچھ کرتے ہیں جس کا انہیں حکم ملتا ہے''۔ قرآن مجید میں حضرت جبرائیلؑ کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں:

﴿لَهٗ مَابَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ﴾ (مریم: ٦٤)

''جو کچھ ہمارے آگے ہے اور جو کچھ ہمارے پیچھے ہے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے (یعنی ہمارا اپنا وجود) ہر چیز کا مالک وہی ہے''۔

تو یہ اپنے وجود کے بھی مالک نہیں ہیں' یہ بھی اللہ کے اختیارِ مطلق میں ہے۔ یہ ہے درحقیقت وہ تصور جس نے ہمیں شرک سے بچا لیا' ورنہ اتنی برگزیدہ ہستیوں کو صاحب اختیار سمجھا جا سکتا تھا۔ قرآن حکیم میں حضرت جبرائیلؑ کی شان میں تو یہ الفاظ آئے ہیں:

﴿عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝ ذُوْمِرَّةٍ﴾ (النجم: ٥'٦)

''ان (محمدﷺ) کو زبردست قوت والے (جبرئیلؑ) نے تعلیم دی ہے' جو بڑا صاحب حکمت ہے''۔

دوسری جگہ یہ الفاظ آئے ہیں:

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ ذِىْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِى الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۝ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ۝﴾ (التکویر)

''یہ فی الواقع ایک بزرگ پیغام بر (جبرئیلؑ) کا قول ہے جو بڑی طاقت کا مالک ہے' عرش والے کے ہاں بلند مرتبہ ہے' اس کا حکم مانا جاتا ہے' وہ بااعتماد ہے''۔

اگر ہمارے پاس ان کے اختیار کے بارے میں واضح تعلیمات نہ ہوتیں تو ہم بھی انہیں دیوتا مان سکتے تھے' اور فرشتوں کے بارے میں یہی کچھ ان تمام مذاہب میں ہوا ہے۔ لیکن ہمارا تصور یہ ہے کہ اگرچہ وہ اس آفاقی کائنات کے کارندے ہیں لیکن ان کا اختیار کوئی نہیں ہے' یہ وہی کچھ کرتے ہیں جن کا حکم اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ لیکن مشرکین نے یہ تصور قائم کیا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں اور عیسائیوں نے یہ عقیدہ گھڑ لیا کہ حضرت مسیحؑ اللہ کے بیٹے ہیں۔ اس قسم کے تصورات سے شفاعت باطلہ کا تصور پیدا ہوا۔ چنانچہ اس عوامی سطح پر توحید اور معرفت ربّ کے ضمن میں کرنے کا کام یہ ہے کہ واضح کر دیا جائے کہ حاکم مطلق اللہ ہے اور اختیار اسی کے ہاتھ میں ہے' اُس کی اجازت کے بغیر کوئی کچھ نہیں کر سکتا' وہی تنہا معبودِ حقیقی ہے ؎

وہی ذاتِ واحد عبادت کے لائق
زباں اور دل کی شہادت کے لائق!

اس سے ذرا بلند تر سطح پر آیئے تو وہی اللہ تمہارا مطلوب و مقصود ہونا چاہیے۔ ساری محبتیں اس کی محبت کے تابع ہونی چاہئیں۔ مطلوب اور مقصود کے درجے میں اس کے سوا کوئی نہ ہو۔ گویا لا الٰہ الاّ اللہ ہی کی تعبیر ہے: لا معبودَ اِلاَّ اللّٰه' لا مقصودَ اِلاَّ

اللّٰہ، لا مطلوبَ اِلَّا اللّٰہ اور لا محبوب اِلَّا اللّٰہ۔ یہ ہے عوامی سطح پر توحید کا تصور۔ جو انسان یہاں تک پہنچ گیا اس کی توحید کامل ہوگئی۔

ایک اس سے بلند تر سطح ہے جس پر آ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خالق کو تو ہم نے مان لیا لیکن اس خالق اور مخلوق (کائنات) میں نسبت کیا ہے؟ یعنی اسے دو حصّوں میں تقسیم کر لیجیے۔

۱) خالق نے اس مخلوق کو کیسے پیدا کیا؟

۲) اب خالق و مخلوق کے درمیان کیا ربط ہے؟ جسے فلسفیانہ اصطلاح میں ''ربط الحادث بالقدیم'' کہا جاتا ہے۔ اس قدیم (اللّٰہ) اور حادث (کائنات) میں ربط کیا ہے؟

یہ ہے فلسفۂ وجود کا وہ مسئلہ جس کے اعتبار سے مختلف مکاتیب فکر پیدا ہوئے۔ اس ضمن میں ہمارے ہاں دو بڑے نظریے ''وحدت الوجود'' اور ''وحدت الشہود'' مشہور ہیں۔ لیکن اس سے پہلے جو بڑی گمراہیاں پیدا ہوئی ہیں اور انسان نے بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں ان کو سمجھ لیجیے۔ ایک تصور ہندو فلاسفی میں یہ دیا گیا کہ خالق اور مخلوق کے درمیان ایسا ہی ربط ہے جیسے ایک بڑھئی میز بنا دیتا ہے، لیکن بڑھئی کو میز بنانے کے لیے پہلے لکڑی درکار ہے۔ یعنی پہلے مادۂ تخلیق موجود ہوگا تب ہی خالق اس سے کوئی چیز بنائے گا۔ اب خالق تو ہے پرماتما، جس نے یہ کائنات تخلیق کی، لیکن مادہ بھی پہلے سے موجود تھا۔ چنانچہ ان کے ہاں مادہ بھی قدیم ہے اور خدا بھی۔ گویا اب یہ ثنویت ہوگئی کہ خدا اور مادہ (matter) دونوں قدیم ہیں۔

اس سے بھی آگے بڑھ کر ان کا ایک اور مکتبِ فکر ہے جو تین کو قدیم مانتا ہے، یعنی خدا بھی قدیم، مادہ بھی قدیم اور روح بھی قدیم۔ ظاہر بات ہے کہ یہ تو بدترین شرک ہے، ہم اس کے بارے میں مزید گفتگو کر کے اپنا وقت ضائع نہیں کریں گے۔ یہ ''تعددِ قدماء'' کے تصورات کہلاتے ہیں۔

خالق اور مخلوق کے مابین ربط و تعلق کی ایک دوسری شکل بعض لوگوں نے یہ تجویز کی ہے کہ درحقیقت خدا ہی نے اس کائنات کا روپ دھار لیا ہے، جیسے برف پگھل جائے تو پانی بن جاتا ہے۔ اب آپ کہیں کہ پانی کہاں سے آیا اور برف کہاں گئی؟ تو دراصل برف ہی پانی ہے اور پانی ہی برف ہے۔ چنانچہ اس نظریے کی رو سے یہ کائنات ہی خدا ہے۔ جب خدا ہی نے یہ شکل اختیار کر لی ہے تو گویا ہر شے خدا ہے اور ہر شے الوہیت کی حامل ہے۔ اس سے بڑا شرک اور کیا ہوگا؟ یہ ہمہ اوست یا Pantheism کا نظریہ ہے۔

اب اس سے بھی آگے نکل آیئے۔ اگر یہ کہا جائے کہ خالق و مخلوق کے درمیان ساری نسبتیں جو ہماری عقل میں آ رہی ہیں یہ قابل قبول نہیں ہیں تو پھر ایک ہی وجود ماننا پڑتا ہے جو خالق کا وجود ہے۔ اس نظریہ کو ''توحید وجودی'' کہا جاتا ہے۔ اس کی بہترین تعبیر مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے اپنی کتاب ''الدّین القیّم'' میں کی ہے، جو اس آیۂ مبارکہ کی بہترین تعبیر ہے، کہ خالق اور مخلوق میں نسبت کو یوں سمجھو کہ کسی شے کا تصور اپنے ذہن میں قائم کرو۔ فرض کریں آپ نے تاج محل دیکھا ہے، اب آپ تاج محل کا تصور اپنے ذہن میں لایئے۔ آپ کے ذہن میں یہ تصور آپ کی توجہ سے قائم ہے۔ جب تک آپ کی توجہ مرکوز رہے گی یہ تصور ذہن میں رہے گا، جیسے ہی توجہ ہٹے گی اس کا کوئی وجود باقی نہیں رہے گا، وہ ختم ہو جائے گا۔ اور یہ جو آپ کی ذہنی تخلیق ہے، آپ ہی اس کے نیچے بھی ہیں، اوپر بھی، اوّل بھی اور آخر بھی۔ اس کا اپنا تو کوئی وجود ہے ہی نہیں، وجود تو درحقیقت آپ کا ہے، یہ آپ کا ایک تصور ہے جو آپ نے اپنے ذہن کے اندر تخلیق کیا ہے۔ بالکل یہی تعلق ہے اس کائنات اور خالق کا۔ یہ کائنات کوئی علیحدہ شے نہیں ہے۔ گویا اس کا اپنا کوئی وجود نہیں ہے۔

اب اسی ''توحید وجودی'' کی ایک تعبیر شیخ احمد سرہندیؒ نے کی ہے۔ انہوں نے ایک بڑی پیاری مثال سے واضح کیا ہے کہ یہ کائنات ہمیں نظر تو آ رہی ہے لیکن حقیقت میں اس کا وجود نہیں ہے، وجود ایک ہی ہے اور وہ اللّٰہ کا وجود ہے۔ انہوں نے اس کی مثال یہ دی ہے کہ آپ ایک لکڑی لے کر اگر اس کے ایک سرے پر کوئی کپڑا باندھ دیں اور مٹی کا تیل ڈال کر دیا سلائی سے آگ لگا دیں تو اب ایک مشعل آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اسے ایک دائرے میں تیزی سے حرکت دیجیے تو دیکھنے والے کو ایک آتشیں دائرہ

نظر آئے گا' جب کہ دائرے کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں ہے ؏

ہر چند کہیں کہ ہے ' نہیں ہے!

وجود تو صرف اس ایک شعلہ جوالہ کا ہے' باقی حرکت کی وجہ سے بہت کچھ نظر آ رہا ہے جو فی الواقع موجود نہیں ہے۔ اسی کو کہا گیا ہے کہ ؎

كُلُّ مَا فِي الْكَوْنِ وَهْمٌ اَوْ خَيَالٌ
اَوْ عُكُوْسٌ فِي الْمَرَايَا اَوْ ظِلَالٌ

یعنی ''اس کائنات میں جو کچھ نظر آ رہا ہے یہ حقیقی نہیں ہے۔ اس کی حقیقت تو بس وہم اور خیال کی ہے یا بس اتنی ہے جیسے سائے ہوتے ہیں یا جیسے آئینہ میں عکس ہوتا ہے''۔

وجود تو اُس شے کا ہے جس کا عکس ہے' خود عکس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ تو حقیقی وجود صرف اللہ کا ہے۔ یہ نظریہ وحدت الشہود ہے۔ اس میں یہ بات ماننی پڑے گی کہ یہ کائنات جو نظر آ رہی ہے حقیقی وجود کی حامل نہیں ہے۔ بقول غالبؔ ؎

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے!

تو یہ کائنات درحقیقت اللہ کا تصور ہے' جو بڑا ٹھوس تصور ہے' جبکہ ہمارا تصور تو ایک ہوائی سا تصور ہوتا ہے۔ خالق اور مخلوق کے مابین نسبت کی یہ بہترین تعبیر ہوگی۔

﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾

اس کائنات کا اوّل بھی' آخر بھی' ظاہر بھی' باطن بھی وہی ہے۔

توحید وجودی کی ایک دوسری تعبیر بھی ہے' جو ابن عربی کی ہے۔ اور یہ بہت زیادہ دقیق تعبیر ہے' اس لیے کہ Pantheism اور ابن عربی کے نظریۂ وحدت الوجود میں بہت باریک فرق ہے' جسے عام انسان کے لیے ملحوظ رکھنا آسان نہیں ہے۔ ابن عربی کا نظریہ یہ ہے کہ خالق اور کائنات کا وجود تو ایک ہی ہے' ماہیت کے اعتبار سے کائنات عینِ وجودِ باری ہے' لیکن جہاں تعین ہو جاتا ہے وہاں وہ غیر ہو جاتا ہے۔ جیسے سائنس آج ہمیں بتاتی ہے کہ تمام اجسام atoms کے بنے ہوئے ہیں۔ atoms سے مالیکیول بنے ہیں اور ان سے مختلف چیزیں وجود میں آئی ہیں۔ ایٹم کی مزید تقسیم کریں تو electrons اور protons ہیں' پھر اس سے بھی چھوٹے photons ہیں۔ اور حقیقت میں تو کچھ ہے ہی نہیں' صرف electric currents ہیں۔ انہی electric currents نے جو خاص شکل اختیار کی تو وہ شے وجود میں آ گئی۔ آپ کو یہ ہال خالی نظر آ رہا ہے مگر یہ خالی تو نہیں ہے' اس میں ہوا ہے' جو ہائیڈروجن اور آکسیجن کا ملغوبہ ہے اور اس کے اندر وہ سارے ایٹم لطیف صورت میں موجود ہیں۔ مختلف اشیاء میں مختلف formations میں ایٹم موجود ہیں۔ چنانچہ ماہیت کے اعتبار سے اس گھڑی اور عینک میں کوئی فرق نہیں' یہ انہی ایٹموں کی مختلف تراکیب ہیں۔ لیکن جب ایک خاص فارمولے کے تحت conglomeration of atoms نے یہ شکل اختیار کی تو یہ ایک دوسرے کا غیر ہیں۔ لہٰذا جہاں کسی وجود یا کسی ہستی کا تعین آ گیا وہ ذاتِ باری تعالیٰ کا غیر ہے' اس کا جزو نہیں ہے' لیکن ماہیت وجود مشترک ہے۔ کل کائنات کے اندر وجود ایک ہی ہے اور وہ ذاتِ باری تعالیٰ کا ہے۔ اس کو کہا گیا ہے ''وحدت الوجود'' یعنی وجود کا ایک ہونا۔

حضرت شیخ احمد سرہندیؒ گیارہویں صدی ہجری کے مجدّدِ اعظم ہیں جبکہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ بارہویں صدی ہجری کے مجدّدِ اعظم ہیں' ان کے مابین قریباً سو سال کا فرق ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اس ضمن میں جو فیصلہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ ابن عربی کے نظریۂ وحدت الوجود اور شیخ احمد سرہندیؒ کے نظریۂ وحدت الشہود کے مابین صرف تعبیر کا فرق ہے' حقیقت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ اور اسے خود شاہ صاحبؒ نے ''توحید وجودی'' سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی وجود حقیقی ایک ہی ہے اور وہ اللہ کا ہے' لیکن جہاں کسی شے کا علیحدہ تشخص ہو گیا وہ اللہ کا غیر ہے' وہ خدا نہیں ہے۔ تاہم ماہیت وجود خالق اور مخلوق کے درمیان ایک مشترک قدر کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ہے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا نظریہ جسے شاہ ولی اللہؒ نے ''توحید وجودی'' سے تعبیر کیا اور اسی کی

تعبیر ''لا معبودَ اِلَّا اللّٰہ'' اور بلند تر سطح پر ''لامقصودَ اِلَّا اللّٰہ' لا مطلوبَ اِلَّا اللّٰہ اور لا محبوبَ اِلَّا اللّٰہ'' ہے۔ مزید اوپر جا کر اسی کی تعبیر ''لا موجودَ اِلَّا اللّٰہ'' سے کی جاتی ہے۔ یعنی اللہ کے سوا وجودِ حقیقی اور کسی کا نہیں' وجودِ حقیقی صرف اللہ کا ہے۔ البتہ جیسے سمندر کے اوپر بننے والی لہریں اگرچہ الگ نظر آتی ہیں لیکن درحقیقت وہ سمندر ہی کا حصہ ہیں' اسی طرح وجود بسیط خالق اور مخلوق کے درمیان مشترک ہے' البتہ جب کوئی وجود معین ہو کر کوئی شکل اختیار کر لیتا ہے تو وہ خالق کا غیر ہوتا ہے۔ یہاں یہ شے ہمہ اوست اور pantheism سے الگ ہو جاتی ہے۔ اس فرق کو ملحوظ رکھیے' اس کے بعد جی میں آئے تو آپ اس نظریے کو اٹھا کر پھینک دیں' آپ کو وہ ناقابل قبول نظر آئے تو بالکل ٹھکرا دیں۔ ہمیں بڑے سے بڑے شخص سے اختلاف کا حق حاصل ہے۔ اختلاف نہیں کر سکتے تو محمد رسول اللہ ﷺ سے نہیں کر سکتے' باقی ہر شخص سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ البتہ یہ بات پیشِ نظر رہے کہ جن لوگوں نے اس کو مانا ہے ان کی توہین نہ ہو' ان کے بارے میں یہ سوئے ظن نہ ہو کہ (معاذ اللہ) وہ ہمہ اوست اور Pantheism کے قائل ہیں اور وہ مشرک ہو گئے' گمراہ ہو گئے۔

فلسفۂ وجود کے یہ جو دو shades ہیں جن میں وحدت کا معاملہ ہے' ان کے ضمن میں ہندوستان کے مکاتب فلسفہ میں شنکر اچاریہ وحدت الوجود کا قائل تھا اور ایک دوسرا فلسفی رامانُج وحدت الشہود کا قائل تھا۔ فلسفۂ وجود کی یہی دو interpretations ہو سکتی ہیں' حقیقت میں بات ایک ہی ہے کہ وجود صرف اللہ کا ہے' باقی کوئی شے وجودِ حقیقی کی حامل نہیں۔ یا یہ کہیے کہ ماہیت وجود کے اعتبار سے مخلوق کو خالق کے ساتھ قدرِ مشترک کی حیثیت حاصل ہے' لیکن تعین کے اعتبار سے وہ خدا کا غیر ہے۔

حدیث نبویؐ سے راہنمائی

﴿هُوَ الۡاَوَّلُ وَالۡاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالۡبَاطِنُ﴾ کے بارے میں ہمیں حدیثِ نبویؐ سے بھی راہنمائی ملتی ہے۔ یہ حدیث حضرت ابوہریرہ ؓ سے مروی ہے اور صحیح مسلمؒ اور مسند احمد بن حنبلؒ میں آئی ہے۔ نیز قاضی ابویعلیٰؒ نے اسے اپنی ''مسند'' میں حضرت عائشہ صدیقہ k سے روایت کیا ہے۔ یہ اصل میں حضور ﷺ کی ایک دعا ہے:

اَللّٰھُمَّ اَنۡتَ الۡاَوَّلُ فَلَیۡسَ قَبۡلَکَ شَیۡءٌ
وَاَنۡتَ الۡاٰخِرُ فَلَیۡسَ بَعۡدَکَ شَیۡءٌ
وَاَنۡتَ الظَّاھِرُ فَلَیۡسَ فَوۡقَکَ شَیۡءٌ
وَاَنۡتَ الۡبَاطِنُ فَلَیۡسَ دُوۡنَکَ شَیۡءٌ

''اے اللہ! تو ہی وہ اوّل ہے جس سے پہلے کچھ نہیں۔ اور تو ہی وہ آخر ہے جس کے بعد کچھ نہیں ہو گا۔ تو ہی ظاہر ہے' تجھ سے بڑھ کر نمایاں یا بالاتر کوئی نہیں اور اے اللہ! تو ہی ایسا باطن ہے کہ تجھ سے زیادہ مخفی کوئی نہیں!''

آپ حدیث کے ان الفاظ پر غور کریں گے تو معلوم ہو گا کہ حضور ﷺ کی اس حدیث نے اس نہایت ثقیل' نہایت دقیق اور نہایت مشکل مضمون کو بہت سہل اور آسان بنا دیا۔ چنانچہ اس حدیث کے حوالے سے انسان بآسانی یہاں سے گزر جائے گا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ غور کرنے والے کے لیے اس میں اشکالات موجود ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو الفاظ ہمارے پاس ہیں ان کا اپنا ایک connotation اور مفہوم ہوتا ہے اور یہ الفاظ چونکہ ہماری زبان کے ہیں' لہٰذا ان کا وجود ہمارے اپنے تصورات کے مطابق ہوتا ہے۔ جب ہم کسی شے کو کہتے ہیں کہ یہ پہلی چیز ہے' اس سے پہلے کچھ نہیں' تو اس کے بارے میں خواہ مخواہ ایک تصور پیدا ہو جاتا ہے کہ اس شے کا گویا اپنا کوئی نقطۂ آغاز ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ پہلا مکان ہے' اس سے پہلے کچھ نہیں ہے' مگر اس سے پہلے خلا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں ہم یہ تصور قائم نہیں کر سکتے کہ اس کے وجود کا کوئی نقطۂ آغاز بھی ہے یا اس سے پہلے کوئی عدمِ محض تھا۔ لیکن اس کی تعبیر کے لیے ہم الفاظ کہاں سے لائیں؟ کسی ایسی ہستی کی تعبیر کے لیے جو ہمیشہ سے ہو' ہمارے پاس کوئی لفظ ہے ہی نہیں۔ اصطلاح میں ہم لفظ ''قدیم'' اختیار کرتے ہیں'

لیکن قدیم کے عام معنیٰ پرانی شے کے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ فلاں شہر بڑا قدیم شہر ہے‘ فلاں تہذیب بڑی قدیم تہذیب ہے‘ لیکن اس کے یہ معنیٰ تو نہیں ہو سکتے کہ وہ ہمیشہ سے ہے۔ یہ مفہوم تو ہمیں اضافی طور پر اصطلاح میں داخل کرنا پڑا‘ یہ ہماری مجبوری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری زبان میں وہ الفاظ ہی موجود نہیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مطلق کی صحیح تعبیر کر سکیں۔

آپ حدیث کے الفاظ پر غور کیجیے۔ فرمایا: ”وَاَنْتَ الْاٰخِرُ فَلَیْسَ بَعْدَکَ شَیْءٌ“ یہاں حضورﷺ نے لفظ ”بَعْدَکَ“ ارشاد فرمایا ہے‘ لیکن کیا اللہ کے بعد کا کوئی تصور ہے؟ ظاہر بات ہے کہ اللہ کے بعد کا کوئی تصور نہیں۔ اللہ تو ہمیشہ سے ہے‘ نہ کوئی لمحہ کبھی ایسا تھا کہ جب اللہ نہیں تھا اور پھر اس کے وجود کا کوئی آغاز ہوا ہو‘ اور نہ کوئی لمحہ کبھی ایسا آ سکتا ہے جب کہ اللہ کا وجود نہیں ہوگا‘ لیکن اس حقیقت کی تعبیر کے لیے سادہ اور عام فہم الفاظ وہی ہوں گے جو حضورﷺ نے اختیار فرمائے:

اَنْتَ الْاَوَّلُ فَلَیْسَ قَبْلَکَ شَیْءٌ
وَاَنْتَ الْاٰخِرُ فَلَیْسَ بَعْدَکَ شَیْءٌ

پھر ان الفاظ کے اندر از خود ایک احتیاج موجود ہے‘ اوّل و آخر کے الفاظ کوئی اضافی نسبت طلب کرتے ہیں کہ کس کا اوّل؟ کس کا آخر؟ یہ الفاظ اس خطبے میں بھی آئے ہیں جو حضورﷺ نے شعبان کے آخری دن رمضان المبارک کے استقبال کے ضمن میں اس کی عظمت کو بیان کرنے کے لیے دیا تھا۔ اس خطبے میں آپﷺ نے ”اوّل و آخر“ کو رمضان المبارک کے مہینے کے ساتھ نسبت دی: ((اَوَّلُهٗ رَحْمَةٌ وَاَوْسَطُهٗ مَغْفِرَةٌ وَآخِرُهٗ عِتْقٌ مِّنَ النَّارِ)) یعنی اس مہینے کا اوّل اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مظہر ہے‘ درمیانی حصہ اللہ کی مغفرت کا مظہر ہے اور اس کا آخری حصہ جہنم سے گلوخلاصی ہے۔

اسی طرح آپ دیکھیں گے کہ اسی سورۂ مبارکہ میں آگے آ رہا ہے: ﴿فَضُرِبَ بَیْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ﴾ کہ جنت اور دوزخ کے مابین ایک فصیل حائل کر دی جائے گی جس کا ایک دروازہ ہوگا۔ ﴿بَاطِنُهٗ فِیْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ﴾ اس دروازے کے اندر رحمت ہوگی اور باہر عذاب۔ تو باطن کے لیے بھی نسبت درکار ہے کہ کس شے کا باطن‘ اور ظاہر کے لیے بھی نسبت درکار ہے کہ کس شے کا ظاہر! ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ میں اس شے کا ذکر نہیں کیا گیا‘ لیکن اگر اس پر غور کیا جائے تو وہ ایک ہی شے ہو سکتی ہے کہ کل سلسلۂ کون و مکاں‘ یہ کل تخلیق کا سلسلہ! اس سلسلہ کا اوّل بھی اللہ ہے‘ اس کا آخر بھی اللہ ہے‘ اس کا ظاہر بھی اللہ ہے اور اس کا باطن بھی اللہ ہے‘ لیکن چونکہ قرآن مجید فلسفیانہ انداز اختیار کرنا نہیں چاہتا‘ لہٰذا وہ الفاظ اختیار کیے گئے جن کو ایک عام آدمی‘ ایک بدو بھی پڑھ کر گزر جائے اور اسے کوئی اشکال نہ ہو۔ اور اگر اسے زیادہ ہی دقت ہو تو اس حدیث نبویؐ کے حوالے سے اس کی مشکل حل ہو جائے گی اور وہ بڑی سہولت کے ساتھ یہاں سے گزر جائے گا:

اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الْاَوَّلُ فَلَیْسَ قَبْلَکَ شَیْءٌ
وَاَنْتَ الْاٰخِرُ فَلَیْسَ بَعْدَکَ شَیْءٌ
وَاَنْتَ الظَّاهِرُ فَلَیْسَ فَوْقَکَ شَیْءٌ
وَاَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَیْسَ دُوْنَکَ شَیْءٌ

لیکن حقیقت میں کائنات کے اس پورے سلسلۂ تخلیق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ذات کا ربط یہ ہے کہ وہ اس کا غیر نہیں ہے۔

معیتِ الٰہی کا مفہوم

ذاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں ہمارے عوام کا ایک عام تصور یہ ہے کہ وہ کسی ایک خاص جگہ پر موجود ہے اور اس کا وجود کائنات میں ہر جگہ نہیں ہے۔ اسی سورۂ مبارکہ کی اگلی آیت میں جو الفاظ آ رہے ہیں: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ ”اور وہ تمہارے ساتھ ہی ہوتا ہے جہاں کہیں تم ہو“ کے بارے میں بالعموم یہ تصور ہے کہ وہ صرف اپنی صفات کے اعتبار سے ہمارے ساتھ ہے‘ ہمیں دیکھ رہا ہے‘ ہماری باتیں سن رہا ہے۔ یہ تو اس کی تاویل ہو گئی‘ جبکہ الفاظ تو یہ ہیں: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا

کُنْتُمْ﴾ ''اور وہ خود تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں بھی تم ہو''۔تو یہ تاویل درحقیقت ان الفاظ کا حق ادا نہیں کر رہی۔ وہ ہمارے ساتھ کیسے ہے؟ یہ ہم نہیں جانتے' لیکن وہ ہمارے ساتھ ہر جگہ' ہر آن موجود ہے۔اس کے لیے انگریزی میں جو Attributes of God آئے ہیں وہ بہت جامع ہیں۔ وہ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہے' Omnipotent ہے۔وہ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ہے' Omniscient ہے۔ جہاں کہیں بھی تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے' Omnipresent ہے۔

﴿وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ﴾ یہ الفاظ بالکل واضح ہیں' ان میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں ہے۔ جیسے اللہ کا ہاتھ (یَدُ اللّٰہِ) ایک حقیقت ہے۔ہم مانتے ہیں کہ اللہ کا ہاتھ ہے' وہ ایسا ہاتھ نہیں ہے جیسے ہمارا' لیکن کوئی حقیقت تو ہے جس کو ''یَدُ اللّٰہِ'' سے تعبیر کیا گیا۔اس کی کیفیت کو ہم نہیں جانتے' یہ ہماری وہ مجبوری ہے جو اللہ کی ہر صفت کے بارے میں ہے۔ جیسا کہ میں گزشتہ نشست میں بیان کر چکا ہوں' اللہ دیکھتا ہے' لیکن کیسے دیکھتا ہے؟ یہ ہم نہیں جانتے! ہمیں کیا پتہ کہ کیسے دیکھتا ہے! اس کی اس طرح کی آنکھیں تو نہیں ہیں جیسی ہماری۔ اس کا دیکھنا اس خارجی نور کا محتاج تو نہیں ہے جس کے ہم محتاج ہیں۔ ہماری بصارت اگرچہ موجود ہو' آنکھ بھی درست ہو' لیکن اگر روشنی نہ ہو تو ہم نہیں دیکھ سکتے۔ ہمارے اور اس کے مابین لفظ ''دیکھنا'' مشترک ہے' کہ ہم بھی دیکھتے ہیں' وہ بھی دیکھتا ہے' لیکن اس کی نوعیت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ گویا ع ''چہ نسبت خاک را با عالم پاک!'' ہمارے اور اس کے دیکھنے کی نوعیت میں کوئی آس پاس کا قرب ہے ہی نہیں۔ فارسی کے یہ اشعار ذرا ملاحظہ کیجیے ؂

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم
وز ہر چہ گفتہ ایم و شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر
ما ہم چناں در اوّلِ وصفِ تو ماندہ ایم!

''اے وہ ذات تبارک و تعالیٰ جو ہمارے خیال' قیاس' گمان اور وہم ہر شے سے ماوراء ہے! جو کچھ ہم نے کہا' جو کچھ ہم نے سنا اور جو کچھ ہم نے پڑھا' ان سب سے تیری ذات بہت بلند اور اعلیٰ و ارفع ہے۔ (ہمارے پاس وہ نطق اور وہ الفاظ ہی نہیں ہیں جن سے ہم تیرے کسی وصف کو بیان کر سکیں۔) دفتر کے دفتر ختم ہو گئے اور اب ہماری عمر کا سفینہ بھی آخری سرحد کو پہنچا ہوا ہے' اس کے باوجود ہم ابھی تیری پہلی صفت ہی کے بارے میں متحیر اور پریشان ہیں (اور ہمیں اس کے بارے میں کوئی تصور اور ادراک نہیں ہو سکا)''۔

متکلمین کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی صفت اوّلین وجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کی چھ سب سے اہم اور بنیادی صفات وجود' حیات' علم' ارادہ' قدرت اور کلام ہیں' بقیہ تمام صفات ان ہی صفات کی شرح ہیں۔ بعض لوگ ان میں سماعت اور بصارت کو بھی شامل کرتے ہیں' لیکن سماعت اور بصارت درحقیقت صفت علم ہی کی شرح ہیں۔ تو ان صفات میں سب سے پہلی صفت ''وجود'' ہے' جس کے بارے میں کہا گیا ''ما ہم چناں در اوّل وصفِ تو ماندہ ایم!'' یعنی ہم تو تیرے پہلے وصف کے بارے میں ہی متحیر ہیں' پریشان ہیں اور اس پر غور کرتے ہوئے ہماری عقل ہمارا ساتھ چھوڑ جاتی ہے ؂

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

وجودِ باری تعالیٰ کے بارے میں جو تشبیہات پیش کی گئی ہیں وہ میں آپ کے سامنے عرض کر چکا ہوں۔ آپ چاہیں تو توحید وجودی اور وحدت الوجود کو دماغ کا خلل قرار دیں' لیکن اسے کفر اور شرک نہ کہیں' اس لیے کہ نظریہ ''وحدت الوجود'' ہمہ اوست اور Pantheism کے مترادف نہیں ہے۔

علمِ الٰہی کی وسعت و جامعیت

آیت کے آخر میں الفاظ آئے: ﴿وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ x﴾ ''اور وہ ہر شے کا جاننے والا ہے''۔ جب ہر شے کا اوّل و آخر' ظاہر و باطن وہی ہے تو کائنات کے اندر وہ کہیں دُور نہیں ہے' بلکہ تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے۔ جیسے سورۂ قٓ میں فرمایا: ﴿نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ π﴾ ''ہم تو انسان سے اس کی رگِ جان

سے بھی قریب تر ہیں‘‘۔ یہاں جو فرمایا گیا: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ ’’جہاں کہیں بھی تم ہوتے ہو وہ تمہارے ساتھ ہے‘‘ ہم اس کی کُنہہ کو نہیں پہنچ سکتے‘ اس کی کیفیت کو نہیں جان سکتے‘ لیکن ہمارا ایمان ہے کہ اللہ ہر جگہ‘ ہر آن موجود ہے‘ ہم جہاں کہیں بھی ہوں وہ ہمارے ساتھ ہے‘ وہ ہماری رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اور جب وہ اتنا قریب ہے تو معلوم ہوا کہ ہر چیز کا گویا وہ خود ہی چشم دید گواہ ہے۔ فرشتے نامۂ اعمال کی صورت میں جو رپورٹیں تیار کر رہے ہیں اللہ ان کا محتاج نہیں ہے۔ وہ تو ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ فرشتوں کی رپورٹیں تو اس لیے تیار ہو رہی ہیں کہ

Justice should not only be done, it should also appear to have been done.

نامۂ اعمال کی یہ فائلیں اس لیے تیار ہو رہی ہیں کہ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے فیصلے کو چیلنج کرے تو اس سے کہا جائے کہ:

﴿اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا﴾ (بنی اسراء یل)

’’اپنی کتاب پڑھ لے! تو آج اپنا آپ ہی محاسب کافی ہے۔‘‘

یہ سب اتمامِ حجت کے لیے ہے‘ ورنہ اللہ تعالیٰ بذاتِ خود سمیع‘ بصیر ہے‘ جہاں کہیں بھی تم ہوتے ہو وہ تمہارے ساتھ موجود ہوتا ہے‘ اس حوالے سے وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ علم اور قدرت اللہ تعالیٰ کی دو بڑی بنیادی صفات ہیں‘ جن کے بارے میں قرآن حکیم میں بار بار آتا ہے: وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ‘ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۔ لفظ کُل جو ہے یہ درحقیقت ہماری پناہ گاہ ہے۔ ہم اس کی قدرت اور اس کے علم کا کوئی اندازہ نہ تو کمیت کے اعتبار سے (quantitatively) کر سکتے ہیں اور نہ کیفیت کے اعتبار سے (qualitatively)۔ ہم نہ تو یہ جان سکتے ہیں کہ اسے کتنی قدرت حاصل ہے اور نہ ہی ہم اسے پہچان سکتے ہیں کہ اس کی قدرت کیسے exercise ہوتی ہے۔ اس کا علم کتنا ہے اور اسے کیسے حاصل ہوتا ہے‘ یہ ہم نہیں جان سکتے۔ ان تمام چیزوں سے ہٹ کر ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ ہر شے کا علم رکھتا ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے۔ چنانچہ ان آیات میں بھی آپ دیکھیں گے کہ صفت علم کو کتنی مرتبہ دہرا کر لایا گیا ہے۔

تخلیق کائنات —— چھ دن میں

آگے فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ﴾ ’’وہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں‘‘۔ یہ بات میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ آسمان اور زمین قرآن کی مستقل تعبیر ہے کل سلسلۂ کون و مکان کے لیے۔ قرآن حکیم کون و مکان جیسی فلسفیانہ اصطلاحات استعمال نہیں کرتا‘ آسمان اور زمین کے مفہوم کو عام آدمی بھی سمجھتا ہے‘ لیکن اس سے مراد ہے کل سلسلۂ وجود‘ کل سلسلۂ مخلوقات‘ کل سلسلۂ کائنات۔ یہ سب اللہ تعالیٰ نے چھ دنوں میں تخلیق فرمایا۔

آسمان و زمین کی چھ دنوں میں تخلیق کا مضمون قرآن مجید میں سات مرتبہ آیا ہے‘ جس طرح قصۂ آدم و ابلیس بھی قرآن مجید میں سات مرتبہ دہرایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین چھ دنوں میں پیدا کیے۔ یہاں دن سے مراد کیا ہے؟ اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ اس سے ہمارا دن مراد نہیں ہے۔ ہماری زمین کی اپنے محور پر ایک گردش جو ہوتی ہے اس سے ہمارا چوبیس گھنٹے کا ایک رات دن وجود میں آتا ہے۔ اسی طرح ہر سیارے (planet) کا دن دوسرے سے مختلف ہے۔ اب ہماری پوری کہکشاں (Galaxy) کا دن کیا ہوگا؟ کائنات کی ہر شے گھوم رہی ہے‘ جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے: ﴿كُلٌّ فِىْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ﴾ یہ بہت بڑی astronomical حقیقت ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے۔ اگر انسان واقعتاً ادراک کرے تو حیرت ہوتی ہے کہ قرآن حکیم میں چودہ سو برس قبل یہ الفاظ آئے ہیں۔ اُس وقت صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس کا کیا مفہوم سمجھا ہوگا‘ ہم اس کا کچھ اندازہ نہیں کر سکتے۔ یہ حقیقت انسان پر بتمام و کمال آج منکشف ہوئی ہے کہ ع ’’سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں!‘‘ کائنات کی کوئی شے ٹھہری ہوئی نہیں۔ ذرّہ (atom) کو دیکھیں تو اس میں بھی electrons مسلسل حرکت میں ہیں اور اسی طرح آپ اپنے نظامِ شمسی کو

دیکھیں تو ہر سیارہ گردش میں نظر آتا ہے‘ جیسے زمین کے بارے میں کہا گیا ع

''یہ زمیں ' یہ فضا کی رقاصہ!''

زمین گویا رقص کر رہی ہے‘ خود اپنے محور کے گرد بھی چکر کھا رہی ہے اور سورج کے گرد بھی طواف کر رہی ہے۔ پھر یہ سورج جو اپنے پورے خاندان کو لے کر کسی بہت بڑے star کے گرد چکر لگا رہا ہے‘ یہ تیسری حرکت ہے۔ پھر ہماری پوری Galaxy حرکت میں ہے۔ چنانچہ ہر شے حرکت میں ہے۔ اس حقیقت کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کر دیا: ﴿کُلٌّ فِیۡ فَلَکٍ یَّسۡبَحُوۡنَ﴾۔ جیسے اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں ایک ہی لفظ ''کُل'' ہماری پناہ گاہ ہے اسی طرح یہاں بھی وہی لفظ ''کُل'' استعمال کیا گیا ہے۔ تو اب اس پوری کائنات کا دن کیا ہوگا؟ قرآن مجید میں کچھ اور دنوں کا بھی تصور ہے‘ لیکن لازم نہیں ہے کہ وہ مقدار یہاں مراد سمجھی جائے۔ البتہ ایک اللہ تعالیٰ کی تدبیر کا دن ہے۔ وہ ہماری اس دنیا کے معاملات کی تدبیر فرماتا ہے۔ جیسے ہمارے ہاں پانچ سالہ یا دس سالہ منصوبہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں سے ایک دن کے لیے (جو ہمارے حساب سے ہزار برس ہوتے ہیں) تدبیر کا معاملہ طے ہو جاتا ہے‘ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿یُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الۡاَرۡضِ ثُمَّ یَعۡرُجُ اِلَیۡهِ فِیۡ یَوۡمٍ کَانَ مِقۡدَارُهٗۤ اَلۡفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ﴾ (السجدة)

''وہ اپنے امر کی تدبیر کرتا ہے آسمان سے زمین کی طرف‘ پھر وہ امر اس کی طرف واپس لوٹتا ہے ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار سے ایک ہزار سال ہے''۔

ایک ہزار برس کی اس مقدار کی غلط تعبیر کرتے ہوئے اکبر کے زمانے میں ابوالفضل اور فیضی جیسے بڑے جغادری علماء نے‘ جو اقبال کے الفاظ میں لغت ہائے حجازی کے قارون تھے‘ اکبر کے ایماء پر یہ شوشہ چھوڑا کہ شریعت محمدی کو آئے ہوئے ایک ہزار برس پورے ہو گئے ہیں‘ لہٰذا اب دینِ محمدیؐ کا دور ختم ہوا اور دین الٰہی کا دور شروع ہو رہا ہے۔

قرآن مجید میں پچاس ہزار سال کے برابر ایک دن کا ذکر بھی موجود ہے اور اس کے بارے میں گمان غالب ہے کہ وہ قیامت کا دن ہے۔ فرمایا: ﴿تَعۡرُجُ الۡمَلٰٓئِکَةُ وَالرُّوۡحُ اِلَیۡهِ فِیۡ یَوۡمٍ کَانَ مِقۡدَارُهٗ خَمۡسِیۡنَ اَلۡفَ سَنَةٍ﴾ (المعارج:٤) ''ملائکہ اور روح (جبرئیلؑ) اس کے حضور چڑھ کر جاتے ہیں ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے''۔ جہاں تک زمین و آسمان کی چھ دنوں میں تخلیق کا معاملہ ہے تو یہ ضروری نہیں ہے کہ تخلیق کے ایک دن کو ہم ایک ہزار برس کا قرار دیں اور نہ یہ ضروری ہے کہ اسے پچاس ہزار برس کا قرار دیں۔ تخلیق کے ان چھ دنوں کی مقدار ہمیں معلوم نہیں ہے‘ یہ دراصل چھ ادوار ہیں جن کے لیے ہم millenniums یا eras کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

خالق بھی وہی‘ حاکم بھی وہی

آگے فرمایا: ﴿ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ﴾ ''پھر وہ عرش پر جلوہ افروز ہوا''۔ ایسا ہرگز نہیں کہ تخلیق فرما کر وہ کہیں علیحدہ بیٹھ گیا ہو‘ بلکہ وہ تختِ حکومت پر متمکن ہوا۔ بعض صوفیاء کا تصور بھی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تو اپنی ذات میں مگن ہے‘ اسے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ کائنات میں کیا ہو رہا ہے‘ وہ اس سے مستغنی ہے۔ چنانچہ مشائین (جو ارسطو کی منطق کے پیروکار ہیں) یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عالم کلیات ہے‘ عالم جزئیات نہیں ہے۔ یہی گمراہی اس وقت جدید سائنسی تصورات اور مادہ پرستی کے زیر اثر پھیل رہی ہے۔ دَورِ جدید کا سب سے بڑا شرک تو انسانی حاکمیت کا تصور ہے‘ جبکہ اس کے ساتھ دوسرا بڑا شرک مادّہ پرستی ہے۔ اس مادّہ پرستی نے انسانی ذہن کو اتنا گرفت میں لے لیا ہے کہ جو خدا کو مانتا ہے وہ بھی اس معنی میں مانتا ہے کہ کائنات کا خالق (Creator) تو وہ ہے‘ لیکن اس کی تخلیق کے بعد اس نے کچھ طبعی قوانین (physical laws) بنا دیے ہیں جن کے تحت یہ کائنات خود بخود چل رہی ہے۔ چنانچہ ہر لحظہ‘ ہر آن اللہ کا فیصلہ اور اس کا اِذن ان کے تصور سے ماوراء ہے۔ فلسفہ کی اصطلاح میں اسے ''اللہ کی تعطیل'' کہتے ہیں‘ یعنی اللہ کو معطل کر دینا۔ گویا کائنات کی تخلیق کے بعد اب وہ معطل ہے‘ اسے اس کائنات کی روز بروز اور لمحہ بہ لمحہ

working سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اس نے جو قوانین بنا دیے ان کے تحت کائنات کا نظام از خود چل رہا ہے، جیسے فٹ بال کا کوئی کھلاڑی فٹ بال کو ٹھوکر لگائے تو وہ گیند دوڑتی چلی جاتی ہے جب تک کہ کوئی مزاحمت اسے نہ روکے۔ اس گیند کو آگے بڑھانے میں اب اس کھلاڑی کا کوئی تعلق نہیں ہوتا جس نے اسے کک لگائی تھی۔ جبکہ ایمان اور قرآن ہمیں اللہ تعالیٰ کی یہ معرفت دیتے ہیں کہ وہ تختِ حکومت پر متمکن ہے اور نظامِ کائنات کو کنٹرول کر رہا ہے، جیسا کہ ابھی ہم نے پڑھا: ﴿یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ﴾ یہاں تک کہ اس کے اِذن کے بغیر پتا تک جنبش نہیں کر سکتا۔ یہ تصور جب تک نہ ہو تو انسان کو ایمان باللہ اور معرفتِ ربّ حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ وہ مفہوم ہے جو یہاں دیا گیا ہے: ﴿ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ﴾

اللہ تعالیٰ عالمِ کلیات ہی نہیں عالمِ جزئیات بھی ہے

آیت کے اگلے الفاظ میں ان جہلاء کے نظریات کی نفی ہو رہی ہے جنہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ جزئیات کا عالم نہیں۔ قرآن نے یہ جو حقیقت بیان کی ہے اس سے فلسفہ و سائنس کی بہت سی گمراہیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے اور بہت سے عقدے حل ہو جاتے ہیں۔ فرمایا: ﴿یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا﴾ ''وہ جانتا ہے جو کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے''۔ زمین میں داخل ہونے والی شے بارش کا وہ قطرہ بھی ہے جو جذب ہو رہا ہے اور وہ بیج بھی ہے جو کسی درخت کا پھل سوکھنے کے بعد اس سے نکلتا ہے اور زمین میں قرار پکڑ لیتا ہے۔ ان دونوں کے نتیجے میں زمین سے جو کونپل پھوٹتی ہے وہ بھی اس کے علم میں ہے۔ اسی طرح زمین میں داخل ہونے والے مردے بھی ہیں جو زمین میں مٹی کے ساتھ مل کر مٹی ہو رہے ہیں، لیکن پھر وہ یہیں سے زندہ کر کے نکالے جائیں گے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿مِنْهَا خَلَقْنٰکُمْ وَفِیْهَا نُعِیْدُکُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُکُمْ تَارَةً اُخْرٰی﴾ (طٰہٰ) ''اسی زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا ہے، اسی میں ہم تم کو واپس لے جائیں گے اور اسی سے تم کو دوبارہ نکالیں گے''۔ چنانچہ ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی شے جو زمین میں داخل ہو رہی ہے اور جو اس سے نکل رہی ہے یا نکلے گی وہ اس کے علم میں ہے۔

﴿وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا﴾ ''اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے (وہ بھی اس کے علم میں ہے)''۔ آسمان سے نازل ہونے والی بارش بھی ہے اور فرشتے بھی جو آسمان سے اترتے ہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِکَةُ وَالرُّوْحُ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِّنْ کُلِّ اَمْرٍ﴾ ''اترتے ہیں اس رات میں فرشتے اور روح اپنے ربّ کے اِذن سے ہر حکم لے کر''۔ تو فرشتے اللہ تعالیٰ کے احکام لے کر ان کی تنفیذ کے لیے اترتے ہیں اور یہاں سے رپورٹ لے کر اور نفوس و ارواحِ انسانیہ کو لے کر اوپر جاتے ہیں۔ پس جو کچھ یہاں ہو رہا ہے ہر شے اللہ کے علم میں ہے۔ گویا کہ احاطہ کر لیا گیا کہ کوئی شے اللہ کے علم سے باہر نہیں ہے۔ دوسرے مقام پر اس کی وضاحت ان الفاظ میں آئی ہے: ﴿وَیَعْلَمُ مَا فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ط وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا یَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ﴾ (الانعام) ''بحر و بر میں جو کچھ ہے وہ اس سے واقف ہے۔ کسی درخت سے گرنے والا کوئی پتا ایسا نہیں جس کا اسے علم نہ ہو۔ زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں جس سے وہ باخبر نہ ہو۔ خشک و تر سب کچھ ایک کھلی کتاب میں لکھا ہوا ہے''۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ صرف کلیات کا عالم نہیں بلکہ جزئیات کا بھی عالم ہے، زمین و آسمان اور بحر و بر کا چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی اس کے علم میں ہے۔ یہ بات اگرچہ ہمارے ذہن میں نہیں آ سکتی، لیکن ایمان کا جزوِ لازم ہونے کی حیثیت سے اس پر ایمان رکھنا ناگزیر ہے۔

معیتِ الٰہی کی کیفیت؟

آگے فرمایا: ﴿وَهُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ﴾ ''وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں بھی تم ہو''۔ سورۃ الحدید کی ان چھ آیتوں میں پہلی دو، درمیان کی دو اور آخری دو آیتوں پر مشتمل تین جوڑے ہیں اور ان کے اوّل و آخر میں ایک مناسبت ہے۔ درمیانی دو آیات (۳، ۴) اہم ترین ہیں۔ تیسری آیت میں وہ الفاظ آئے ہیں: ﴿هُوَ الْاَوَّلُ

وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ اور چوتھی آیت میں یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ ''وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں بھی ہو''۔اس کا تعلق بھی فلسفۂ وجود سے ہے۔اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے ہم جہاں کہیں بھی ہوں—— لیکن کیسے ہے؟ یہ ہم نہیں جانتے۔ہم اس کی کیفیت کو نہیں جان سکتے۔بعض لوگوں نے اپنی ذہنی سطح کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں تجسیم کا تصور قائم کیا ہے کہ وہ کسی جہت' کسی مکان' کسی مقام پر محدود ہے۔اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں ایسا تصور معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ' بالکل درست نہیں ہے۔ وہ تو ہر آن' ہر جگہ موجود ہے' البتہ کیسے ہے؟ یہ ہم نہیں جانتے۔ یہ ہمارا ایمان ہے کہ اس کی ذات مطلق ہے' وہ کسی جگہ محدود نہیں ہے۔ جب کسی معاملے میں شدت آ جاتی ہے تو انسان ایک انتہا سے دوسری انتہا تک چلا جاتا ہے۔اس کی ایک مثال ملاحظہ کیجیے! حدیث قدسی میں الفاظ آتے ہیں کہ رات کے آخری حصے میں اللہ تعالیٰ سمائے دنیا تک نزول فرماتے ہیں اور وہاں سے ندا لگتی ہے کہ:

هَلْ مِنْ مُسْتَغْفِرٍ فَاُغْفِرَ لَهٗ؟

هَلْ مِنْ سَائِلٍ فَاُعْطِيَهٗ؟

''ہے کوئی استغفار کرنے والا کہ میں اسے معاف کروں؟ ہے کوئی مانگنے والا کہ میں اسے عطا کروں؟''

ہمیں معلوم ہے کہ سات آسمان ہیں' ساتویں آسمان کے اوپر پھر عرش کی کرسی ہے' رات کے آخری حصے میں اللہ تعالیٰ عرش سے سمائے دنیا یعنی پہلے آسمان تک نزول فرماتا ہے۔اس نزول کی کیفیت ہم نہیں جانتے۔

اب اس کے بارے میں کچھ لوگ اس انتہا پر ہیں کہ وہ اس کی مطلق نفی کر دیتے ہیں کہ اللہ کے نزول کا کیا سوال؟ اللہ کسی خاص جگہ پر محدود تو نہیں ہے کہ وہاں سے نیچے اترے! اور ایک انتہا وہ ہے جو ایک روایت میں وارد ہوئی ہے کہ امام ابن تیمیہؒ منبر پر کھڑے تقریر کر رہے تھے اور ان لوگوں کی نفی کرتے ہوئے ایک ایک سیڑھی کر کے نیچے اترے اور کہا کہ اللہ ایسے اترتا ہے جیسے میں اترا ہوں۔ یہ دوسری انتہا ہے۔ہم اپنے اترنے پر اللہ کے اترنے کو قیاس کریں تو یہ غلط ہے۔ہمیں یہ ماننا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نزول فرماتا ہے لیکن ہم اس کی کیفیت معین نہیں کر سکتے۔درحقیقت اللہ تعالیٰ کی تجلیات کسی خاص مقام پر مرکوز ہو سکتی ہیں' اللہ کی ذات کسی مقام پر محدود نہیں ہے۔اللہ کی تجلیاتِ خصوصی ہیں جو کرسی پر ہیں' جو عرش پر ہیں' جو ساتویں آسمان کے اوپر ہیں' جس کے بارے میں سورۃ النجم میں آیا ہے: ﴿عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى N عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى O﴾ ''سدرۃ المنتہیٰ کے پاس' اس کے پاس ہی جنت الماویٰ ہے''۔مکان اور مکانیت کی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے' ہم ذاتِ باری تعالیٰ سے ان چیزوں کو بالکل منقطع بھی نہیں کر سکتے' ورنہ تو ہم قرآن مجید کی ہر آیت کی تاویل کرتے چلے جائیں گے' پھر تو ہر چیز استعارہ بن کر رہ جائے گی' لیکن اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے کسی مقام پر محدود نہیں ہے' وہ اس کی خصوصی تجلی ہے جو کسی مقام پر مرکوز ہے۔چنانچہ ان ہی انوار کا ذکر بایں الفاظ کیا گیا: ﴿اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى Π﴾ ''جبکہ اس سدرۃ المنتہیٰ کو ڈھانپے ہوئے تھا' جو ڈھانپے ہوئے تھا''۔ہم تو یہ بھی نہیں سمجھ سکتے کیا ڈھانپے ہوئے تھا جس کے لیے قرآن مجید نے مبہم الفاظ استعمال کیے ہیں۔تم کیا سمجھو گے کہ کیا ڈھانپے ہوئے تھا؟ تمہارے سامنے وہ بات بیان نہیں کی جا سکتی۔اس کا مشاہدہ حضورﷺ نے اس شان کے ساتھ کیا کہ ﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى Θ﴾ ''نگاہ نہ کج ہوئی نہ حد سے متجاوز ہوئی''۔ ﴿لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى P﴾ ''اس نے اپنے ربّ کی بڑی بڑی نشانیوں کا مشاہدہ کیا''۔ وہ بیری کو ڈھانپنے والی اللہ ربّ العزت کی تجلیاتِ خصوصی تھیں' جو اُس وقت وہاں نزول فرما رہی تھیں اور حضورﷺ نے ان کا مشاہدہ کیا۔اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تجلیاتِ خصوصی کا کعبۃ اللہ پر ارتکاز ہے۔ چنانچہ اللہ کی تجلی مختلف مقامات پر ہو سکتی ہے' لیکن جہاں تک ذاتِ باری تعالیٰ کا تعلق ہے اس کے ساتھ اگر کسی جسمانیت' کسی جہت یا کسی مقام کا تصور کیا جائے تو میرے خیال میں یہ اللہ کے شایانِ شان نہیں ہے۔ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ ''اور جہاں کہیں بھی تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے''۔اگرچہ ہم یہ نہیں سمجھ

سکتے کہ وہ کیسے ہمارے ساتھ ہے۔ اس کی کیفیت کو ہم نہیں جانتے‘ معیت کو ہم جانتے ہیں۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے جہاں کہیں بھی ہم ہوتے ہیں۔

اعمالِ انسانی کا چشم دید گواہ

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ ۵﴾ ”اور جو کچھ بھی تم کر رہے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے“۔ جب وہ ہر جگہ‘ ہر آن تمہارے ساتھ ہے تو جو کچھ تم کر رہے ہو وہ اسے خود دیکھ رہا ہے۔ وہ تمہارے سب اعمال کا چشم دید گواہ ہے۔ آگے چل کر دسویں آیت کے اختتام پر الفاظ آتے ہیں: ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ ۸﴾ ”جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے“۔ یہ دونوں جملے اسی ترتیب سے سورۃ التغابن میں بھی آئے ہیں۔ بصارت اور خبر کے متعلق ہمارا عمومی تصور یہ ہے کہ بصارت یقین کا آخری درجہ ہے‘ جب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو گویا یقین کا آخری درجہ حاصل ہو گیا‘ لیکن قرآن مجید میں جو ترتیب آتی ہے اس میں ”بصیر“ کو ”خبیر“ سے مقدم کیا گیا ہے۔ یعنی پہلے صفت بصارت کا ذکر آتا ہے‘ بعد میں صفت خبر کا۔ اس لیے کہ خبر اصل شے ہے‘ کیونکہ آنکھ بھی دھوکہ دے سکتی ہے ع

ہر چہ می بینم بہ بیداری ست یا رب یا بخواب؟

آدمی بعض اوقات شش و پنج میں پڑ جاتا ہے کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں واقعتاً صحیح دیکھ رہا ہوں؟ کچھ illusions بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ اصل خبر وہ ہے جو انسان کے باطن کے اندر پہنچ جائے۔ بہرحال خبر کی طرح بصارت بھی اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم کا بہت بڑا مظہر ہے۔

حکومتِ الٰہیہ کے ضمن میں اہل ایمان کی ذمہ داری

پھر فرمایا: ﴿لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ﴾ ”اسی کے لیے زمین و آسمان کی بادشاہی ہے“۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے ضمن میں جو بھی بڑے بڑے مسائل ہیں‘ جو بھی فلسفیانہ مشکلات ہیں اور جو بھی مغالطے ہیں وہ سب ان چھ آیات میں حل کیے گئے ہیں۔ ان چھ آیات میں دو مرتبہ یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ﴾ اس سے اندازہ ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے تصور کو قرآن مجید کتنا emphasize کرنا چاہتا ہے۔ سارا فساد تو اسی کا ہے کہ انسان خود حاکم بن کر بیٹھ گیا ہے اور اسی کا نام بغاوت ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین کی حکومت اللہ کی ہے اور زمین پر اس حکومت کو بالفعل قائم کرنے کی جدوجہد میں اپنا تن من دھن لگا دینا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ماننے والوں کا فرضِ منصبی ہے۔ چنانچہ ان چھ آیات کے بعد جب مطالبات آئیں گے تو اہل ایمان سے انفاقِ مال اور بذلِ نفس کا مطالبہ کیا جائے گا:

﴿اٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَاَنۡفِقُوۡا مِمَّا جَعَلَكُمۡ مُّسۡتَخۡلَفِيۡنَ فِيۡهِ﴾

”ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور خرچ کرو ان چیزوں میں سے جن پر اس نے تم کو خلیفہ بنایا ہے“۔

اللہ کی راہ میں لگا دو‘ کھپا دو اور خرچ کر دو ان تمام چیزوں میں سے جن پر ہم نے تم کو اختیار دیا ہے‘ تمہیں استخلاف عطا کیا ہے۔ لیکن یہ انفاق‘ لگانا‘ کھپانا‘ خرچ کرنا‘ جان کا کھپانا‘ مال کا خرچ کرنا‘ اپنی صلاحیتیں‘ اپنی ذہانت‘ اپنے اوقات لگا دینا‘ اپنے آپ کو ہمہ تن کھپا دینا کس لیے؟ تاکہ اللہ کا حق بحال (restore) کرایا جائے۔ اس کی حکومت کے اندر بغاوت ہو گئی ہے‘ انسان اپنی حاکمیت کے مدعی بن کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ یہ اس زمین کے بادشاہِ حقیقی کے خلاف عالمگیر بغاوت ہے۔ اور اب انسانی حاکمیت (Human Sovereignty) حاکمیت جمہور (Popular Sovereignty) میں تبدیل ہو چکی ہے اور یہ نجاست اب عالمی سطح پر جڑ پکڑ چکی ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿ظَهَرَ الۡفَسَادُ فِى الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ﴾ یہ فساد بر و بحر کے اندر رونما ہو چکا ہے اور اب یہ نجاست ایک نظریہ کے طور پر تمام انسانوں کے اندر تقسیم کر دی گئی ہے۔ پہلے ایک شخص فرعون یا نمرود کی صورت میں حاکمیت کا دعویٰ کرتا تھا کہ ’’اَنَا رَبُّكُمُ الۡاَعۡلٰى‘‘ مگر

آج وہ ٹنوں گندگی تولہ تولہ ماشہ ماشہ عام آدمی کو بھی پہنچا دی گئی ہے۔ یہ ہے اصل گمراہی‘ اصل بغاوت اور اصل فساد۔ اور جو اللہ کا وفادار ہے اس کا فرضِ عین قرار پاتا ہے کہ اس بغاوت کا قلع قمع کرے اور اللہ کا حق اس کو لوٹائے‘ تاکہ زمین پر اللہ کی حاکمیت بالفعل قائم ہو جائے۔

فیصلے کا اختیار اللہ کا!

اس سورۂ مبارکہ کی دوسری آیت میں ﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ کے بعد ارشاد ہوا تھا: ﴿يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ ”زندگی اور موت اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے“۔ اس لیے کہ حکومت کے ساتھ ایک لازمی تصور قدرت و اختیار کا ہے۔ وہ حکومت ہی کیا جو مجرموں کو سزا نہ دے سکے اور وفاداروں کو بدلہ نہ دے سکے‘ انہیں کوئی انعامات نہ دے سکے! اگر کسی حکومت کو جزا و سزا کا اختیار نہیں اور وہ معاملات کا فیصلہ کرنے کے قابل نہیں تو وہ حکومت ہی نہیں ہے۔ لہٰذا یہاں اس پہلو کو نمایاں کیا گیا: ﴿وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ﴾ ”اور تمام معاملات (فیصلے کے لیے) بالآخر اسی کی طرف لوٹا دیے جائیں گے“۔ اُس کے حضور میں پیش کر دیے جائیں گے۔ آخری فیصلے وہاں ہوں گے۔ اس روز یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ وہ ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ (جزا و سزا کے دن کا مالک) ہے۔ اس روز آنکھوں پر پڑے پردے ہٹ جائیں گے۔ اس روز کہا جائے گا: ﴿فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ﴾ (قٓ) ”آج ہم نے تمہاری آنکھوں سے پردہ ہٹا دیا ہے اور آج تمہاری نگاہ خوب تیز ہے“۔ دیکھ لو آج کے دن کس کے لیے بادشاہی ہے؟ تم دنیا میں اپنی بادشاہی کے دعوے دار تھے۔ ﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۭ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ (المؤمن) آج کے دن بادشاہی صرف اس اللہ کے لیے ہے جو الواحد اور القہار ہے۔ تو یہاں فرمایا گیا: ﴿وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ﴾ ”اور تمام معاملات فیصلے کے لیے اسی کی طرف لوٹا دیے جائیں گے“۔ تُرْجَعُ فعل مجہول ہے۔ یہاں تَرْجِعُ نہیں ہے‘ یعنی خواہی نخواہی تمام معاملات اس کے حضور پیش کر دیے جائیں گے‘ تم چاہو یا نہ چاہو تمام معاملات اللہ کی طرف لوٹا دیے جائیں گے اور آخری فیصلے کے لیے اسی کی عدالت میں پیشی ہو گی۔

گردشِ لیل و نہار میں انسان کے لیے سامانِ معرفت

﴿يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ﴾ ”وہ داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں“۔ یہ قرآن مجید کی ایک صنعت لفظی ہے کہ ایک ہی مادے سے بننے والے الفاظ کا استعمال قریب قریب ملتا ہے۔ اسی کی ایک مثال یہاں ہے۔ چنانچہ ابھی ہم نے پڑھا: ﴿يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ﴾ ”وہ جانتا ہے جو زمین میں داخل ہوتا ہے“۔ وَلَجَ ‘ يَلِجُ ثلاثی مجرد سے ہے۔ اسی مادے سے باب افعال میں اَوْلَجَ ‘ يُوْلِجُ اِيْلَاجًا ہے۔ یعنی کسی شے کو کسی میں داخل کرنا۔ فرمایا: ﴿يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ﴾ ”وہ داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں“۔ اس کا اصل مفہوم سمجھئے۔ یہ مضمون بھی دراصل دوسری مرتبہ آ گیا ہے۔ پہلے ہم نے پڑھا: ﴿يُحْيٖ وَيُمِيْتُ﴾ ”وہی مارتا ہے اور زندہ کرتا ہے“۔ اگر ہم کہیں ”نَمُوْتُ وَنَحْيَا“ کہ ہم خود زندہ رہتے ہیں‘ خود مرتے ہیں تو یہ کفر ہے‘ محجوبیت ہے‘ غفلت ہے۔ گویا کہ اللہ سے بُعد ہے۔ یہ یقین کہ اللہ زندہ رکھتا ہے‘ اللہ ہی مارتا ہے‘ یہی معرفت‘ ہدایت اور ایمان ہے۔ سائنس کے زیر اثر ہماری سوچ یہ بن گئی ہے کہ رات اور دن ایک دوسرے کے پیچھے آ رہے ہیں۔ گویا کہ خود بخود آ رہے ہیں۔ چنانچہ ہم سمجھتے ہیں کہ کائنات کا نظام خود بخود چل رہا ہے۔ بنانے والے نے ابتدائے آفرینش میں کچھ قوانین بنا دیے تھے‘ جن کے زیر اثر اب یہ نظام خود بخود چل رہا ہے۔ اس تصور کی نفی کرتے ہوئے فرمایا گیا: ﴿يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ﴾ ”وہ داخل کرتا ہے رات کو دن میں“ ﴿وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ﴾ ”اور وہ داخل کرتا ہے دن کو رات میں“۔ اس نے زمین‘ سورج اور چاند کی گردش کا پورا نظام قائم کیا جس کے نتیجے میں دن رات ایک دوسرے کے پیچھے آتے ہیں۔

فرض کیجیے اگر سورج ایک جگہ کھڑا رہتا تو ہر چیز روشن ہوتی، لیکن شاید انسان کو یہ معلوم نہ ہوسکتا کہ روشنی سورج سے آ رہی ہے۔ اس لیے کہ ہر چہار طرف روشنی سے یہ مغالطہ ہوسکتا تھا کہ ہر شے از خود روشن ہے۔ یہ تو سورج حرکت کرتا ہے اور سایہ اس کے ساتھ گھٹتا بڑھتا ہے تو ہمیں معلوم ہو رہا ہے کہ روشنی اصل میں سورج کی ہے۔ جب سورج غروب ہوجاتا ہے اور روشنی ختم ہو جاتی ہے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ روشنی دراصل سورج کی روشنی ہے۔ یہی معاملہ ان چیزوں کا ہے جو بظاہر خود بخود ہو رہی ہیں۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ ہم کھانا کھاتے ہیں تو بھوک مٹ جاتی ہے۔ بھوک سے کمزوری محسوس ہو رہی تھی، کھانے سے توانائی آ گئی، ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اس کھانے میں یہ تاثیر ہے کہ اس سے جسم میں قوت آ جاتی ہے۔ اسی طرح پانی پیاس ختم کرتا ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ یہ پانی کی تاثیر ہے کہ پیاس بجھ جاتی ہے۔ اب اللہ ہمارے ذہن سے نکل گیا اور ہم اللہ سے محجوب ہوگئے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ امام رازیؒ نے بڑی پیاری بات کہی ہے کہ جو عقولِ اعلیٰ یعنی بلند سطح کی عقول کے حامل لوگ ہیں، جن کو حقائق مستحضر رہتے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ:

مَا رَاَیْتُ شَیْئًا قَطُّ وَقَدْ رَاَیْتُ اللّٰہَ قَبْلَہٗ

''میں جس شے کو بھی دیکھتا ہوں مجھے اس سے پہلے اللہ نظر آتا ہے''۔

اور جو عقولِ متوسطہ کے حامل ہیں وہ یہ کہتے ہیں:

مَا رَاَیْتُ شَیْئًا قَطُّ وَقَدْ رَاَیْتُ اللّٰہَ مَعَہٗ

''میں نے جب بھی کسی شے کو دیکھا، مجھے اس کے ساتھ ہی اللہ نظر آیا۔''

اور ایک قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں جن کی عقول ادنیٰ درجے کی ہوتی ہیں، وہ کہتے ہیں کہ

مَا رَاَیْتُ شَیْئًا قَطُّ وَقَدْ رَاَیْتُ اللّٰہَ بَعْدَہٗ

''جب بھی میں نے کسی شے کو دیکھا تو اس کے بعد مجھے اللہ نظر آیا''۔

کسی شے کو دیکھنے کے بعد اللہ یاد آ جائے تو یہ گویا معرفت کی سب سے نچلی شکل ہے، لیکن اللہ کی تخلیق کو دیکھتے رہیں اور اللہ نظر ہی نہ آئے تو یہ محجوبیت ہے، گمراہی ہے، یہ اللہ سے اوٹ میں ہو جانا ہے۔ سورۃ المطففین میں فرمایا:

﴿کَلَّآ اِنَّھُمْ عَنْ رَّبِّھِمْ یَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ○﴾

''بے شک یہ لوگ اُس روز اپنے پروردگار کے دیدار سے اوٹ میں ہوں گے''۔

قیامت کے دن وہ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے دیدار سے محجوب رہ جائیں گے، محروم کر دیے جائیں گے، اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا مشاہدہ نہ کر پائیں گے، جس طرح اس وقت دنیا میں محجوب ہیں۔ وہ اشیاء کو دیکھ رہے ہیں لیکن اللہ کو نہیں دیکھ رہے ہیں، جبکہ حقیقت میں جس کے دل میں اللہ موجود ہے، معرفت کے کسی درجے میں اسے ایمان باللہ حاصل ہے، اسے اللہ ہر جگہ، ہر آن، ہر لحظہ نظر آتا ہے۔ چنانچہ ایک بندۂ مؤمن اللہ کا یہ تصور رکھتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے از خود نہیں ہو رہا، میرے اللہ کے کرنے سے ہو رہا ہے۔ یہ اُس کا فیصلہ ہے ع ''ہر چہ ساقیٔ ما ریخت عین الطاف است!'' میرے اللہ نے جو کچھ میری جھولی میں ڈال دیا ہے یہ اس کا لطف و کرم ہے، اس کی عطا ہے، اس کی دین ہے، اور اس میں یقیناً خیر ہی خیر ہے۔

اب دیکھئے کہ ﴿یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّھَارِ وَیُوْلِجُ النَّھَارَ فِی الَّیْلِ﴾ کا مفہوم کیا ہے! ''وہ پروتا ہے رات کو دن میں اور پروتا ہے دن کو رات میں''۔ رات کو دن میں اور دن کو رات میں پرونے کا مفہوم سمجھ لیجیے۔ ایک تصور تو یہ ہے کہ جیسے ایک دھاگے میں تسبیح کے دانے پروئے ہوئے ہیں اور ایک ایک دانہ گر رہا ہے۔ سیاہ دانہ گرا تو یہ رات ہے اور سفید دانہ گرا تو یہ دن ہے۔ گویا ع ''میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ!'' اور ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ کبھی دن بڑھتا ہے، رات گھٹتی ہے تو گویا دن رات میں داخل ہو رہا ہے اور کبھی دن گھٹتا ہے اور رات بڑھتی ہے تو گویا رات دن میں داخل ہو رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم کا جامع بیان

آیت کے آخری الفاظ ہیں: ﴿وَھُوَ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ○﴾ ''اور وہ سینوں کے پوشیدہ راز تک جانتا ہے''۔ جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے وہ اس کا جاننے والا ہے۔

سورۃ الحدید کی یہ چھ آیات اللہ تعالیٰ کے اسماءِ صفات اور اس کی معرفت کے بیان میں بہت اہم ہیں۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم نہایت جامعیت کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ سب سے پہلے فرمایا:

﴿ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴾

''اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے''۔

پھر اگلی آیت میں اس وضاحت کے بعد کہ وہ صرف کلیات ہی کا عالم نہیں' جزئیات سے بھی پوری طرح واقف ہے' فرمایا:

﴿ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴾

''اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے''۔

اور اب یہاں فرمایا کہ یہی نہیں' بلکہ:

﴿ وَهُوَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴾

''وہ تو اسے بھی جانتا ہے جو تمہارے سینوں میں مخفی ہے''۔

اور آیت ۱۰ کے آخر میں آئے گا:

﴿ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴾

''اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے''۔

اس طرح اس سورۂ مبارکہ کے آغاز میں علم خداوندی کا ذکر کتنے مختلف اسالیب اور کتنے مختلف dimensions سے کیا گیا ہے۔

سورۂ تغابن میں اللہ تعالیٰ کے علم کو تین اسلوبوں سے ایک ہی آیت میں بیان کیا گیا ہے: ﴿يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ''وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے'' ﴿وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ﴾ ''اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو''۔ ﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ ''اور اللہ تعالیٰ اس کو بھی جانتا ہے جو سینوں میں پوشیدہ ہے''۔ وہ دلوں کا حال تک جانتا ہے' وہ علیمٌ بذاتِ الصُّدور ہے۔

آخری بات یہ نوٹ کیجیے کہ سلسلۂ مُسَبِّحات میں سے اوّلین سورۃ الحدید ہے' جسے ''اُمّ الْمُسَبِّحات'' کا درجہ حاصل ہے' جبکہ مُسبِّحات میں سے آخری سورۂ تغابن ہے' جس کا مطالعہ ہم کر چکے ہیں۔ سورۂ تغابن کا عنوان ہی ''ایمان اور اس کے ثمرات و مضمرات'' ہے۔ سورۃ الحدید کے جو مضامین ہم پڑھ چکے ہیں ان میں سے بعض مضامین وہاں تکرار کے ساتھ آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے علم' قدرت اور حکومت' تینوں کا وہاں ذکر ہے۔ البتہ فلسفیانہ مضامین صرف یہیں ہیں:

﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾

اور:

﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾

یہ درحقیقت فلسفۂ وجود کی سطح پر معرفت خداوندی کی بلند ترین منزل ہے اور یہ بحث قرآن مجید میں صرف اسی مقام پر آئی ہے۔

اسماءِ باری تعالیٰ کے درمیان حرفِ عطف کا مسئلہ

میں اگرچہ اپنے طور پر تو فیصلہ کر چکا تھا کہ سورۃ الحدید کے حصہ اوّل پر' جو چھ آیات پر مشتمل ہے' ہماری گفتگو اب مکمل ہوگئی ہے اور اب ہمیں آگے بڑھنا ہے۔ لیکن گزشتہ درس کے بارے میں مجھ سے ایک استفسار کیا گیا ہے جس سے نشان دہی ہوئی ہے کہ میری گفتگو میں ایک خلا رہ گیا ہے جسے پُر ہونا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ وحدت الوجود کے ضمن میں اب تک ہونے والی گفتگو کے بارے میں مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ شاید میرا ذاتی موقف پورے طور پر واضح نہیں ہو سکا اور عین ممکن ہے کہ زندگی میں آخری مرتبہ ان آیات پر گفتگو ہو رہی ہو' لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ وحدت الوجود کے بارے میں اپنا ذاتی موقف بھی پوری طرح وضاحت سے بیان کر دوں' مبادا کوئی مغالطہ باقی رہے اور غلط فہمی پیدا ہو جائے۔ جن حضرات پر یہ بحث کچھ گراں گزر رہی ہو اُن سے میں معذرت خواہ ہوں۔ متذکرہ بالا دو اسباب کی بنا پر ہمیں ابھی اپنے سابقہ موضوع کو جاری رکھنا ہے۔

میں نے یہ کہا تھا کہ قرآن مجید میں صرف یہ ایک مقام ہے ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ

وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ﴾ جہاں اللہ تعالیٰ کے اسماء کے مابین حرف عطف آیا ہے۔ اور نحو کا قاعدہ یہ ہے کہ معطوف اور معطوف الیہ میں مغائرت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں اسی سلسلۂ سُوَر میں سورۃ الحشر کے آخر میں جو آیت مبارکہ وارد ہوئی ہے وہاں تسلسل کے ساتھ اللہ کے آٹھ اسماء آئے ہیں' لیکن ان کے درمیان کہیں کوئی حرف عطف نہیں ہے۔ ﴿اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ ط﴾ جبکہ یہ واحد مقام ہے جہاں حرف عطف آیا ہے۔ اس ضمن میں مجھ سے سوال کیا گیا ہے کہ اس مقام پر اسماء باری تعالیٰ کے درمیان حرفِ عطف کیوں آیا ہے؟ چنانچہ اس ضمن میں وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا' اوّل' آخر' ظاہر اور باطن یہ چاروں اسماء ایسے ہیں جو کسی نسبت اضافی کا تقاضا کرتے ہیں۔ جیسے اَوَّلُهٗ' آخِرُهٗ' ظَاهِرُهٗ' بَاطِنُهٗ۔ میں نے مثال دی تھی کہ حضورﷺ نے شعبان کے آخری دن ایک خطبہ ارشاد فرمایا تھا جس میں رمضان المبارک کی عظمت کا بیان ہے۔ اس کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے: ((اَوَّلُهٗ رَحْمَةٌ وَاَوْسَطُهٗ مَغْفِرَةٌ وَآخِرُهٗ عِتْقٌ مِنَ النَّارِ)) ''اس (ماہِ مبارک) کا پہلا حصہ (عشرہ) رحمت ہے' دوسرا حصہ مغفرت ہے اور آخری (عشرہ) آگ سے نجات ہے''۔ اسی طرح ظاہر و باطن کے لیے اسی سورۃ کے دوسرے رکوع میں الفاظ آئے ہیں: ﴿فَضُرِبَ بَیْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ط بَاطِنُهٗ فِیْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ﴾ یہاں باطن کی اضافت بھی ''هٗ'' کی طرف ہے اور ظاہر کی اضافت بھی ''هٗ'' کی طرف ہے۔ تو درحقیقت زیر نظر آیت میں مراد یہ ہے کہ اس سلسلۂ کون و مکان' اس سلسلۂ تخلیق کا اوّل بھی اللہ ہے' آخر بھی اللہ ہے' اس کا ظاہر بھی اللہ ہے اور باطن بھی اللہ ہے۔

یہاں یہ بات سمجھ میں آجانی چاہیے کہ اوّل و آخر میں تو لازماً مغائرت ہوگی۔ اگر درمیان میں کوئی فصل ہے' کوئی زمانی بُعد ہے تو اَوَّلُهٗ وَاٰخِرُهٗ ایک وقت میں نہیں ہو سکتے۔ خود ان الفاظ کا تقاضا ہے کہ ان میں لازماً مغائرت ہونی چاہیے۔ یوں سمجھئے کہ ایک وقت تھا کہ صرف ذاتِ باری تعالیٰ تھی' کائنات نہیں تھی۔ پھر کائنات کو وجود بخشا گیا تو اس کا اوّل یعنی نقطۂ آغاز اللہ ہے' جہاں سے یہ کائنات شروع ہو رہی ہے۔ اس کے بعد پھر ایک وقت آئے گا کہ صرف اللہ کی ذات ہوگی' کائنات نہیں ہوگی۔ گویا کہ یہ اس کا آخر یا نقطۂ اختتام ہے۔ چنانچہ اس کائنات کا اوّل و آخر ذاتِ باری تعالیٰ ہے' درمیان میں یہ کائنات ہے۔ اور اس کائنات میں ظاہر و باطن کی dimensions پیدا ہوئیں تاکہ احاطہ ہو جائے کہ وہی وہ ہے۔ ظاہر و باطن تو یقیناً بیک وقت (simultaneous) ہیں' ان میں مغائرت نہیں ہو سکتی۔ کسی شے کا ظاہر و باطن تو ساتھ ہی ہوں گے۔ پہلے دو اسماء مغائرت اور فصل کے متقاضی ہیں اس لیے ان کے درمیان حرفِ عطف آ گیا' اسی مناسبت سے پھر پوری آیت کے اندر حرفِ عطف لایا گیا۔ اس سے یہ بات اور واضح ہو جاتی ہے کہ درحقیقت اس آیۂ مبارکہ کا موضوع حقیقت وجود ہے۔

''وحدت الوجود'' کے بارے میں میرا موقف

اب آئیے اس بات کی طرف کہ وحدت الوجود کے بارے میں میرا کیا موقف ہے۔ اس ضمن میں پہلی بات یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ سن ۵۶۔۱۹۵۵ء میں' جبکہ میری عمر تینتیس' چونتیس برس تھی' میں اس مسئلے پر اپنا غور و فکر مکمل کر کے ایک حتمی رائے تک پہنچ چکا تھا' اور وہ حتمی رائے اُس وقت میرے ذہن میں کس انداز سے آئی تھی' اسے میں بیان کر رہا ہوں۔ جہاں تک ہمارے دین کی عملی حیثیت کا تعلق ہے اسے ہم شریعت اور طریقت سے تعبیر کرتے ہیں۔ شریعت اس دین کے عمل کا ظاہری پہلو ہے اور طریقت اسی کا باطنی پہلو ہے۔ شریعت (فقہ) بحث کرے گی کہ نماز کے ارکان کیا ہیں' اوقات کیا ہیں' مختلف نمازوں کی رکعتیں کتنی ہیں' ہر رکعت میں ارکان کیا ہیں اور ان کی ترتیب کیا ہے' وغیرہ' جبکہ اسی نماز کا جو ایک باطنی پہلو مطلوب ہے کہ خشوع و خضوع ہو' حضورِ قلب ہو' انسان ہمہ تن متوجہ ہو' اپنی پوری شخصیت کے ساتھ اللہ کے سامنے جھکا ہوا کھڑا ہو' رکوع یا سجدہ میں ہے تو بھی پوری شخصیت جھک گئی ہو' یہ طریقت کا موضوع ہے۔ تو یہ جو دین کے عملی پہلو ہیں شریعت اور طریقت (یا ظاہر و باطن) ان دونوں کا تعلق یا ''ہمہ از

اوست'' سے ہے یا ''ہمہ با اوست'' سے ہے۔ یعنی ان دونوں پہلوؤں کا تعلق یا تو اس سے ہے کہ سب کائنات اللہ کی ذات سے ہے' یا یہ کہ یہ سب سلسلۂ کون ومکان اللہ کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔ ''ہمہ از اوست'' اور ''ہمہ با اوست'' کے مابین جو فرق ہے وہ میں بعد میں بیان کروں گا۔ ان کو اس درجہ میں سمجھ لیجیے کہ شریعت کا اوّلین درجہ ہے لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ یعنی لاَ مَعْبُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ۔ یہاں معبود کو اس کے جامع مفہوم میں لیجیے کہ مطاعِ مطلق اللہ ہے' حاکم اللہ ہے' اسی کا حکم ماننا ہے اور درحقیقت رسول کا حکم بھی اسی کا حکم ہے' اُس کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کرنی ہے' اس کے بتائے ہوئے حلال و حرام پر قائم رہنا ہے' اُسی سے ڈرنا ہے' اُسی سے سوال کرنا ہے' اُمید اُسی سے رکھنی ہے۔ پھر یہ کہ رازق وہی ہے۔ اسی طرح حاجت روا ومشکل کشا وہی ہے۔ یہ دین کا بالکل بنیادی تصور ہے۔ تو گویا پہلا قدم ''لاَ معبودَ الاَّ اللّٰہ'' ہے۔

اس سے اگلا قدم یہ ہے کہ لَا مَقْصُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ' لَا مَطْلُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ' لَامَحْبُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ۔ یعنی انسان کی زندگی میں مقصود ومطلوب کی حیثیت صرف اللہ کو حاصل ہو جائے' اس کا نصب العین صرف اللہ کی ذات ہو' محبوبِ حقیقی صرف اللہ ہو' باقی ساری محبتیں اس کی محبت کے تابع ہو گئی ہوں۔ یہ طریقت کی آخری منزل ہے۔ یہ وہ باطنی کیفیت ہے جو مطلوب ہے۔ ﴿اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَالسَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا﴾ کے مصداق انسان یکسو ہو کر اللہ کی ذات کی طرف متوجہ ہو گیا ہو' وہی اس کا مطلوب ومقصود اور وہی اس کا محبوب حقیقی بن گیا ہو۔ ان دونوں کا تعلق یا ہمہ از اوست سے ہے یا ہمہ با اوست سے۔ لیکن جو حقیقت ہے وہ ہمہ اوست کی وہ تعبیر ہے جو شیخ ابن عربی نے کی ہے' یعنی وحدت الوجود۔ ہمہ اوست اور وحدت الوجود کے درمیان ایک باریک فرق ہے جو اگر ملحوظ نہ رہے تو بڑا خطرہ ہے ع ''ہشدار کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را!'' ذرا سی اگر بے احتیاطی ہو جائے تو انسان کفر اور شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ راستہ بہت خطرناک ہے۔ اور ویسے بھی اوّل تو اس حد تک رسائی بہت کم لوگوں کی ہوتی ہے' پھر اگر کوئی پہنچ بھی جائے تو اسے یہ احساس ہضم کرنا بہت مشکل ہے۔ مجھے سلطان باہو کا وہ مصرعہ یاد آ رہا ہے کہ ع ''جان پھلن تے آئی ہُو!'' واقعہ یہ ہے کہ جب انسان کو وحدت الوجود کا احساس ہوتا ہے تو وہ اپنے اندر ایک ایسی کیفیت محسوس کرتا ہے کہ اس کو ضبط میں لے آنا اور اپنی شخصیت کو اپنے مقام پر برقرار رکھنا آسان کام نہیں ہے۔ پھر یا تو وہ ہو گا جو منصور الحلاج اور سرمد کے ساتھ ہوا تھا' کہ انہوں نے ''انا الحق'' کا نعرہ لگا دیا' یا ایک اور بڑی پیاری کیفیت ہے جس کا شیخ سعدی نے بڑے خوبصورت الفاظ میں ذکر کیا ہے کہ ع

آن را کہ خبر شد خبرش بعد نیامد!

کہ ''جو شخص یہاں تک پہنچ گیا پھر اس کی خبر نہیں ملتی۔'' یعنی پھر وہ خاموش ہو جائے گا' کیونکہ زبان کھولنے میں خطرہ ہے' اندیشہ ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ جب یہ چیزیں کچھ شعراء کے ذریعے سے' خاص طور پر حافظؔ کے ذریعے سے عوام الناس میں آ گئیں تو اس سے بڑے خطرناک نتائج برآمد ہوئے اور دین وشریعت کی اہمیت ختم ہو کر رہ گئی۔ پھر ''مسجد مندر ہکڑ و نور'' کا فلسفہ پیش کیا گیا اور وحدتِ ادیان کا باطل نظریہ وجود میں آیا۔ اسی فتنہ کے سدباب کے لیے اور اس کا رُخ موڑنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے شیخ احمد سرہندیؒ کو کھڑا کیا' جن کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا ہے ؎

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار!

اُس وقت برعظیم پاک و ہند میں ملت اسلامیہ اور اُمت محمدؐ کا تشخص ختم ہو رہا تھا۔ اور یہ سب کچھ درحقیقت ہمہ اوست اور وحدت الوجود کے مابین باریک فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کے باعث اور ان کا عوام کی سطح پر اشعار کے ذریعے سے آ جانے کے باعث ہوا' جس کے خلاف شیخ احمد سرہندیؒ نے علمِ جہاد بلند کیا۔ یہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے ساتھ علامہ اقبال کو بہت سے اعتبارات سے خصوصی نسبت حاصل ہے۔ علامہ اقبال نے بھی برعظیم میں مسلم قومیت کے تشخص کو واضح کیا اور واقعہ یہ ہے کہ اگر ان کا فکر وفلسفہ اور ان کی عظیم شخصیت نہ ہوتی تو بیسویں صدی کے آغاز میں

وحدتِ ادیان کا جو فلسفہ گاندھی کے ذریعہ بہت شد و مد کے ساتھ آیا تھا اس کے آگے بند باندھنا ممکن نہ رہتا۔ اور تو اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسی نابغہ شخصیت بھی اس رو میں بہہ گئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس برعظیم پاک و ہند میں اُس وقت پھر وہی صورت حال پیدا ہو رہی تھی جو تین سو برس پہلے ہوئی تھی کہ جب ''دینِ الٰہی'' کی شکل میں ایک نیا دین گھڑ لیا گیا تھا اور دینِ محمدیؐ کے خاتمہ کا خدشہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس بار اس فتنے کا مقابلہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے علامہ اقبال کو اٹھایا۔ آپ ایک مفکر اور فلسفی تھے' ان کی بات میں وزن تھا' ان کا انداز لوگوں کے دل کو بھانے والا تھا۔ پھر وہی شخص تھا جو پنڈت نہرو سے بھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا تھا۔ ختم نبوت پر ان کی نہرو کے ساتھ بڑی مدلل و مفصل خط و کتابت ہوئی۔ ظاہر ہے کوئی عالم دین تو پنڈت نہرو کے ساتھ بحث و تکرار نہیں کر سکتا تھا۔ علماء کرام ختم نبوت پر قرآن و حدیث سے تو دلائل دے سکتے تھے' لیکن اس کی فلسفیانہ بحث علامہ اقبال کے سوا کسی نے نہیں کی۔ علامہ اقبال شروع میں حافظؔ کے شدید دشمن رہے اور اس فلسفے کی انہوں نے بڑی شدت کے ساتھ نفی کی۔

''سورج مکھی کے پھول بن جاؤ!''

جیسا کہ میں نے عرض کیا' اُس زمانے (۵۶۔۱۹۵۵ء) میں مَیں اس نتیجہ پر پہنچ گیا تھا کہ طریقت اور شریعت دونوں کا تعلق ''ہمہ از اوست'' یا ''ہمہ با اوست'' سے ہے' جب کہ حقیقت ''وحدت الوجود'' ہے جو ''ہمہ اوست'' ہی کی ایک محتاط تعبیر ہے۔ اُس زمانے میں ایک تشبیہہ یا تمثیل بھی میرے ذہن میں آئی تھی کہ ''سورج مکھی کے پھول بن جاؤ!'' اس کی میں وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے کیا مراد ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ سائنس کے نظریات میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن میں جس زمانے کی بات کر رہا ہوں اُس وقت یہ خیال بہت غالب تھا کہ ہماری یہ زمین درحقیقت سورج کا ایک ٹوٹا ہوا ٹکڑا ہے اور دوسرے سیارے جو سورج کے گرد گردش کر رہے ہیں وہ بھی سورج ہی کے ٹکڑے ہیں۔ چنانچہ جس طرح سورج اپنے محور کے گرد حرکت کر رہا ہے اسی momentum کا نتیجہ ہے کہ اس سے ٹوٹنے والے ٹکڑے بھی اس کے گرد چکر لگانے لگے۔ تو گویا یوں سمجھئے کہ ابتدا میں ہماری زمین بھی آگ کا ایک بہت بڑا کُرہ تھی' پھر یہ ٹھنڈا ہونا شروع ہوئی۔ اس کے ٹھنڈا ہونے کے دو نتیجے نکلے۔ ایک یہ کہ اس سے بخارات نکلے جو اوپر گئے تو انہوں نے فضا (کُرۂ ہوائی) کی صورت اختیار کی۔ دوسرے یہ کہ ٹھنڈا ہونے کی وجہ سے خود زمین سکڑ گئی' جس کے نتیجے میں اس کی سطح پر کہیں بلندیاں پیدا ہو گئیں اور کہیں گہرے غار وجود میں آ گئے۔ فضا کا غلاف ہماری زمین کے گرد تیس پینتیس میل ہے۔ فضا میں جمع ہونے والی گیسوں کے نتیجہ میں بارش ہوئی اور نہ معلوم کتنے عرصہ تک بارش ہی ہوتی رہی' جس سے نشیبی علاقوں میں پانی جمع ہو گیا اور اس طرح سمندر وجود میں آئے۔ جو علاقے اونچے تھے وہ خشکی قرار پائے۔ پھر جہاں یہ برّ و بحر آپس میں جڑے ہوئے تھے وہاں دلدلی علاقوں میں حیاتِ ارضی کا آغاز ہوا۔ یہ حیاتِ ارضی دو طرح کی تھی: ا۔ حیاتِ نباتاتی (Plant Kingdom) ۲۔ حیاتِ حیوانی (Animal Kingdom)۔

حقیقت کے اعتبار سے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس زمین پر جو بھی ہے وہ سورج ہی سے ہے (ہمہ از اوست)' یہ سب سورج ہی کا ظہور ہے۔ زمین بھی سورج ہی کا ٹکڑا تھی جو ٹھنڈا ہوا' پھر اسی میں سے gases نکلی تھیں' خارج سے تو کوئی شے نہیں آئی۔ ہوا بھی وہیں سے ہے' خشکی بھی وہیں سے ہے اور سمندر بھی وہیں سے ہیں۔ پھر وہیں کے امتزاج (interaction) سے اس دلدلی علاقے میں حیاتِ نباتاتی اور حیاتِ حیوانی کا آغاز ہوا۔ گویا زمین پر جو کچھ ہے اس کا ماخذ (origin) سورج ہے۔ گویا یہ تو ہوئی حقیقت۔ اصل طریقت اور شریعت کیا ہے؟ وہ سورج مکھی کے پھول کا طرزِ عمل ہے۔ جیسے ہی سورج طلوع ہوتا ہے وہ اپنا رُخ سورج کی طرف کر لیتا ہے' جیسے جیسے سورج گردش کرتا ہے اس کا رخ بدلتا جاتا ہے' جب سورج غروب ہوتا ہے تو پھول بھی مرجھا جاتا ہے۔ اگلی صبح جب سورج طلوع ہوتا ہے تو وہ پھر تر و تازہ ہو جاتا ہے۔ گویا کہ سورج مکھی کے پھول نے اپنے وجود کا مقصد اور اپنا نصب العین یہ مقرر کیا کہ وہ اپنے اصل

مبدأ کی طرف اپنی توجہ مرکوز رکھے۔ یہی طرزِ عمل ایک بندۂ مؤمن سے مطلوب ہے: ﴿اِنِّیۡ وَجَّهۡتُ وَجۡهِیَ لِلَّذِیۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ حَنِیۡفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ﴾ بجائے اس کے کہ سورج مکھی کا پھول اس سوچ بچار میں غلطاں و پیچاں رہے کہ میں کہاں سے آیا ہوں' سورج کا ٹکڑا ہوں' میری زمینی حیات کا آغاز کیسے ہوا' کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ اپنا رخ سورج کی طرف رکھو۔ اسی طرح ہمیں اس فکر میں غلطاں و پیچاں ہونے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم کہاں سے وجود میں آئے ہیں اور کیسے وجود میں آئے ہیں' ہمارے وجود اور ہماری زندگی کا مقصد صرف یہ ہونا چاہیے کہ: ﴿وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ﴾ اور ﴿اِنَّ صَلَاتِیۡ وَنُسُکِیۡ وَمَحۡیَایَ وَمَمَاتِیۡ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ﴾ سورج مکھی کے پھول کی طرح ہمارے دل کی کلی کھلے تو اس سے کہ ہم اللہ کو یاد کر رہے ہیں' اللہ کے حضور میں حاضر ہیں۔ اور اگر کہیں بھی بندۂ مؤمن محسوس کرے کہ غیاب ہو گیا ہے' حضوری نہیں رہی' کوئی بُعد ہو گیا ہے' میری توجہ کسی اور طرف مبذول ہو گئی ہے' میں کچھ غافل ہو گیا ہوں تو فوراً اس پر پچھتاوے کی کیفیت طاری ہو اور وہ پھر اپنا رخ اسی کی طرف کر لے' جیسے سورج مکھی کا معاملہ ہے کہ سورج طلوع ہوتے ہی وہ کھل اٹھتا ہے اور پورا دن جدھر سورج جاتا ہے ادھر ہی وہ ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا ہے' اور جب سورج غروب ہوتا ہے تو وہ بھی بجھ کر رہ جاتا ہے۔ یہ ہے اصل میں حقیقت' طریقت اور شریعت۔ حقیقت تو یہی ہے کہ سورج مکھی بھی سورج سے نکلی ہوئی ایک شے ہے' لیکن ہماری توجہ اصلاً طریقت اور شریعت پر مرکوز ہونی چاہیے۔

وحدت الوجود' مجدّد الفِ ثانی اور علاّمہ اقبال

آج میں یہ بھی عرض کر دوں کہ لاہور منتقل ہونے کے بعد ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۱ء تک قریباً چھ سال مجھے پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا بڑا وافر اور مسلسل موقع ملا ہے۔ میرا کلینک کرشن نگر میں تھا جو اَب اسلام پورہ کہلاتا ہے۔ چشتی صاحب روزانہ شام کو میرے پاس آ جاتے تھے اور ان سے میرا تبادلۂ خیالات ہوتا تھا۔ اس طرح میں نے دس بارہ سال قبل جو پختہ رائے قائم کر لی تھی' اس میں مجھے نہ صرف پختگی حاصل ہوئی بلکہ اس خاکے میں رنگ بھرا گیا۔ اس ضمن میں مَیں ان کا احسان مند ہوں۔ اُس وقت تک میں نے نہ تو شیخ احمد سرہندی کی مکتوبات کا مطالعہ کیا تھا نہ علامہ اقبال کے فارسی کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا' لہٰذا یہ حقیقت مجھے درحقیقت ان کے ذریعے ہی معلوم ہوئی کہ شیخ احمد سرہندیؒ بھی اپنی زندگی کے آخری دَور میں وحدت الوجود کے قائل ہو گئے تھے۔ اس پر انہوں نے کلامِ اقبال کی شروحات میں بڑی مفصل تحریریں لکھی ہیں اور یہ بات ثابت کی ہے۔ اسی طرح علامہ اقبال نے بھی زندگی کے آخری دَور میں ''لَا مَوۡجُوۡدَ اِلَّا اللّٰهُ'' کا نعرہ بڑے بلند آہنگ کے ساتھ بلند کیا تھا۔ ان کی ایک رباعی ملاحظہ کیجیے جو علامہ نے اپنی وفات سے کل تین ماہ قبل کہی تھی ؎

تو اے ناداں دلِ آگاہ دریاب
بخود مثلِ نیاگاں راہ دریاب
چساں مؤمن کند پوشیدہ را فاش
ز لا موجودَ اِلاّ اللہ دریاب!

''اے غافل! تو ایسا دل حاصل کر جو آگاہ ہو۔ جیسے تمہارے بزرگ خود راستہ تلاش کرتے رہے ہیں (اور غور و فکر کے ذریعے سے حقیقت تک پہنچتے رہے ہیں) اسی طرح تم بھی کوشش کرو (یعنی محض تقلید کی روش اختیار نہ کرو بلکہ تحقیق کا راستہ اختیار کرو۔) جس طرح مؤمن پوشیدہ کو رفتہ رفتہ فاش کرتا ہے تم بھی ''لا موجود الاّ اللہ'' سے حقیقت تک رسائی حاصل کرو۔''

یہ گویا فکرِ انسانی کی آخری منزل ہے۔ تو حضرت مجدد الف ثانیؒ بھی وہیں پہنچے تھے اور علامہ اقبال بھی بالآخر وہیں پہنچے۔ بلکہ علامہ اقبال کے بعض اشعار تو ایسے ہیں کہ تصوف اور ہمہ اوست کا عامیانہ تصور بھی ان کے یہاں موجود ہے۔ لیکن میں اس وقت اس طرف نہیں جانا چاہتا کہ ان کی کیا تاویل کی جائے گی۔ میں نے اِس وقت صرف یہ بتایا ہے کہ سن ۵۶۔۱۹۵۵ء میں میری جو رائے قائم ہو چکی تھی اس کے بعد ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۱ء تک کے عرصہ میں اس میں پختگی پیدا ہوئی۔ اب میں چاہتا ہوں کہ

ذرا اس کی وضاحت کر دوں۔ جہاں تک ''ہمہ از اوست'' کا تعلق ہے یہ تمام مسلمان اہل سنت، متکلمین، ائمہ اور علماء دین کے نزدیک متفق علیہ بات ہے۔ یہ توحید کا کم سے کم تقاضا ہے کہ جو کچھ ہے اللہ سے ہے (ہمہ از اوست) یعنی وہ خود بخود وجود میں نہیں آیا، بلکہ اللہ کا تخلیق کردہ ہے۔ جیسے سورۃ الطّور میں فرمایا گیا: ﴿اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ﴾ ''کیا یہ خود بخود بن گئے (کسی کے بنائے بغیر) یا یہ خود اپنے آپ کو بنانے والے ہیں؟'' ظاہر بات ہے کہ بنانے والا اللہ ہے۔ نہ از خود کوئی بنا ہے اور نہ یہ اپنے آپ کو بنانے والے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ مضمون دو مقامات پر آیا ہے۔ سورۂ لقمان کی آیت ۱۱ میں یہ مضمون بایں الفاظ آیا ہے:

﴿هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ﴾

''یہ سب اللہ کی تخلیق ہے، ذرا بتاؤ کہ اس کے سوا بھی کسی نے کچھ بنایا ہے؟''

''ہمہ از اوست'' تو عقیدۂ توحید کی مبادیات میں سے ہے جس میں کسی کو کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ ''ہمہ با اوست'' کیا ہے؟ یہ اصل میں وہ نظریہ ہے جو فلسفۂ وجود کی پہلی منزل کی نشان دہی کرتا ہے۔

ہمارے اسلاف میں ایک تو علاؤ الدین صمدانیؒ ہیں جنہوں نے سب سے پہلے یہ نظریہ پیش (enunciate) کیا اور پھر یہ زیادہ مشہور مجدد الف ثانیؒ کے نظریہ وحدت الشہود کے نام سے ہوا۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ کائنات اور خالق دونوں کا وجود اپنی اپنی جگہ پر ہے۔ اب ظاہر ہے کہ دونوں کا ساتھ ساتھ تو ثنویت ہے، پھر تو (خالق اور مخلوق) دو وجود ہو گئے! چنانچہ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے ڈاکٹریٹ کا جو تھیسز لکھا تھا: "Mujaddid's Concept of Toaheed" وہ مجھے بہت پسند ہے۔ اکثر لوگوں کی نظروں سے حضرت مجددؒ کا آخری موقف اوجھل ہے، لیکن عام طور پر جو چیز ان کی طرف منسوب ہوتی ہے وہ یہی ثنویت (Dualism) ہے، توحید وجودی نہیں ہے۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے اسے واضح طور پر تسلیم کیا ہے۔ ایک دیانت دارانہ تحقیق کا تقاضا یہی ہے کہ اس کا جو بھی نتیجہ نکل رہا ہے آدمی اسے بیان کرے۔ بہرحال یہ ثنویت ہے اور ایک اعتبار سے اسے شرک فی الوجود کہا گیا ہے۔

''ہمہ اوست'' اور اس کی مختلف تعبیرات

غالبؔ کا ایک شعر ہے۔

جاروبِ لا بیار کہ ایں شرک فی الوجود
با گردِ فرش و سینہ بایواں برابر است

یعنی ہمارا سینہ ایک ایوان کی مانند ہے اور یہ شرک فی الوجود (کہ وجود ہمارا بھی ہے اور اللہ کا بھی) اُس گرد کی مانند ہے جو اس ایوان پر آ گیا ہے۔ چنانچہ ''لا'' کی جھاڑو لاؤ اور اس سے اسے صاف کر دو۔ شرک فی الوجود کا خاتمہ توحید وجودی سے ہوتا ہے، جس کی ایک تعبیر ''ہمہ اوست'' ہے۔ دنیا بھر میں جو چوٹی کے نظریاتی (idealist) فلسفی ہیں وہ اسی کے قائل ہیں۔ ان کا نقطۂ آغاز افلاطون ہے۔ حکیم فلاطینوس کا تعلق سکندریہ (مصر) سے تھا جس کے نظریات ہمارے مسلمانوں کے تصوف میں سرایت کر گئے۔ اسی طرح ابن عربی اندلس سے متعلق تھے۔ اس ضمن میں دو بڑی شخصیتیں برعظیم میں مشہور ہوئیں۔ ایک ہندوؤں میں شنکرا چاریہ اور دوسرے اورنگزیب عالمگیر کے عہد میں مرزا عبدالقادر بیدل، جو فارسی کے عظیم شعراء میں سے ہیں۔ یہ چار چوٹی کے لوگ ہیں جنہوں نے اس نظریئے کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ البتہ اس کے جو تین shades ہیں اور اس اعتبار سے اس کی جو تین تعبیرات ہیں انہیں علیحدہ علیحدہ identify کر لیجیے۔ اسی حوالے سے میں نے کہا تھا کہ ع

ہشدار کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را!

اس فرق کو اگر ملحوظ نہیں رکھیں گے تو شرک و کفر ہو جائے گا۔

ہمہ اوست کی ایک تعبیر Pantheism ہے۔ یعنی جب وجود ایک ہی ہے تو یہ کائنات گویا خدا کا حصہ ہے یا ہمہ تن خدا ہے، خود خالق ہی نے مخلوق کی شکل اختیار کر لی، جیسے برف پگھل کر پانی بن گئی اور پانی کو آپ نے ابالا تو وہ بھاپ بن گیا۔ اب پانی ہی برف بھی ہے اور بھاپ بھی ہے۔ اس نظریے میں کائنات کو حقیقی مانا گیا ہے کہ یہ

درحقیقت واقعی ہے اور یہ خالق کا حصہ ہے یا خالق ہی ہے۔ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ عظیم ترین کفر وشرک ہے اور اس کا اسلام کے ساتھ یا حقیقت کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ہے۔

دوسری تعبیر وہ ہے جو حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنی زندگی کے آخری دَور میں اختیار کی کہ حقیقت میں وجود ایک ہی ہے جو اللہ کا ہے' جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ درحقیقت ہے ہی نہیں۔ اس کی مثال میں دے چکا ہوں کہ آپ ایک مشعل کو دائرے کی صورت میں حرکت دیں تو ایک آتشیں دائرہ نظر آئے گا جو حقیقت میں موجود نہیں ہے۔ یہ دراصل اس کائنات کی نفی ہے کہ اس کا کوئی وجود ہے ہی نہیں۔ چنانچہ وجود صرف ایک ذاتِ باری تعالیٰ کا رہ گیا' جس سے شرک اور ثنویت کا خاتمہ ہوگیا۔ اسی کو غالبؔ نے یوں بیان کیا ہے ؎

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے!

اور عربی شعر مَیں آپ کو پہلے بھی سنا چکا ہوں ؎

کل ما فی الکون وھمٌ او خیالٌ
او عکوسٌ فی المرایا او ظلالٌ

یعنی کائنات میں جو کچھ موجود ہے وہ محض وہم یا خیال ہے' یہ یا تو محض آئینوں میں نظر آنے والے عکس ہیں یا سائے ہیں۔ حقیقت میں تو صرف ذاتِ باری تعالیٰ کا وجود ہے اور کوئی شے حقیقتاً موجود نہیں ہے ع

ہر چند کہیں کہ ہے' نہیں ہے!

لیکن یہ بات کہ کائنات کا وجود ہے ہی نہیں' قابل قبول نظر نہیں آتی۔ یہ ایک شاعرانہ خیال یا فلسفیانہ توجیہہ تو ہوسکتی ہے' لیکن کائنات تو بڑی ٹھوس حقیقت ہے۔ آپ نے شرک فی الوجود کی نفی کرنے کے لیے کائنات ہی کی نفی کر دی؟

میرے نزدیک اس کا اصل حل وہ ہے جو شیخ ابن عربیؒ نے دیا ہے' جو مَیں بیان کر چکا ہوں' کہ حقیقت و ماہیت وجود کے اعتبار سے خالق ومخلوق کا وجود ایک ہے' کائنات میں وہی وجودِ بسیط سرایت کیے ہوئے ہے' لیکن جہاں تعین ہوگیا تو وہ پھر غیر ہے' اُس کا عین نہیں۔ چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ یہ کائنات کا وجود ایک اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے وجود کا عین اور دوسرے اعتبار سے اس کا غیر ہے۔ یہ ابن عربی کا فلسفہ ہے۔ اور ابن عربی ہمارے دینی حلقوں کی سب سے زیادہ متنازعہ فیہ (controvercial) شخصیت ہیں۔ ان کی حمایت اور مخالفت دونوں انتہا کو پہنچی ہیں۔ ہمارے صوفیاء کی عظیم اکثریت انہیں شیخ اکبر کے نام سے جانتی ہے۔ ان کی کتابیں ''فصوص الحکم'' اور ''فتوحاتِ مکیہ'' تصوف کی بہت اہم کتابیں ہیں۔ دوسری طرف اختلاف بھی اتنا شدید ہے کہ امام ابن تیمیہؒ نے ان کو ملحد وزندیق قرار دیا ہے اور جو بھی شرعی گالی ہوسکتی تھی ان کو دی ہے۔ میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اگر شیخ اکبر کی کسی بات کی تائید کر رہا ہوں تو وہ ان کا صرف یہ نظریہ ہے' باقی میں نے نہ فصوص الحکم کا مطالعہ کیا ہے' نہ فتوحاتِ مکیہ کا۔ یہ بڑی دقیق کتابیں ہیں اور آدمی جب تک قدیم فلسفہ ومنطق میں مہارتِ تامہ بہم نہ پہنچا لے اس کے لیے ان کتابوں کا پڑھنا آسان کام نہیں ہے۔ ویسے بہت سی باتیں ان کی طرف غلط بھی منسوب کر دی گئی ہیں' جیسا کہ پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم نے اپنی کتاب ''اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش'' میں بہت سی مثالیں دی ہیں کہ خاص طور پر ہمارے ہاں جو باطنی لوگ تھے (جو شیعیت کا ایک شیڈ تھا) انہوں نے اہل سنت کو گمراہ کرنے کے لیے صوفیاء کی طرف بہت غلط باتیں منسوب کی ہیں۔ انہوں نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک بہت بڑے عالم اور صوفی کسی جگہ گئے تو وہاں ایک مسجد میں ان کی اپنی کتاب کا درس ہو رہا تھا' جسے سن کر انہوں نے کہا کہ توبہ توبہ میں نے یہ بات آج تک کبھی نہیں کی' بلکہ یہ بات تو میرے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آئی۔

اس اعتبار سے دیکھیں تو یہ بہت بڑی بات ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم اس کتاب (القرآن) کے خود محافظ ہیں ﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ﴾ کتابِ الٰہی کا محفوظ رہنا بھی آسان کام نہیں ہے جب تک کہ اللہ کا خصوصی فیصلہ نہ ہو۔

اسی لیے تو ایک دَور میں احادیث نبویؐ میں موضوع روایات کا ایک ایسا طومار شامل کر دیا گیا تھا کہ پھر محدثین کو پوری پوری زندگیاں کھپانی پڑیں اور انہوں نے موضوع روایات کو الگ کیا اور صحیح وضعیف احادیث کو بھی علیحدہ علیحدہ کیا۔ اسی طرح اہل تصوف کی طرف بہت سی غلط باتیں منسوب کی گئی ہیں۔ میں نہ تو ابن عربی کا وکیل ہوں اور نہ ان کی ہر بات کی ذمہ داری لیتا ہوں۔ ان کے ہاں جو تضاد موجود ہے اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ان ہی کی طرف یہ شعر بھی منسوب ہے کہ ؎

الرّب عبدٌ والعبد ربٌّ
یا لیت شعری من المکلّف!

''ربّ ہی عبد ہے اور عبد ہی ربّ ہے (یعنی خالق ومخلوق ایک ہی ہیں) تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کس کو حکم دیا جا رہا ہے (کہ عبادت کرے اور کس کی عبادت کرے!)''

لیکن دوسری طرف ان ہی کا ایک شعر ہے ؎

الرّبّ رَبٌّ وان تنزّل
والعبد عبدٌ وان ترقّی

''اللہ' اللہ ہی ہے' چاہے وہ کتنا ہی نزول فرمالے اور بندہ' بندہ ہی رہے گا چاہے جتنا بھی بلند ہو جائے''۔

حضورﷺ ساتویں آسمان تک گئے ہیں لیکن وہ معبود نہیں بن گئے' بلکہ عبد ہی رہے ہیں۔

میں نے اس مسئلہ کو ایک اور طریقے سے بہت ہی سادگی کے ساتھ حل کیا ہے۔ مجھ پر یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے کہ میری گفتگو' میرا غور وفکر اور میرے اخذ کردہ نتائج بالکل mathematical اور الجبرا کے فارمولوں کی طرح ہوتے ہیں۔ آج سے ۳۵ سال پہلے میری جو رائے تھی وہ میں بیان کر چکا۔ آج اس ضمن میں میری کیا رائے ہے اور اس کا صغریٰ کبریٰ کیا ہے' یہ میں اب بیان کر رہا ہوں۔

﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ کے حوالے سے میں ایک بات کی وضاحت کرنا چاہ رہا ہوں۔ ظاہر اور باطن کے اعتبار سے اس آیت کی کچھ مزید وضاحت ہونی چاہیے تھی جو نہیں ہو سکی۔ اس حوالے سے امام رازی کا ایک قول آپ کو سنانا چاہوں گا۔ اللہ تعالیٰ ظاہر بھی اتنا ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی ظاہر نہیں' وہ self evident ہے' آفتاب آمد دلیل آفتاب! اس لیے کہ پوری کائنات درحقیقت اسی کا ظہور ہے۔

معمور ہو رہا ہے عالم میں نور تیرا
از ماہتاب و ماہی سب ہے ظہور تیرا!

تو ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر ظاہر کون ہوگا؟

ردائے لالہ و گل' پردۂ ماہ و انجم
جہاں جہاں وہ چھپے ہیں عجیب عالم ہے!

پوری کائنات کے اندر اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت' اس کے علم اور اس کی حکمت کا ظہور ہے ؎

وفی کلّ شیءٍ لہ آیۃٌ
تدلّ علٰی انّہ واحدٌ

ہر شے میں اُس کی نشانی موجود ہے جو یہ دلالت کرتی ہے کہ وہ اکیلا ہے' تنہا ہے۔ لیکن اپنی کُنہ کے اعتبار سے اور اپنی ذات کے اعتبار سے وہ اس قدر باطن اور خفی ہے کہ اسے کوئی نہیں جانتا۔ اللہ تعالیٰ کے اس ظاہر اور باطن ہونے میں امام رازی نے بڑی خوبصورت نسبت قائم کی ہے۔ ان کا قول ہے کہ:

ان کمال کونہ ظاھرا سبب لکونہ باطنا' فسبحان من اختفٰی عن العقول لشدۃ ظھورہ واحتجب عنھا بکمال نورہ

''درحقیقت اس کے ظہور کی شدت اور کمال ہی اس کا سبب ہے کہ وہ نگاہوں سے چھپ گیا ہے (سورج جب نصف النہار پر چمک رہا ہو تو آپ آنکھ بھر کر اسے دیکھ نہیں سکتے' اس کی وجہ اس کی شدتِ ظہور ہے جس کے باعث آپ کی نگاہ چکا چوند ہو جاتی ہے۔) بس بڑی پاک ہے وہ ذات جو اپنے شدتِ ظہور کے باعث عقولِ انسانی سے چھپ گئی ہے اور اپنے نور کے کمال کے باعث عقولِ انسانی سے حجاب میں آ گئی ہے''۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ظاہر اور باطن ہونا تو بیک وقت (simultaneous) ہے اور ان دونوں میں جو گہرا رشتہ ہے اس کی اس طرح تاویل کی جا سکتی ہے جیسے امام رازی نے فرمائی ہے۔

شیخ ابن عربی کے بارے میں مَیں عرض کر چکا ہوں کہ جہاں تک حقیقت و ماہیتِ وجود کے بارے میں ان کی رائے کا تعلق ہے‘ میں اس سے متفق ہوں اور میرا مسلک بھی وہی ہے۔ البتہ اور بہت سی باتیں‘ خواہ انہوں نے لکھیں یا ان کی طرف غلط منسوب کر دی گئیں‘ ان سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ لہٰذا میں نہ تو ان کے بارے میں جواب دہ ہوں‘ نہ ان کی وضاحت میرے ذمہ ہے اور نہ ہی مجھے ان کے وکیل کی حیثیت حاصل ہے۔ خود اس فلسفہ وجود کے بارے میں بھی مَیں عرض کر چکا ہوں کہ اس کا تعلق نہ شریعت سے ہے نہ طریقت سے۔ اس فلسفہ کو جس کا جی چاہے قبول کرے اور جو اسے ردّ کرنا چاہے ردّ کر دے۔ اس کے نہ ماننے سے کسی اعتبار سے بھی دین میں کوئی کمی یا نقص واقع نہیں ہوتا۔ البتہ تنقید اور اختلاف کے معاملے میں دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ جس شخص کے نظریات پر آپ تنقید کر رہے ہیں پہلے اس کے اصل مسلک کو ضرور سمجھ لیں۔ شیخ ابن عربی کے فلسفہ وجود پر اکثر و بیشتر ناقدین‘ بالخصوص آج کل کے سلفی المزاج لوگ‘ جس انداز کی تنقیدیں کرتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک تو ان لوگوں نے اس مسئلہ کو سمجھا ہی نہیں‘ اور دوسرے یہ کہ جو باتیں شیخ ابن عربی نے کہی ہی نہیں وہ بھی ان سے منسوب کر دیتے ہیں۔ بہر حال اس مسئلے کو میں نے اپنے طور پر جس طرح حل کیا ہے وہ میں بیان کر رہا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت تو ہمارے لیے مطلوب و مقصود ہے اور اسی پر ہمارے طرزِ عمل اور دینی رویئے کی ساری بنیاد ہے۔ معرفتِ ربّ جس قدر گہری ہوگی اسی قدر ہمارے عمل میں گہرائی ہوگی‘ معرفت میں جتنی زیادہ وسعت ہوگی ہمارے دینی رویئے اور دینی روش میں بھی اتنی ہی زیادہ وسعت ہوگی۔ گویا معرفتِ ربّ اور ہمارا دینی رویہ ایک دوسرے کے ساتھ راست متناسب (proportionate) ہوں گے ـــــ میں عرض کر چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کے دو حصے ہیں: (۱) ذاتِ باری تعالیٰ‘ اور (۲) صفاتِ باری تعالیٰ ـــــ ذاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں مَیں نے آپ کو حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے دو مقولوں پر مشتمل ایک شعر سنایا تھا:

العِجزُ عن دَرکِ الذّاتِ اِدراکٌ
والبَحثُ عن کُنہِ الذّاتِ اِشراکٌ

یعنی جب انسان کو اللہ کی ذات کے ادراک سے عاجز ہونے کا احساس ہو جائے تو بس یہی ادراک ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کی ذات کی کنہ میں کھود کرید کرو گے تو شرک میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ گویا معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد!

شیخ سعدیؒ نے اس بات کو خوب بیان کیا ہے ؎

تواں در بلاغت بہ سُحباں رسید
نہ در کنہِ بے چونِ سبحاں رسید!

سُحباں ایک بہت ہی حکیم شخصیت کا نام ہے جو فصاحت و بلاغت کی معراج پر فائز تھے۔ شیخ سعدیؒ کہتے ہیں کہ بلاغت و فصاحت اور خطابت میں تو انسان سحباں تک بھی پہنچ سکتا ہے‘ لیکن ذاتِ باری تعالیٰ سبحانہٗ کی کُنہ تک پہنچنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت کا دوسرا حصہ صفات پر مشتمل ہے۔ معرفت ربّ کے بارے میں مَیں اپنی حدود و قیود (limitations) عرض کر چکا ہوں کہ ہماری ساری معرفت صفات کے حوالے سے ہے۔ ''ایمانِ مجمل'' کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

آمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَصِفَاتِہٖ

''میں ایمان لایا اللہ پر جیسا کہ وہ اپنے ناموں اور صفات سے ظاہر ہے''۔
لیکن صفات میں بھی ہم نہ اُن کی کمیت کا ادراک کر سکتے ہیں اور نہ کیفیت کا۔

صفاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں ہمارے ہاں علم کلام کا یہ مسئلہ متکلمین کے مابین ہمیشہ زیر بحث رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اس کا عین ہیں یا غیر؟ علامہ اقبال نے بھی اپنی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں اس مسئلے کی نشاندہی کی ہے ؎

ہیں صفاتِ ذاتِ حق حق سے جدا یا عینِ ذات؟

اُمت مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ذات و صفات میں کیا نسبت ہے؟ ہمارے لیے تو صفت اضافی شے ہے۔ ایک وقت تھا کہ مجھے کچھ بھی علم حاصل نہیں تھا۔ آج مجھے تھوڑا یا زیادہ کچھ نہ کچھ علم حاصل ہے، اور ہوسکتا ہے کہ میں ارذل العمر تک پہنچ جاؤں اور وہ علم بالکل زائل ہوجائے (اعاذنا اللہ من ذٰلک) گویا کہ صفتِ علم ہمارے وجود پر ایک اضافی شے ہے، وہ ہمارے وجود کا حصہ نہیں ہے۔ لیکن کیا ہم اللہ کے بارے میں یہ تصور کرسکتے ہیں؟ اس مسئلہ پر بڑی طویل بحثیں ہوئی ہیں۔ میری یہ خوش قسمتی ہے کہ مجھے مولانا منتخب الحق صاحب سے استفادہ کا موقع ملا جو اِس دَور میں فلسفہ و منطق کے قدیم مکتبِ فکر ''خیر آباد اسکول آف تھاٹ'' کی آخری شخصیت تھے۔ جب میں نے کراچی یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات کیا تھا تو وہاں میں نے مولانا منتخب الحق صاحب سے استفادہ کیا اور یہ مسئلہ میری سمجھ میں آیا۔ میں یہاں وہ مسئلہ تو بیان نہیں کر رہا، لیکن اس کا سب کے نزدیک جو متفق علیہ حل ہے وہ ہے ''لا عینٌ و لا غیرٌ''، یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات نہ اس کی ذات کا عین ہیں اور نہ غیر۔ سمجھ میں آئے تب بھی یہ ماننا پڑتا ہے نہ آئے تب بھی ماننا پڑتا ہے، اس لیے کہ اگر عین مانیں گے تب بھی بہت سی ایسی چیزیں لازم آجائیں گی جنہیں تسلیم نہیں کیا جاسکتا اور اگر غیر مانیں گے تب بھی ایسی بہت سی چیزیں لازم آجائیں گی جن کا اللہ کے بارے میں گمان بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ''لا عینٌ و لا غیرٌ'' کی ایک تعبیر یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ''من وجہٍ عینٌ و من وجہٍ آخر غیرٌ''، یعنی ایک اعتبار سے وہ غیر ہیں اور ایک اعتبار سے عین۔ یہ گویا دوسرا مقدمہ ہوا۔

اب آیئے تیسری بات کی طرف! ہر شخص جانتا ہے کہ یہ سلسلۂ کون و مکان اللہ تعالیٰ کے ایک امر ''کُن'' کا ظہور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں دو مقامات (الکہف:۱۰۹ و لقمان:۲۷) پر آیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے کلمات کو گن نہیں سکتے۔ اگر کل روئے ارضی کے درخت قلم اور سارے سمندر سیاہی بن جائیں تب بھی اللہ کے کلمات ختم نہیں ہوں گے، لیکن سیاہی ختم ہوجائے گی۔ اگر سیاہی کی اتنی ہی مقدار مزید لائی جائے تو وہ بھی اس مقصد کے لیے ناکافی ہوگی۔ ﴿لَنَفِدَ الۡبَحۡرُ قَبۡلَ اَنۡ تَنۡفَدَ کَلِمٰتُ رَبِّیۡ وَلَوۡ جِئۡنَا بِمِثۡلِہٖ مَدَدًا﴾ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام مخلوقات اللہ کے کسی نہ کسی کلمۂ کُن کا ظہور ہیں۔ اب سمجھئے کہ ''کُن'' کیا ہے؟ کلام ہے، کلمہ ہے۔ اور کلام متکلم کی صفت ہوتا ہے۔ گویا کہ حرفِ ''کُن'' اللہ کی صفت ہے اور صفت کے بارے میں متکلمین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ ''لا عینٌ و لا غیرٌ''۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ یہ کائنات نہ اللہ کا عین ہے اور نہ غیر ہے، اور یہی بات ہے جو شیخ ابنِ عربی کہہ رہے ہیں:

من وجہٍ عینٌ ومن وجہٍ آخر غیرٌ

ایک اعتبار سے یہ عین ہیں اور ایک اعتبار سے غیر ہیں۔ ماہیت وجود (essential being) میں اتحاد ہے، لیکن جہاں بھی تعین ہوگا اور مختلف چیزوں کا definite وجود مان لیا جائے گا تو وہ اللہ کا غیر ہے۔ یہی مسلک ابنِ عربی کا ہے اور یہی اس مسئلے میں میری توجیہہ ہے۔

اس سلسلہ میں آخری بات یہ عرض کر رہا ہوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ بہت سے حضرات کا شاید یہ ذوق نہ ہو، اس کے باوجود میں یہ مسئلہ اس لیے بیان کر دیا کرتا ہوں کہ ان بزرگوں اور اسلاف کے بارے میں سوئے ظن نہ رہے جو وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ اس سے ہمیں اپنے آپ کو بچالینا چاہیے، کیونکہ یہ بہت بڑی محرومی ہے۔ کسی بھی شخص سے اختلاف کا حق ہر شخص کو حاصل ہے، یہاں تک کہ آراء کی حد تک ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی اختلاف کرسکتے ہیں۔ کوئی شخص یہ رائے رکھ سکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فلاں معاملہ میں یوں نہ کرتے تو بہتر ہوتا۔ اس لیے کہ ہمارے نزدیک عصمت خاصۂ نبوت ہے اور نبوت کے خاتمہ کے ساتھ عصمت ختم ہوچکی۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد اب کوئی بھی معصوم نہیں ہے۔

بابِ سوم

مشتمل بر

سورۃ الحدید کی آیات ۷ تا ۱۱

❁

خالق و مالکِ ارض وسماوات اور ذاتِ اوّل وآخر وظاہر وباطن

کے انسانوں سے دو تقاضے:

ایمان و اِنفاق

❁

اعوذ باللہ من الشَّیطٰن الرَّجیم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ
مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ط فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ
كَبِيْرٌ Γ وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ج وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ
لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ H
هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ
الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ط وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ I
وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ
قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ط اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ
اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ط وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ط
وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ϑ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ
قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ K﴾

آیاتِ زیرِ درس کا رواں ترجمہ و مفہوم

اس سورۂ مبارکہ کا دوسرا حصہ اس کے عملی پہلو پر مشتمل ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ پہلے ان پانچ آیات کا ایک رواں ترجمہ سامنے آ جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے پہلی ہی آیت بڑی عظمت کی حامل ہے اور ان پانچوں کو ایک کل کی حیثیت سے سامنے رکھیں گے تو نظر آئے گا کہ جہاں ایک طرف فصاحت و بلاغت کی معراج ہے وہیں جامعیت اور اس کے ساتھ ترتیب اور توازن کی بھی انتہا ہے جو آپ کو ان پانچ آیات میں ملے گی۔ پہلی آیت کا رواں ترجمہ یوں ہوگا:

> ''ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر (یا ایمان رکھو اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر) اور خرچ کرو (لگا دو، کھپا دو) ان سب چیزوں میں سے جس میں اس نے تمہیں خلافت عطا کی ہے۔ تو جو لوگ تم میں سے (دینِ متین کے یہ دو تقاضے پورے کر دیں۔ یعنی) ایمان لے آئیں اور انفاق کا حق ادا کر دیں تو ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے''۔

ایک آیت میں جامعیت کے ساتھ دین کے جملہ تقاضوں کو دو الفاظ میں بیان کر دیا گیا۔ حسنِ ترتیب اور حسنِ توازن ملاحظہ کیجیے کہ اب ان میں سے ہر ایک تقاضے پر دو دو آیات آ رہی ہیں، ایک ایک آیت میں ذرا سرزنش، ڈانٹ ڈپٹ، زجر اور ملامت کا انداز ہے اور ایک ایک آیت میں ترغیب اور تشویق ہے۔ فرمایا:

> ''تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ پر ایمان نہیں رکھتے درانحالیکہ رسول تمہیں دعوت دے رہا ہے کہ اپنے ربّ پر ایمان رکھو اور وہ تم سے قول و قرار لے چکا ہے اگر تم واقعی مؤمن ہو''۔

اس آیت میں گویا کہ زجر و ملامت اور ایک طرح کی تنبیہہ اور سرزنش ہے۔ اس کے بعد اگلی آیت میں تشویق و ترغیب آئی ہے کہ اگر تمہیں اپنے باطن میں جھانکنا نصیب ہو جائے، اپنے دلوں کو ٹٹولنے کی سعادت حاصل ہو جائے اور محسوس ہو کہ واقعتاً خانۂ دل ایمان سے خالی ہے تو بھی گھبراؤ نہیں۔ فرمایا:

> ''وہی ہے (اللہ) جو نازل فرما رہا ہے اپنے بندے پر روشن آیات، تا کہ وہ تمہیں اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالے، اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تم پر نہایت شفیق اور مہربان ہے''۔

اندھیرے شرک کے ہیں، کفر و الحاد کے ہیں، مادیت کے ہیں، حرص و ہوا کی غلامی کے ہیں۔

کریما بہ بخشائے بر حالِ ما
کہ ہستم اسیرِ کمندِ ہوا!

یہ مختلف shades of darkness ہیں۔ قرآن مجید میں ''ظُلُمات'' ہمیشہ جمع کے صیغہ میں اور نور ہمیشہ واحد آیا ہے۔ نور کے اندر تعدّد بھی لایا گیا ہے تو بھی واحد کے صیغے میں: ﴿نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ﴾ جبکہ اندھیروں کا تذکرہ بایں الفاظ فرمایا: ﴿ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ﴾۔ تو اللہ نے یہ کتاب اتاری ہے، اس کی یہ آیاتِ بیّنات ہیں جو تمہیں ہر طرح کے اندھیروں سے نکال کر تمام ظلمات سے، ہر طرح کے shades of darkness سے روشنی میں لے آئیں گی۔ یقیناً اللہ تعالیٰ رؤف و رحیم ہے۔ وہ تم پر بہت مہربان ہے، وہ تمہارا خیر خواہ ہے، تم پر رحم فرمانے والا ہے۔

تو یہ دو آیات ہو گئیں۔ اب اگلی دو آیات میں بھی یہی انداز ہے۔ ان میں سے پہلی آیت میں وہی سرزنش کا اسلوب ہے۔ فرمایا:

> ''اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے (تم پر یہ بخل کیوں طاری ہو گیا؟ تم نے یہ سینت سینت کر رکھنے کی روش کیوں اختیار کر لی؟) حالانکہ آسمان و زمین کی وراثت تو اللہ ہی کے لیے ہے۔ (تم سب دنیا سے چلے جاؤ گے اور یہ سب کچھ اللہ ہی کے لیے رہ جائے گا۔) برابر نہیں ہیں تم میں سے وہ لوگ جنہوں نے فتح سے پہلے انفاق اور قتال کیا تھا۔ ان کے درجات بہت بلند ہیں اُن کے مقابلے میں جنہوں نے فتح کے بعد انفاق اور قتال کیا، اگرچہ اللہ نے دونوں ہی سے اچھے وعدے فرمائے ہیں۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے''۔

فعل وہی ہے ''اِنفاق''، یعنی جان و مال کا کھپانا، لیکن جن حالات میں کوئی شخص کر رہا ہے اس اعتبار سے اس کی قدر و قیمت میں زمین و آسمان کا فرق و تفاوت واقع ہو

جائے گا۔ جب دین غربت کی حالت میں ہے' پامال ہے' دین کا کوئی ساتھی نہیں' دین کا کوئی جاننے والا نہیں' از روئے حدیث نبویؐ: ((بَدَأَ الْاِسْلَامُ غَرِیْبًا وَسَیَعُوْدُ غَرِیْبًا کَمَا بَدَأَ ' فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَاءِ)) (صحیح مسلمؒ' کتاب الایمان) "دین کی ابتداء حالت اجنبیت میں ہوئی اور عنقریب یہ دوبارہ ویسے ہی اجنبی ہو جائے گا جیسے ابتداء میں تھا۔ پس خوش خبری ہے ان اجنبیوں کے لیے''۔ تو اس حالت غربت میں جنہوں نے اسلام کا ساتھ دیا ان السَّابقون الاوّلون کا اللہ کے ہاں جو مرتبہ ہے اس تک وہ لوگ ہرگز نہیں پہنچ سکتے جو اسلام کو غلبہ حاصل ہونے کے بعد آئے اور قتال و انفاق کیا۔ اگر وہ حسن نیت سے آئے ہیں تو اُن کے اجر و ثواب کی بھی اللہ کی طرف سے ضمانت دی گئی ہے' لیکن درجے میں وہ اُن کے برابر کبھی نہیں ہو سکتے جنہوں نے حالتِ غربت میں اور حالتِ ضعف میں دین کا ساتھ دیا۔ ان سب سے اللہ کا بہت اچھا وعدہ ہے۔ جنت سب کو ملے گی' جو پہلے آئے ان کو بھی اور جو بعد میں آئے ان کو بھی' البتہ حسن نیت شرط ہے۔ پھر جنت کے درجات میں بھی بہت فرق و تفاوت ہو گا۔ حدیث میں آیا ہے کہ نچلے درجے والا جنتی اوپر کے درجے والے جنتی کو ایسے دیکھے گا جیسے تم زمین سے آسمان پر ستاروں کو دیکھتے ہو۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے خوب باخبر ہے۔ اس سے پہلے آیت ۴ میں الفاظ آئے تھے: ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ﴾ جبکہ یہاں فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ﴾ ''بصیر'' اور ''خبیر'' دونوں الفاظ اردو میں مستعمل ہیں۔ قرآن مجید میں ترتیب کے لحاظ سے ''بصیر'' کو مقدم اور ''خبیر'' کو مؤخر کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ خبر اصل شے ہے' بصارت میں دھوکہ کھانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ وہ خبیر ہے' یعنی وہ تمہارے باطن سے بھی باخبر ہے' تمہاری نیتوں کو بھی جانتا ہے۔ حدیث نبویؐ کے الفاظ ہیں:

((اِنَّ اللّٰهَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی اَجْسَادِکُمْ وَلَا اِلٰی صُوَرِکُمْ ' وَلٰکِنْ یَنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ وَاَعْمَالِکُمْ)) (متفق علیه)

''اللہ تعالیٰ نہ تمہارے تن و توش کو دیکھتا ہے اور نہ تمہاری صورتوں کو' بلکہ وہ تو تمہارے دلوں کو اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے''۔

آیت ۱۰ ذرا طویل آیت تھی جس میں سرزنش کا انداز تھا' اب اگلی آیت میں جو ترغیب کا انداز ہے واقعہ یہ ہے کہ غالب کے اس شعر کے بالکل مصداق ہے کہ ۔

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صَلا میرے بعد!

''کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسنہ دینے کی ہمت کرے؟ پھر وہ اس کو اس کے لیے بڑھاتا رہے گا اور اس کے لیے بہترین اجر ہے''۔

دنیا میں تمہارا قرضِ حسنہ کا تصور یہ ہے کہ صرف اصل زر واپس آئے گا' مزید کچھ نہیں ملے گا' لیکن تم اللہ کو قرضِ حسنہ دو گے تو وہ اس کو بڑھاتا رہے گا اور انفاق کرنے والے کو اصل مال تو بڑھ کر دوگنا' چوگنا' سوگنا' بلکہ سات سوگنا تک ملے گا ہی' بہترین اجر و ثواب اضافی طور پر اس کے علاوہ ہو گا۔

یہ پانچ آیات ہیں جن پر اس سورۂ مبارکہ کا حصہ دوم مشتمل ہے' جس میں دین کے عملی تقاضوں کو نہایت فصاحت' بلاغت' خطابت اور غایت درجہ جامعیت اور حسن ترتیب اور حسن توازن کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ان آیات میں جو ترتیب اور توازن موجود ہے واقعہ یہ ہے کہ میرے علم کی حد تک اس کی کوئی دوسری نظیر قرآن مجید میں نہیں ملتی۔

دعوتِ ایمان کے مخاطب کون؟

اب ہم ان آیات کا ذرا تفصیل سے مطالعہ کرتے ہیں۔ پہلی آیت میں سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خطاب کس سے ہو رہا ہے؟

﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَکُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْهِ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ کَبِیْرٌ﴾

''ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر اور خرچ کرو اُس میں سے جس میں اس نے تمہیں خلافت عطا کی ہے۔ پس جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں اور انفاق کریں ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے''۔

اگر صرف اس آیت کے الفاظ کو سامنے رکھا جائے تو امکان موجود ہے کہ یہ خطاب غیر مسلموں‘ یہود و نصاریٰ وغیرہ سے ہو‘ لیکن سیاق وسباق سے اور پوری پانچ آیات کے مطالعہ سے یہ متعین ہو جاتا ہے کہ یہاں اُن سے خطاب نہیں ہے‘ بلکہ یہ خطاب مسلمانوں سے ہے۔ ان سورتوں کا مجموعی تعارف کراتے ہوئے میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ ان سورتوں میں کفار ومشرکین‘ یہود و نصاریٰ وغیرہ سے خطاب ہے ہی نہیں‘ بلکہ روئے سخن کلیتہً مسلمانوں سے ہے۔

اب دوسرا سوال اٹھتا ہے کہ مسلمانوں میں سے کون لوگ اس کے مخاطب ہیں؟ وہ لوگ کہ جن کی حرارتِ ایمانی میں کچھ کمی ہے‘ معیارِ مطلوب پر نہیں ہے‘ جن کا جذبۂ انفاق جتنا ہونا چاہیے اتنا نہیں ہے‘ جن کا جوشِ جہاد اور ذوقِ شہادت جتنا ہونا چاہیے اتنا نہیں ہے‘ جن میں ضعف ہے اور ایمان اور اعمالِ صالحہ کا جو درجہ مطلوب ہے اس پر پورے نہیں اترتے۔ یہ ہیں وہ لوگ جن سے یہ خطاب کیا جا رہا ہے۔ اسی لیے ﴿اٰمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ﴾ کے دو ترجمے ہوں گے: ایک یہ کہ ”ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر“ اور دوسرا یہ کہ ”ایمان رکھو اللہ اور اس کے رسول پر“۔ پہلے ترجمے میں یہ امکان موجود ہے کہ گویا کفار ومشرکین سے خطاب ہو رہا ہے‘ جبکہ دوسرے ترجمہ میں خطاب گویا مسلمانوں سے ہے۔ میرے نزدیک درحقیقت یہاں خطاب ان کمزور اور ضعیف مسلمانوں سے ہے جن کے اندر حرارتِ ایمانی‘ جذبۂ جہاد اور جوشِ انفاق جتنا ہونا چاہیے نہیں ہے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن حکیم میں اس آیت کی ہم مضمون آیات کون سی ہیں۔ سب سے پہلے سورۃ النساء کی یہ آیت ملاحظہ کیجیے:

﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اٰمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ وَالۡکِتٰبِ الَّذِیۡ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوۡلِہٖ وَالۡکِتٰبِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ مِنۡ قَبۡلُ ؕ﴾ (آیت ۱۳۶)

”اے اہل ایمان! ایمان لاؤ (یا ایمان رکھو) اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر بھی جو اُس نے اپنے رسولؐ پر نازل فرمائی اور اس کتاب پر بھی جو اس نے اس سے پہلے نازل فرمائی تھی۔“

یعنی اے اہل ایمان! ایمان کا حق ادا کرو......اے ایمان کا دعویٰ کرنے والو! ویسے مانو جیسے ماننے کا حق ہے......اے ایمان کے دعوے دارو! ایمان لاؤ اور ایمان پختہ رکھو اللہ اور اس کے رسولؐ پر......الخ

سورۃ الصّف ہمارے منتخب نصاب کے حصہ چہارم کا مرکزی درس ہے۔ اس میں فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ہَلۡ اَدُلُّکُمۡ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنۡجِیۡکُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿۱۰﴾ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ وَتُجَاہِدُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ بِاَمۡوَالِکُمۡ وَاَنۡفُسِکُمۡ ؕ ذٰلِکُمۡ خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۱﴾﴾

”اے اہل ایمان! کیا تمہیں وہ تجارت بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دلا دے؟ (وہ یہ ہے کہ) ایمان رکھو (یا ایمان لاؤ) اللہ اور اس کے رسولؐ پر‘ اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھو۔“

گویا کہ مخاطب بھی وہ ہیں جن کو ”یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا“ کہا گیا اور انہیں حکم بھی ایمان لانے کا دیا جا رہا ہے۔

اس ضمن میں تیسرا مقام سورۃ الحجرات (آیات ۱۴‘۱۵) کا ہے‘ جہاں یہ مضمون بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ یہ ہمارے منتخب نصاب کے حصہ سوم کی آخری سورت ہے۔ فرمایا:

﴿قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا وَلٰکِنۡ قُوۡلُوۡۤا اَسۡلَمۡنَا وَلَمَّا یَدۡخُلِ الۡاِیۡمَانُ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ ؕ﴾ (آیت ۱۴)

”یہ بدو کہہ رہے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ (اے نبیؐ!) ان سے کہہ دیجیے کہ تم ایمان ہرگز نہیں لائے‘ بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے (ہم مسلمان ہو گئے‘ ہم نے اطاعت قبول کر لی) جبکہ ایمان ابھی تک تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔“

اور وہ حقیقی ایمان جسے اللہ کے ہاں تسلیم کیا جائے گا‘ وہ کیا ہے؟ اس کی وضاحت اگلی آیت میں آ گئی۔ فرمایا:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝﴾
''حقیقی مؤمن تو صرف وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اس کے رسول پر‘ پھر ہرگز شک میں نہیں پڑے (انہیں یقین کی کیفیت حاصل ہوگئی) اور انہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔ یہی ہیں جو (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔''

یہاں درحقیقت ایمانِ حقیقی کے دو اجزاء بیان کیے گئے ہیں: ایک یقین قلبی اور دوسرا عمل میں جہاد اپنے جان و مال کے ساتھ۔ اس یقین کے بارے میں علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں‘ یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری!

تو یہاں (سورۃ الحدید میں) درحقیقت اسی ایمانِ حقیقی کا ذکر ہے: ﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ یعنی ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر جیسا کہ ایمان کا حق ہے۔

''اِنفاق'' کا جامع مفہوم

اس کے بعد دین کا دوسرا تقاضا ان الفاظ میں بیان کر دیا گیا: ﴿وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ۭ﴾ ''اور خرچ کرو اُن چیزوں میں سے جن پر اُس نے تم کو خلیفہ بنایا ہے''۔ اس آیت میں چونکہ بہت مختصر الفاظ میں بات آ رہی ہے لہٰذا انفاق کے ساتھ ''فی سبیل اللہ'' مذکور نہیں‘ بلکہ مقدر (understood) ہے۔ اصل انفاق جو مقصود ہے وہ فی سبیل اللہ ہی ہے۔ اسے اگلی آیت میں کھول دیا گیا: ﴿وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ''تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے؟'' انفاق سے عام طور پر مال کا خرچ کرنا مراد لیا جاتا ہے‘ حالانکہ یہ لفظ وسیع المفہوم ہے۔ اس کی بحث سورۃ المنافقون میں ہو چکی ہے کہ نَفَقَ ۔ یَنْفُقُ جب ثلاثی مجرد سے آتا ہے تو اس کے معانی کسی چیز کے ختم ہو جانے‘ کھپ جانے اور صرف ہو جانے کے ہوتے ہیں۔ اور یہ جاندار اور بے جان سب کے لیے آتا ہے۔ چنانچہ عرب کہتے ہیں کہ نَفَقَتِ الدَّرَاهِمُ (درہم ختم ہو گئے) اور نَفَقَ الْفَرَسُ (گھوڑا مر گیا)۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی جس حدیث میں آنحضور ﷺ نے جہاد کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ کسی شخص کے اعمالِ صالحہ کے پلڑے میں کسی شے کا وزن اس گھوڑے یا سواری سے بڑھ کر نہیں ہو گا جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے کام آ گئی‘ وہاں بھی لفظ ''نُفِقَ'' آیا ہے۔ گویا یہ لفظ بے جان اور جاندار دونوں کے لیے آتا ہے۔ چنانچہ یہاں انفاقِ مال اور انفاقِ نفس دونوں مراد ہیں۔ انفاقِ نفس یہ ہے کہ آپ اپنی صلاحیت و قوت‘ محنت اور وقت صرف کر رہے ہیں۔ ایک انفاقِ مال ہے‘ کہ اللہ کے دیئے ہوئے وسائل آپ اس کی راہ میں خرچ کر رہے ہیں۔ لیکن دونوں پر اس لفظ ''انفاق'' کا اطلاق ہو گا۔ انفاقِ جان کی بلند ترین منزل قتال ہے جب انسان اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ جنگ میں حاضر ہو جائے۔ جو جنگ میں جاتا ہے موت کا خطرہ مول لے کر جاتا ہے۔ اگر لوٹ آئے تو گویا اسے ایک نئی زندگی ملی ہے‘ ورنہ جنگ میں جانے والا تو دراصل اپنی جان کی بازی لگانے کا فیصلہ کر کے گیا ہے۔ چنانچہ اگلی آیت میں انفاق اور قتال دونوں لفظ آ گئے: ﴿لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ۭ﴾ ''برابر نہیں ہیں تم میں سے وہ لوگ جنہوں نے فتح سے قبل انفاق کیا اور قتال کیا''۔ یہاں ''انفاق'' مال خرچ کرنے کے لیے اور ''قتال'' بذلِ نفس کے لیے آیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم نے تنظیم اسلامی میں شمولیت کے لیے جو عہد نامہ معین کیا ہے اس میں ''وَاُنْفِقَ مَالِيْ وَاَبْذُلَ نَفْسِيْ'' کے الفاظ شامل کیے ہیں۔ اس عہد نامہ کے پہلے حصے میں تو کلمۂ شہادت اور استغفار ہے۔ دوسرے حصے میں جو عہد ہے وہ بھی تنظیم سے نہیں ہے‘ نہ مجھ سے کوئی معاہدہ ہے‘ بلکہ اللہ سے ایک عہد ہے‘ اس لیے کہ یہ بیع و شراء تو اللہ اور بندے کے درمیان ہے‘ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰي مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۭ﴾ ''اللہ نے خرید لیے ہیں اہلِ ایمان سے اُن کے مال بھی اور اُن کی جانیں بھی جنت کے عوض۔'' چنانچہ تنظیم کے ''عہد نامۂ

رفاقت'' کا دوسرا حصہ یہ ہے:

اِنِّیْ اُعَاهِدُ اللّٰهَ عَلٰی اَنْ اَهْجُرَ کُلَّ مَا یَکْرَهُهٗ وَاُجَاهِدَ فِیْ سَبِیْلِهٖ جُهْدَ اسْتِطَاعَتِیْ ' وَاُنْفِقَ مَالِیْ وَاَبْذُلَ نَفْسِیْ لِاِقَامَةِ دِیْنِهٖ وَاِعْلَاءِ کَلِمَتِهٖ

''میں اللہ سے عہد کرتا ہوں کہ ہر اُس چیز کو چھوڑ دوں گا جو اسے ناپسند ہے' اور اپنی استطاعت کی حد تک اس کی راہ میں جہاد کروں گا' اور اپنا مال بھی خرچ کروں گا اور اپنی جان بھی کھپاؤں گا اس کے دین کو قائم کرنے کے لیے اور اس کے کلمہ کی سربلندی کے لیے''۔

اس کے بعد یہ الفاظ آتے ہیں:

وَلِاَجْلِ ذٰلِکَ اُبَایِعُ ......

''اس مقصد کی خاطر میں بیعت کر رہا ہوں......''

اس مقصد کے لیے تنظیم میں شمولیت ہو رہی ہے' ورنہ یہ عہد معاہدہ' یہ قول وقرار' یہ میثاق اور یہ بیع وشراء تو ہر بندۂ مؤمن کا' اگر وہ حقیقتاً مؤمن ہے' اللہ کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اگر نہیں ہے تو یہ ہماری محرومی ہے۔

انفاق کتنا کیا جائے؟

اب اس آیت میں تیسری بات نوٹ کیجیے کہ ﴿وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَکُمْ﴾ میں لفظ ''مِمَّا'' مِنْ اور مَا سے بنا ہے' اور مِنْ یہاں تبعیضیہ ہے۔ اللہ کا یہ مطالبہ نہیں ہے کہ اپنا سارا مال لگا دو۔ اللہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ اپنے جسم اور جان کی ساری قوتیں اور صلاحیتیں ہماری راہ میں لگا دو' بلکہ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ جن جن چیزوں میں ہم نے تمہیں استخلاف عطا کیا ہے اس میں سے ہماری راہ میں لگاؤ۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''کتنا؟'' اس کا جواب سورۃ البقرۃ میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿وَیَسْئَلُوْنَکَ مَا ذَا یُنْفِقُوْنَ ط قُلِ الْعَفْوَ ط﴾ ''(اے نبیؐ!) یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں؟ کہہ دیجیے جو بھی تمہاری ضرورت سے زائد ہو''۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ بندۂ مؤمن اگر اس تقاضے کو واقعتاً کما حقہٗ ادا کرنا چاہتا ہے تو اس ضمن میں وہ کیا طرزِ عمل اختیار کرے! پہلے اپنی نیتوں کو صاف کیجیے' خالص کیجیے کہ جو بات سامنے آئے گی اس پر اگر دل گواہی دے گا کہ واقعتاً صحیح ہے تو قبول کریں گے۔ میرے نزدیک یہاں مِنْ تبعیضیہ اس بات کو واضح کر رہا ہے کہ بندۂ مؤمن اپنے جان اور مال' اپنی صلاحیت' قوت' اوقات اور اپنی ذہانت وفطانت میں سے صرف اتنا حصہ اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لیے وقف کرے جو اُن کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے لیے لازم ہے' جسے آپ subsistence level کہتے ہیں' اور وہ بھی اس لیے کہ زندہ رہنا ہے تاکہ ہم کام جاری رکھ سکیں۔ زندگی برائے زندگی نہیں' زندگی بجائے خود مطلوب ومقصود نہیں ہے' مطلوب ومقصود تو اللہ ہے۔ لا مقصودَ الا اللّٰہ اور لا مطلوبَ الا اللّٰہ۔ لیکن زندگی کو برقرار رکھنا ہے کہ یہ اللہ کی عطا کردہ ایک نعمت ہے' اور اس لیے برقرار رکھنا ہے تاکہ اللہ کی راہ میں' اس کے دین کی اقامت اور سربلندی کے لیے' زمین پر اللہ تعالیٰ کی بادشاہت کو بالفعل قائم کرنے کے لیے مسلسل محنت اور جدوجہد کی جاسکے۔ سائیں عبدالرزاق صاحب کا یہ قول میں متعدد بار بیان کر چکا ہوں کہ ''جو دم غافل سو دم کافر''۔ یعنی جو وقت اللہ کی یاد سے غفلت میں بیت گیا وہ گویا حالتِ کفر میں گزر گیا۔ اسی طرح جو کچھ بھی ضرورت سے زائد ہے اسے جمع کرنا حقیقت کے اعتبار سے کفر اور ضلالت ہے۔ سورۃ الھمزۃ ابتدائی مکی دَور کی سورت ہے۔ اس میں فرمایا گیا: ﴿وَیْلٌ لِّکُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ﴾ یعنی تباہی ہے' ہلاکت ہے' بربادی ہے' وَیل ہے ان لوگوں کے لیے جو ایک طرف اس اخلاقی پستی میں مبتلا ہیں کہ لوگوں کی عیب چینی اور عیب جوئی کرتے ہیں' طنز وطعن کا کام کرتے ہیں اور دوسری طرف مال جمع کرتے ہیں اور اسے گنتے رہتے ہیں' اپنی مالی حیثیت کا جائزہ لیتے رہتے ہیں کہ آج کی بیلنس شیٹ کیا ہے اور اس سال ہمارے اثاثوں (assets) میں کتنا اضافہ ہوا۔ ان کے دل کی کلی اسی سے کھلتی ہے۔ وہ یوں محسوس کرتے ہیں شاید اسی مال کی بدولت انہیں خلد اور دوام حاصل ہو جائے گا۔ ان تین آیات میں ایک پوری انسانی شخصیت کا ہیولیٰ اور ایک پوری ذہنیت کا نقشہ پیش کر دیا گیا ہے۔

مدنی قرآن میں انتہائی زمانے کی سورۃ التوبۃ کی آیات ۳۴‘ ۳۵ ملاحظہ کیجیے:

﴿وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ۙ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝ یَّوْمَ یُحْمٰی عَلَیْھَا فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ فَتُکْوٰی بِھَا جِبَاھُھُمْ وَجُنُوْبُھُمْ وَظُھُوْرُھُمْ ؕ ھٰذَا مَا کَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ ۝﴾

یعنی جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس مال کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کر رہے‘ اے نبی انہیں بشارت دے دیجیے دردناک عذاب کی۔ (طنز کیا گیا ہے کہ انہیں بشارت دے دیجیے)۔ ایک دن آئے گا کہ یہی سونا چاندی جہنم کی دہکتی آگ میں تپا تپا کر اس سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔ اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا‘ لو اَب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو!

تو مِمَّا میں مِنْ تبعیضیہ سمجھ کر آسانی سے نہیں گزر جانا چاہیے‘ بلکہ یہ بڑا فکر انگیز مقام ہے۔ ہاں‘ آدمی کی ضروریات کتنی ہیں‘ یہ معاملہ ہر شخص پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اپنے لیے اس کا تعین خود کر لے۔ یہ اس کی اپنی assessment ہے۔ مختلف ذمہ داریوں کے ادا کرنے کے حوالے سے سب کی ضروریات برابر نہیں ہوتی۔ ایک چیز ایک شخص کے لیے luxury ہے‘ لیکن ہوسکتا ہے کہ دوسرے شخص کے لیے وہی چیز necessity ہو۔ اس اعتبار سے کوئی لگا بندھا ضابطہ نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ ہر شخص اپنا جائزہ لے لے کہ درحقیقت ان تمام چیزوں میں سے جو اللہ نے اسے عطا کی ہیں‘ اس قدر جتنا زندگی کے لیے‘ جسم اور جان کے تسلسل کو باقی رکھنے کے لیے اور اپنے اہل و عیال کے لیے ناگزیر ہے وہ تو اس کا صحیح اور جائز حق ہے‘ اس سے زائد جو کچھ ہے وہ اللہ کی راہ میں خرچ کر دے۔ جیسا کہ اقبال نے کہا تھا ؎

جو حرفِ قُلِ العَفْو میں پوشیدہ تھی اب تک
اس دَور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار!

واقعہ یہ ہے کہ دین کی بہت سی باتوں پر بہت گہرے اور دبیز پردے پڑ گئے ہیں۔ آپ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا وہ قول سن رکھا ہوگا کہ حَفِظْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ وِعَائَیْنِ ...... حضرت ابوہریرہؓ کا انتقال سن ۵۷ یا ۵۸‘ یا زیادہ سے زیادہ ۵۹ ہجری میں حضرت امیر معاویہh کے دورِ حکومت میں ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی انقلابِ حال اس درجے ہو چکا تھا کہ فرماتے تھے:

حَفِظْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ وِعَائَیْنِ ، فَاَمَّا اَحَدُھُمَا فَبَثَثْتُہٗ فِیْکُمْ ، وَاَمَّا الْآخَرُ فَلَوْ بَثَثْتُہٗ قُطِعَ ھٰذَا الْبُلْعُوْمُ (صحیح البخاری‘ کتاب العلم‘ باب حفظ العلم)

’’میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے (علم کے) دو برتن حاصل کیے تھے۔ ان میں سے ایک کو تو میں نے تمہارے مابین خوب عام کیا ہے‘ لیکن اگر دوسرے میں سے پھیلانا شروع کر دوں تو میری یہ گردن کاٹ دی جائے گی‘‘۔

اس درجے انقلاب اُس وقت آ چکا تھا اور لوگوں کی سوچ میں اس قدر تبدیلی آ چکی تھی۔

حضرت ابوہریرہh کا ایک اور واقعہ بھی ہے کہ دِمشق کی جامع مسجد سے نکلے اور ناک صاف کرنے کی ضرورت پیش آئی تو رومی کتان‘ جو بہت قیمتی کپڑا ہوتا تھا‘ اس کا رومال نکالا اور ناک صاف کر کے پھینک دیا اور پھر خود ہی کہنے لگے: اے ابوہریرہ! آج تمہارا حال یہ ہے‘ اور وہ دن بھی تھے جب تم پر فاقوں کی وجہ سے بے ہوشی طاری ہو جاتی تھی اور لوگ یہ سمجھتے تھے کہ شاید مرگی کا دورہ پڑا ہے‘ تو پاؤں رکھ کر تمہاری گردن دباتے تھے۔ اصحابِ صُفہ کا دَورعسرت اور تنگ دستی کا دَور تھا۔ بعد میں فتوحات کے نتیجے میں دولت کی ریل پیل ہوگئی۔ ظاہر بات ہے کہ جب اس طور سے دنیا عام ہوئی تو پھر لوگوں کے اندازِ فکر میں بھی تبدیلی آ گئی۔ حضور ﷺ نے فرمایا تھا: ((لَا الْفَقْرُ اَخْشٰی عَلَیْکُمْ......)) ’’اے مسلمانو! مجھے تم پر فقر اور احتیاج کا کوئی خوف نہیں ہے (فقر اور احتیاج میں تو اللہ یاد آتا ہے‘ اللہ کی طرف رجوع ہوتا ہے۔) مجھے اندیشہ ہے تو اس کا کہ دنیا کے خزانے تمہارے پاؤں میں آئیں گے اور پھر تم اس دنیا کی وجہ سے ایک دوسرے کی گردنیں کاٹو گے‘‘۔

ایں متاعِ بندہ و مِلکِ خداست

﴿ وَاَنۡفِقُوۡا مِمَّا جَعَلَکُمۡ مُّسۡتَخۡلَفِیۡنَ فِیۡہِ ؕ﴾ ''اور انفاق کرو اس میں سے جس پر اللہ نے تمہیں خلیفہ بنایا ہے''۔ یہ الفاظ اس اعتبار سے بھی فکر انگیز ہیں کہ ان میں ہماری حیثیت معین کی گئی ہے۔ پہلے تو فرمایا کہ تمہیں خلافت دی گئی ہے' اپنے آپ کو مالک نہ سمجھ بیٹھنا۔ نہ تم مَلِک ہو نہ مالِک ہو' مالک حقیقی بھی اللہ اور مَلِکِ حقیقی بھی وہی ہے۔ تمہیں تو خلافت دی گئی ہے' تم نائب ہو' تم custodian ہو' تم امین ہو' تم اللہ کے حکم کی تنفیذ کرنے والے ہو۔ یہ مفہوم لفظ ''استخلاف'' میں پنہاں ہے۔ پھر یہاں اسم مفعول کا صیغہ ''مُسۡتَخۡلَف'' آیا' کہ یہ خلافت بھی تم نے خود حاصل نہیں کی ہے' بلکہ اللہ نے تمہیں عطا کی ہے۔ مزید یہ کہ ﴿مِمَّا جَعَلَکُمۡ مُّسۡتَخۡلَفِیۡنَ فِیۡہِ ؕ﴾ میں ''مُسۡتَخۡلَفِیۡنَ'' مفعول بہٖ بن کر آیا ہے' یعنی تم مجعول ہو۔ درحقیقت تمہاری تو کوئی حیثیت ہے ہی نہیں' اس نے تمہیں بنایا ہے خلافت دیئے ہوئے (مُسۡتَخۡلَفِیۡنَ) اُن چیزوں میں جو کہ اس نے تمہیں دی ہیں۔ ان میں تمہارا جسم ہے' تمہاری توانائی ہے' تمہاری ذہانت و فطانت ہے' تمہاری دُوربینی اور دُور اندیشی ہے' تمہارا وقت ہے' تمہاری صحت ہے' تمہاری قوتِ کار ہے' تمہاری عمر ہے' خاص طور پر تمہاری جوانی کی عمر ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے حضور ابنِ آدم کے قدم اُس وقت تک اپنی جگہ سے ہل نہیں سکیں گے جب تک اس سے پانچ چیزوں کے بارے میں پوچھ گچھ نہ کر لی جائے:

عَنۡ عُمُرِہٖ فِیۡمَا اَفۡنَاہُ؟ وَعَنۡ شَبَابِہٖ فِیۡمَا اَبۡلَاہُ؟ وَعَنۡ مَالِہٖ مِنۡ اَیۡنَ اکۡتَسَبَہٗ وَفِیۡمَ اَنۡفَقَہٗ؟ وَمَاذَا عَمِلَ فِیۡمَا عَلِمَ؟ (سنن الترمذی' فی صفۃ القیامۃ' باب ۱)

''(۱) اس کی عمر کے بارے میں کہ کہاں گنوائی؟ (۲) اس کی جوانی کے بارے میں کہ کہاں لٹائی؟ (۳) اس کے مال کے بارے میں کہ کہاں سے کمایا؟ (۴) اور کہاں خرچ کیا؟ (۵) اور جو علم حاصل کیا اس پر کتنا کچھ عمل کیا؟''

دیکھئے عمر کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور اس کے بارے میں دو سوال ہیں۔ ''جو عمر ہم نے تمہیں دی تھی وہ کہاں گنوائی؟ اور خاص طور پر جوانی کہاں لگائی؟'' معلوم ہوا کہ یہ ساری چیزیں وہ ہیں جو اللہ نے ہمیں دی ہیں اور اُس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ان سب چیزوں میں سے اس کی راہ میں انفاق کریں۔

آگے فرمایا: ﴿ فَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَاَنۡفَقُوۡا لَہُمۡ اَجۡرٌ کَبِیۡرٌ ﴿۷﴾ ﴾ اب جب یہ دو تقاضے ''ایمان اور انفاق'' سامنے آ گئے' تو جو بھی تم میں سے ان دونوں تقاضوں کو پورا کر دیں ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔ نوٹ کیجیے کہ یہاں اجر کے ساتھ ''کبیر'' کی صفت آئی ہے۔ آگے چل کر گیارہویں آیت کے آخر میں' جس پر دوسرے حصے کی آیات ختم ہو رہی ہیں' ''اَجۡرٌ کَرِیۡمٌ'' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ اجر کی دو صفات ہیں' دو dimensions ہیں۔ یعنی ایک تو مقدار کے اعتبار سے یہ اجر بہت زیادہ ہو گا' دوسرے یہ کہ جب یہ اجر دیا جائے گا تو اس میں عزت افزائی کا پہلو بھی ہو گا۔ ورنہ عام طور پر تو یہ ہوتا ہے کہ ''اَلۡیَدُ الۡعُلۡیَا خَیۡرٌ مِنَ الۡیَدِ السُّفۡلٰی'' کے مصداق لینے والا محسوس کرتا ہے کہ میری حیثیت کچھ کم ہوئی ہے' گری ہے' لیکن نہیں! اللہ کی طرف سے جب اجر ملے گا تو اس میں اکرام اور اعزاز ہو گا۔ وہ اجر کبیر بھی ہو گا اور اجر کریم بھی ہو گا۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں جن چیزوں میں مُستخلَف بنایا ہے اگر یہ سب کچھ بھی ہم اللہ کی راہ میں خرچ کر دیں تب بھی اس زعم میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ ہم نے کوئی بڑا تیر مارا ہے اور ہم کسی بہت بڑی بلندی تک پہنچ گئے ہیں' بلکہ اس پر بھی اللہ کا احسان ماننا چاہیے کہ اس نے ہمیں اس کی توفیق دی۔ اگر اس کی راہ میں سب کچھ بھی دے دیا تو یہ تمہارا اپنا تو تھا ہی نہیں' دیا ہوا اسی کا تھا۔ بقول غالب ؎

جان دی' دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

اگر تم نے اسی کی دی ہوئی شے اس کو لوٹا دی اور اسی کا دیا ہوا مال اس کے قدموں میں ڈال دیا تو کیا کمال کیا؟ اس حوالے سے شیخ سعدیؒ کے دو اشعار بہت ہی خوبصورت ہیں ؎

شکرِ خدائے کن کہ موفَّق شدی بخیر
ز انعام و فضلِ خود نہ معطل بداشتت

یعنی اللہ کا شکر ادا کرو کہ خیر کے لیے تمہیں اس کی جانب سے توفیق ملی ہے۔ اللہ نے تمہیں اپنے انعام اور فضل سے محروم نہیں کیا، معطل نہیں کیا۔

اس میں لفظ ''موفَّق'' توفیق سے اسم المفعول ہے، یعنی کہ تم موفَّق ہو، تمہیں توفیق بھی اسی کی دی ہوئی ہے۔

دوسرا شعر ہے: ؎

منّت منہ کہ خدمت سلطاں ہمیں کنی
منّت شناس از و کہ بخدمت بداشتت

تم بادشاہ پر اپنا احسان نہ دھرو کہ تم اس کی خدمت کر رہے ہو، بلکہ بادشاہ کا احسان مانو کہ اس نے تمہیں اپنی خدمت کا موقع عطا کیا۔ ایسے ہی تم اللہ کے اوپر اپنا احسان نہ دھرو، بلکہ اس کا احسان مانو!

ایمان کی زوردار دعوت

آگے فرمایا: ﴿وَمَالَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ﴾ ''تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم ایمان پختہ کیوں نہیں رکھ رہے اللہ پر؟'' اب نوٹ کیجیے کہ یہاں ایمان کون سا درکار ہے۔ یہ بات میں پرکار کی مثال سے آپ کو سمجھا تا ہوں کہ جیسے ایک پرکار کے دونوں بازو باہم جڑے ہوئے ہوتے ہیں اسی طرح آیت ۷ میں ایمان اور انفاق کے الفاظ جڑ کر ایک جگہ آئے ہیں۔ آگے دو دو آیتوں میں انہیں کھولا گیا ہے، جیسے پرکار کے بازو کھل جاتے ہیں، چنانچہ دو آیتیں ایمان اور دو آیتیں انفاق پر آئی ہیں۔ یہی پرکار سورۃ التغابن میں مزید کھلتی ہے جو سلسلۂ مُسبحات کی آخری سورت ہے۔ وہاں یہی مضمون دس آیات میں آیا ہے۔ آیت ۸ سے وہاں یہی دعوت ایمان شروع ہوئی ہے بایں الفاظ: ﴿فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾ یہاں ایک آیت میں دعوتِ ایمان ہے جبکہ وہاں سورۃ التغابن میں یہ دعوت تین آیات میں ہے۔ اس کے بعد یہ سوال کہ کون سا ایمان درکار ہے، اس کی وضاحت وہاں پانچ آیتوں میں کی گئی ہے۔ پہلی بات یہ کہ اس میں تسلیم و رضا کی کیفیت ہو: ﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ یہاں ان آیات کا ترجمہ اور وضاحت کیے بغیر صرف حوالے دیے جا رہے ہیں، اس لیے کہ ہمارے منتخب نصاب کے دروس میں سورۃ التغابن پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ تو پہلی بات یہ کہ تسلیم و رضا والا ایمان ہو۔ اس ایمان کا دوسرا پہلو ہے اطاعت۔ اس کے بارے میں فرمایا: ﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰي رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ﴾ اگر اطاعت کاملہ نہیں تو ایمان کہاں ہے! اللہ کو مانتے ہو اور اطاعت نہیں کرتے؟ رسول کو مانتے ہو اور اس کا حکم نہیں مانتے، اس کا اتباع نہیں کرتے؟ چہ معنی دارد؟ تیسری بات یہ کہ توکل صرف اسی پر ہو: ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ وَعَلَي اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ چوتھی بات یہ کہ دنیا میں جن سے بھی فطری، طبعی اور جبلی محبتیں ہیں، یوں محسوس کرو کہ ان محبتوں میں تمہارے لیے دشمنی مضمر ہے، یہ potential enemies ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ﴾ (آیت ۱۴) یہی محبتیں ہیں جو اڑنگا لگاتی ہیں اور ان کی وجہ سے انسان اوندھے مُنہ گرتا ہے۔ یہی محبتیں ہیں جو اگر حد سے تجاوز کر جائیں تو انسان حرام میں مُنہ مارتا ہے، اللہ کے حقوق کو بھول جاتا ہے۔ ساری توانائیاں آل اور اولاد کے لیے کھپا دیتا ہے اور اللہ کے لیے تو اس کے پاس باقی کچھ رہتا ہی نہیں، کیا خرچ کرے گا، کیا کھپائے گا؟ اپنے وقت، اپنی صلاحیتوں اور اپنی قوتِ کار کی ساری پونجی تو صرف دنیا بنانے کے لیے اور اپنے اہل و عیال کے لیے بہتر سے بہتر سہولتیں حاصل کرنے کے لیے صرف ہو رہی ہے۔ اگلی آیت میں دوبارہ فرمایا: ﴿اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۭ﴾ (آیت ۱۵) ''تمہارے اموال و اولاد تو (تمہارے حق میں) فتنہ ہیں''۔ پانچ آیتوں میں اس ایمان حقیقی کے ثمرات بیان کرنے کے بعد پھر ایک آیت میں ان کو دوبارہ سمویا گیا اور اس کے ساتھ ہی انفاق کا

ذکر بھی آ گیا۔ یوں سمجھئے کہ وہ پرکار اب پوری طرح کھل رہی ہے۔ چنانچہ پرکار کا دوسرا سرا کیا ہے! فرمایا:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ π اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ Θ﴾

اسی طرح (سورۃ الحدید میں) ایمان اور انفاق پر مشتمل ساتویں آیت کی پرکار جو یہاں بند تھی، اگلی چار آیتوں میں ذرا کھل گئی ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ﴾ تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم کیوں نہیں ایمان رکھتے اللہ پر؟ وہ ایمان جو حقیقی ایمان ہے، اس پر تمہارا دل کیوں نہیں ٹھکتا؟ یہ زجر یا ملامت کا انداز ہے۔ آپ دیکھئے تین باتیں دہرائی گئیں: ﴿وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ﴾ اس سے بڑی بدنصیبی کیا ہوگی کہ بنفسِ نفیس اللہ کے رسولؐ تمہیں دعوت دے رہے ہیں اور تم اس سے اعراض کر رہے ہو؟ ایک طرف تو یہی سب سے بڑی خوش نصیبی ہے کہ اللہ کے رسول بذاتِ خود تمہیں دعوتِ ایمان دے رہے ہیں، لیکن اگر اس وقت بھی کوئی محروم رہ گیا تو بتائیے کہ اس سے بڑا بدنصیب کون ہوگا؟ ظاہر بات ہے کہ مدینہ کے اندر منافق بھی موجود تھے جو محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت سے بھی نہ متاثر ہوئے، نہ فیض یاب ہوئے۔ جو شے بجلی اور حرارت کے لیے غیر مُوصل (bad conductor) ہو، آپ کتنے ہی جتن کر لیں اس میں سے نہ حرارت گزرے گی نہ برقی رو گزرے گی۔ تو یہ بدنصیبی کی انتہا ہے۔ یہ وہی انداز ہے جو بعض احادیث میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ((...... وَاَنَا بَيْنَ اَظْهُرِكُمْ)) ''درانحالیکہ ابھی میں تمہارے مابین موجود ہوں (پھر بھی تمہارا یہ حال ہے!)'' دوسرے یہ کہ رسول ﷺ کس بات کی دعوت دے رہے ہیں! ﴿لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ﴾ تمہارے اپنے ربّ پر ایمان کی دعوت دی جا رہی ہے، کسی غیر پر ایمان کی دعوت تو نہیں دی گئی۔ تمہیں تمہارے اپنے پالن ہار، پروردگار، تمہارے خالق، تمہارے رازق پر ایمان کی دعوت دی جا رہی ہے۔ تیسری بات یہ فرمائی کہ ﴿وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ H﴾ ''اور وہ تم سے قول و قرار لے چکا ہے، اگر تم واقعتاً مؤمن ہو''۔

ان دونوں آیتوں کے بارے میں، جیسا کہ میں اس سے قبل بیان کر چکا ہوں، اگر ہم خطاب کے الفاظ پر نگاہ جمائیں گے تو اس خطاب میں مسلم و غیر مسلم دونوں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ ''اٰمِنُوْا'' ''ایمان لاؤ'' کے مخاطبین کمزور اہل ایمان بھی ہو سکتے ہیں اور کافر و مشرک بھی، جو ایمان سے بالکل محروم تھے۔ لیکن سیاق و سباق معین کر رہا ہے کہ یہاں گفتگو مسلمانوں سے ہے، غیر مسلموں سے نہیں ہے۔ اسی طرح اس آیت میں بھی لفظی طور پر ''میثاق'' کے دو مفہوم مراد لیے جانے کا امکان موجود ہے۔ بالفرض اگر یہاں پر مخاطب کوئی غیر مسلم ہے، یا وہ شخص جو ابھی اپنے ایمان کا اعلان و اعتراف نہیں کر رہا، تو یہاں ﴿وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ﴾ سے ''میثاق الست'' مراد ہوگا، یعنی اس دنیا میں آنے سے پہلے وہ تم سے میثاق لے چکا، بایں الفاظ: ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۚ﴾ (الاعراف:۱۷۲)۔ اب یہاں ﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۱﴾ میں ایمان کا لفظ اپنے اصطلاحی مفہوم میں نہیں لیا جائے گا، بلکہ ایمان کا لفظی معنی یعنی تصدیق مراد لیا جائے گا کہ اگر تم تسلیم کرو! اپنی فطرت کی گہرائیوں میں جھانکو تو تمہیں آثار نظر آ جائیں گے۔ ایک مرتبہ اے کے بروہی صاحب نے ملاقات میں مجھے کسی فلسفی کا ایک قول سنایا تھا۔ وہ فلسفی گویا خالق کی طرف سے یہ تعبیر کر رہا ہے:

> "You would not have searched for me unless you had possessed me in the very beginning".

یعنی اگر بالکل آغاز ہی میں تمہارا میرے ساتھ ایک تعلق قائم نہ ہوا ہوتا تو تم مجھے ہرگز تلاش نہ کرتے۔

انسان میں فطری طور پر اللہ تعالیٰ کی ایک طلب ہے، اس کی تلاش ہے۔ جیسے ایک دعا ہے ؎

مجھ کو ہے تیری جستجو، مجھ کو تری تلاش ہے
خالق مرے کہاں ہے تو مجھ کو تری تلاش ہے!

ہمارے ہائی سکول کے زمانے میں روزانہ صبح یہ دعا پڑھی جاتی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ انسانی اس کا ثبوت دیتی ہے۔ کیسے کیسے لوگ جنگلوں اور صحراؤں کے اندر خاک چھانتے پھرتے رہے اور پہاڑوں میں جا کر تپسیائیں کرتے رہے۔ کس لیے؟ معلوم ہوا کہ فطرت انسانی میں کوئی طلب ہے' کوئی خواہش ہے' کوئی urge ہے۔ آپ کو بھوک لگتی ہے تو آپ کھانے کی تلاش میں سرگرداں ہوتے ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ ان لوگوں کو بھی کوئی طلب تھی جو انہیں کشاں کشاں لیے پھرتی رہی اور یہ طلب درحقیقت اس بات کا مکمل ثبوت ہے جو متذکرہ بالا قول میں بیان ہوئی ہے۔ عہدِ اَلست کو قرآن مجید تو ایک عظیم الشان واقعہ کی حیثیت سے پیش کرتا ہے: ﴿اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ قَالُوۡا بَلٰی﴾ لیکن جو بھی شخص اپنی فطرت کی گہرائیوں کے اندر جھانکے گا اسے اس عہدِ اَلست کے آثار نظر آئیں گے' چاہے وہ یاد نہ آئے۔ اگرچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ مجھے یاد ہے کہ میں نے اپنے ربّ سے وہ عہد کیا تھا۔ اب ظاہر بات ہے کہ ارواح میں فرق وتفاوت تو ہے۔ وہ روح جو اللہ نے انہیں عطا کی تھی اس کے اندر وہ یادداشت برقرار رہی ہوگی۔ لیکن بہرحال اس وعدے کی یاد اگرچہ برقرار نہ رہی ہو' لیکن اس کے آثار اور اس کے اثرات فطرت انسانی میں موجود ہیں۔ ﴿وَقَدۡ اَخَذَ مِیۡثَاقَکُمۡ﴾ کے الفاظ میں اگر لفظی طور پر یہ امکان ہے تو اس کی وضاحت بھی میں نے کر دی' لیکن یہاں حقیقتاً وہ مراد نہیں ہے۔ یہاں اصل میں خطاب ان مسلمانوں سے ہے جو ضعیف الایمان ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے عرض کیا تھا کہ آج کے مسلمانوں کے لیے یہ سورتیں قرآن مجید کا سب سے زیادہ قیمتی حصہ ہیں۔ اس لیے کہ نزولِ قرآن کے وقت کا تو ضعیف ایمان بھی ہمارے آج کے ایمان کے مقابلے میں بہت بلند و بالا' بہت پختہ اور مستحکم تھا۔ آج ہمارا جو حال ہے اس کے پیش نظر ہمیں تو بہت زیادہ ضرورت ہے کہ ان آیات کو حرزِ جان بنالیں۔

﴿وَقَدۡ اَخَذَ مِیۡثَاقَکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ﴾ ''وہ تم سے قول وقرار لے چکا اگر تم مؤمن ہو!'' یہاں پر اصطلاحی ترجمہ کیجیے کہ اگر تم مؤمن ہو' تم ایمان کے دعویدار ہو پھر تو تمہارا عہد و میثاق اور قول وقرار ہو چکا۔ یہاں سورۃ التوبۃ کی آیت ۱۱۱ ذہن میں لائیے: ﴿اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَاَمۡوَالَہُمۡ بِاَنَّ لَہُمُ الۡجَنَّۃَ﴾ ''اللہ تو خرید چکا ہے اہل ایمان سے ان کی جانیں اور مال جنت کے عوض''۔ اب یہ جان و مال ان کے ہیں کہاں؟ اب تو گویا ان کے پاس محض ایک امانت کے طور پر رکھے ہوئے ہیں کہ جیسے ہی مطالبہ ہو حاضر کر دیئے جائیں۔ یہ ہے درحقیقت وہ قول و قرار' کہ اگر تم مؤمن ہو پھر تو تم اپنی جان اور مال فروخت کر چکے' اب وہ تمہاری ملکیت ہے ہی نہیں۔ اوّلاً تو اصولی طور پر تم اس کے مالک نہیں' پھر یہ کہ اس قول وقرار سے اس کی مزید توثیق ہوگئی۔ اب یہ تمہارے پاس امانت ہے۔ بڑا پیارا شعر ہے: ؎

وبالِ دوش ہے سر' جسمِ ناتواں پہ مگر
لگا رکھا ہے ترے خنجر و سناں کے لیے

گویا Life is a liability۔ واقعہ یہ ہے کہ بسا اوقات انسان محسوس کرتا ہے کہ یہ زندگی ایک بوجھ ہے' لیکن بندۂ مؤمن یہ سمجھتا ہے کہ مجھے صرف اللہ اور اس کے دین کے لیے یہ بوجھ اٹھائے رکھنا ہے۔ اس زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے بھی جو حق اسے میں دے رہا ہوں وہ صرف حضورﷺ کی اس ہدایت کی بنا پر ہے کہ: ((وَاِنَّ لِنَفۡسِکَ عَلَیۡکَ حَقًّا وَاِنَّ لِزَوۡجِکَ عَلَیۡکَ حَقًّا)) ''یقیناً تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے''۔ مؤمن کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی زندگی کا جو اصل مقصد ہے اور جو اُس کی اصل منشا ہے جس کے لیے وہ اسے preserve کر رہا ہے' وہ وقت آئے کہ وہ یہ دے کر فارغ ہو جائے' جیسا کہ سورۃ الاحزاب میں ارشاد ہوا: ﴿فَمِنۡہُمۡ مَّنۡ قَضٰی نَحۡبَہٗ وَمِنۡہُمۡ مَّنۡ یَّنۡتَظِرُ﴾ (آیت ۲۳) ''ان میں وہ بھی ہیں جو اپنی نذر پیش کر چکے (شہید ہو چکے) اور باقی جو ہیں وہ منتظر ہیں (کہ کب موقع آئے اور ہم اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں دے کر سبکدوش ہو جائیں)۔''

ایمانِ حقیقی کا منبع وسرچشمہ —— قرآنِ حکیم

اب اس کے بعد اگر دلوں کو ٹٹولیں اور محسوس ہو کہ واقعتاً وہ حقیقی ایمان تو موجود

نہیں ہے' تو سوال ہے کہ کہاں جائیں؟ ع کس طرف جاؤں' کدھر دیکھوں' کسے آواز دوں؟ وہ کون سا بازار ہے جہاں سے ایمان کی جنسِ گراں مایہ ملتی ہے؟ اس کی طرف بھی اشارہ کر دیا: ﴿هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِهٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ؕ﴾ ''وہی تو ہے (اللہ) جو نازل فرما رہا ہے اپنے بندے پر روشن آیات تاکہ تمہیں نکال لائے اندھیروں سے روشنی کی طرف''۔ یہاں دیکھئے 'بجائے ''رسول'' کے ''عبد'' کا لفظ آیا ہے۔ یہ میں نے بارہا عرض کیا ہے' اس وقت صرف اشارہ کر رہا ہوں کہ جہاں بھی اللہ کا اپنے رسول کے لیے شفقت اور عنایت خصوصی کا انداز ہوتا ہے وہاں نسبتِ رسالت کی بجائے نسبتِ عبدیت کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ جیسے سورۂ بنی اسرائیل کے آغاز میں فرمایا: ﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا﴾ اور سورۃ الکہف کا آغاز ہوا ان الفاظ مبارکہ سے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ؕ﴾ وہی انداز یہ ہے: ﴿هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِهٖ﴾ لیکن یہ سمجھ لیجیے کہ ''عبدٌ'' (بندہ) اور چیز ہے اور ''عبدہٗ'' (اُس کا بندہ) اور چیز ہے۔ بقول اقبال ؎

عبد دیگر عبدہٗ چیزے دگر
ما سراپا انتظار او منتظر!

کہنے کو تو ہم بھی کہتے ہیں کہ ہم اس کے بندے ہیں' نام بھی عبداللہ رکھ لیتے ہیں' لیکن عبدیت کا حق ادا کرنا آسان کام نہیں ہے۔ تو فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِهٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ﴾ وہی ہے جو نازل فرما رہا ہے اپنے بندے (ﷺ) پر وہ آیات جو بیّن ہیں' روشن ہیں۔ بیّن اس شے کو کہتے ہیں جو از خود واضح اور از خود روشن ہو' اسے کسی اور وضاحت کی ضرورت نہ ہو' اسے کسی دلیل خارجی کی حاجت نہ ہو۔ جیسے ہم کہتے ہیں ع ''آفتاب آمد دلیلِ آفتاب!'' یعنی سورج طلوع ہو گیا تو اب سورج کے وجود کے ثبوت کے لیے کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تو خود اپنے وجود پر سب سے بڑی برہان اور دلیل قاطع ہے۔ قرآن مجید اپنی آیات کے لیے اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ (روشن اور بیّن آیات) کی ترکیب استعمال کرتا ہے۔ سورۃ التغابن میں تو قرآن حکیم کے لیے لفظ ہی ''نور'' آیا ہے: ﴿فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا﴾ ''پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس نور پر جو ہم نے نازل فرمایا''۔ یہ از خود نور ہے اور درحقیقت اسی سے نورِ ایمان پیدا ہوتا ہے۔ یہ نورِ وحی' نورِ فطرت کے ساتھ مل کر نورِ ایمان پیدا کرتا ہے۔ ہمارے اس منتخب نصاب کے حصہ دوم میں سورۃ النور کی آیات کے ضمن میں یہ بحث تفصیل سے آئی ہے کہ ﴿نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ﴾ میں ایک نورِ فطرت ہے اور ایک نورِ وحی' ان دونوں کے امتزاج سے نورِ ایمان وجود میں آتا ہے۔

یہ بات پہلے بیان ہو چکی ہے کہ قرآن مجید میں نور کا لفظ ہمیشہ واحد آتا ہے' جبکہ ''ظلمات'' ہمیشہ جمع کی صورت میں آتا ہے۔ چنانچہ سورۃ النور میں بھی الفاظ آئے ہیں: ﴿ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ﴾ ''اندھیرے ہیں تہہ بر تہہ''۔ اس لیے کہ نور ایک بسیط حقیقت ہے اور تاریکی (darkness) کے بے شمار shades ہیں' مثلاً کفر' شرک' الحاد' انسانی حاکمیت کا تصور' مادہ پرستی' شہوت پرستی' دولت پرستی' شہرت پرستی' قوم پرستی' خود پرستی' نفس پرستی اور اس طرح کی بے شمار پرستشیں۔ یہ سب ظلمات ہی کے مختلف سائے ہیں' یہ تمام اندھیرے ہیں اور ان تمام اندھیروں سے نکال کر نورِ ایمان میں لانے والی شے قرآن حکیم کی آیات بیّنات ہیں۔

یہاں آیات کے باہمی ربط' ان کی ترتیب اور سیاق و سباق کے حوالے سے یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ جو ایمان حقیقی مطلوب ہے اس کا واحد منبع اور سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ ایمان کے دعوے داروں سے کہا جا رہا ہے کہ تمہارے دلوں میں حقیقی ایمان کیوں موجود نہیں ہے جب کہ یہ ایمان کا منبع و سرچشمہ موجود ہے؟ عین کنویں کے کنارے پر کھڑے ہوئے پیاسے کیوں ہو؟ اور اس کنویں کی نشان دہی ان الفاظ میں کر دی گئی: ﴿هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِهٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ﴾ اس سے واضح ہو رہا ہے کہ ایمان حقیقی کا منبع اور سرچشمہ

قرآن مجید ہے۔

۱۹۹۱ء میں ’’حقیقت ایمان‘‘ کے موضوع پر محاضرات میں مَیں نے نظری اعتبار سے یہ بات مانی تھی اور آج بھی مانتا ہوں کہ ایک وہ ایمان ہے جس کے لیے آج کی اصطلاح blind faith ہے۔ یہ ایمان بھی اگر یقین کے درجے کو پہنچ جائے گا تو اس شخصِ متعلق کے لیے مفید ہوگا‘ مؤثر ہوگا۔ یہ blind faith انسان کو محض صحبت صالحہ سے بھی حاصل ہو جاتا ہے‘ جیسے آگ کے سامنے بیٹھیں گے تو آپ کو حرارت مل جائے گی‘ صاحب یقین کی صحبت ہوگی تو آپ کو یقین حاصل ہو جائے گا۔ اس میں آپ کے فہم اور شعور کا کوئی حصہ نہیں‘ یہ تو درحقیقت ایک طبعی عمل (physical phenomenon) ہے۔ اسی طرح ایک ایمان عمل سے بھی پیدا ہوتا ہے۔ آپ دین کے جملہ احکام پر عمل شروع کر دیجیے۔ فرض کیجیے کہ ایک شخص نسلی مسلمان ہے‘ ابھی ایمانِ حقیقی اسے حاصل نہیں ہے‘ لیکن جو بھی فرائض دینی ہیں ان کو بجا لا رہا ہے تو اس سے بھی یقیناً ایک reflection ہوگی اور قلب میں یقین کی سی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ تو عمل سے اور صحبتِ صاحبِ ایمان سے بھی ایمان پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہاں ایمان کا ذکر جس سیاق وسباق میں ہو رہا ہے وہ درحقیقت حکومت الٰہیہ کے قیام کے لیے شرطِ اوّل ہے‘ یعنی انقلاب برپا کرنا اور اَفراد کو نہیں بلکہ نظام کو بدلنا ہے۔

اس کے لیے ایک اصول ذہن نشین کر لیجیے کہ انسانی زندگی کے اجتماعی نظام میں معاشرہ ایک شخص واحد کی طرح behave کرتا ہے۔ ایک فرد کے اعضاء وجوارح کو کنٹرول کرنے والی شے اس کا دماغ ہے۔ ہاتھ کسی شے کو پکڑ سکتا ہے‘ اس میں یہ طاقت ہے‘ لیکن کس شے کو پکڑے اور کس کو نہ پکڑے‘ اس کا فیصلہ ہاتھ خود نہیں کر سکتا‘ بلکہ ذہن کرتا ہے۔ اسی طرح پاؤں میں آپ کو لے کر چلنے کی صلاحیت ہے‘ مگر وہ کدھر کو جائے‘ کدھر کو نہ جائے‘ اس کا فیصلہ پاؤں خود نہیں کر سکتا‘ بلکہ ذہن کرتا ہے۔ اسی طرح ہر انسانی معاشرے میں ایک brain trust ہوتا ہے۔ یہ وہاں کی ذہین اقلیت (intelligentsia یا intellectual elite) ہے جو brain trust کی حیثیت رکھتی ہے اور اس معاشرے کا رُخ معین کرتی ہے۔ اگر یہ ’’ذہین اقلیت‘‘ دولتِ ایمان سے محروم رہتی ہے اور آپ نے کچھ افراد کو اِدھر اُدھر ایمان کی دولت دے بھی دی‘ کچھ اصلاح ہو بھی گئی تو بھی معاشرہ بحیثیت مجموعی اس رُخ پر تبدیلی اختیار نہیں کرے گا جو آپ چاہتے ہیں۔ چنانچہ معاشرے کی بحیثیت مجموعی اصلاح کے لیے وہ ایمان درکار ہے جو علٰی وجہ البصیرت ہو۔ جیسے کہ سورۂ یوسف میں حضور ﷺ کو حکم دیا گیا: ﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ﴾ ’’کہہ دو (اے نبی ﷺ!) یہ ہے میرا راستہ‘ میں اللہ کی طرف بلا رہا ہوں‘ میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی‘‘۔ میں اپنے راستے کی طرف علٰی وجہ البصیرت بلا رہا ہوں۔ میں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں نہیں مار رہا ہوں‘ اور نہ صرف میں بلکہ وہ بھی جو میری پیروی کر رہے ہیں علٰی وجہ البصیرت میرا ساتھ دے رہے ہیں۔ تو دراصل ایسے لوگ ہوتے ہیں کہ جو انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ معاشرے کے brain trust کو transform کریں گے‘ اور جب اس کی قلب ماہیت ہوگی تو معاشرہ مجموعی طور پر تبدیلی قبول کرے گا‘ ورنہ نہیں کرے گا۔ اور اس شعوری ایمان کا منبع اور سرچشمہ صرف قرآن ہے۔ اس لیے کہ قرآن مجید ایک انسان کو ایک کل کی حیثیت سے‘ مجموعی حیثیت سے اپیل کرتا ہے۔ یہ انسان کے احساسات وجذبات کو بھی اپیل کرتا ہے اور اس کے تعقل وتفکر کو بھی۔ قرآن مجید بار بار تعقل وتفکر کی دعوت دیتا ہے: ﴿اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ [1]﴾ ’’کیا تم غور نہیں کرتے؟ (تمہیں کیا ہو گیا ہے؟)‘‘ ﴿اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ [1]﴾ ’’کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟‘‘ قرآن مجید میں بڑے سے بڑے فلسفی کے لیے بھی ہدایت موجود ہے اور ایک عام انسان کے لیے‘ بھی اس میں ہدایت ہے۔ اس حوالے سے درحقیقت انقلاب کے لیے‘ حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے لیے‘ معاشرے کو بدلنے کے لیے جو ایمان درکار ہے اُس کا واحد منبع اور سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔

اس سلسلۂ کلام میں بھی اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے بایں الفاظ: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ

يُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِہٖۤ اٰیٰتٍۢ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَکُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ؕ وَاِنَّ اللّٰہَ بِکُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۹﴾ ''وہی ہے (اللہ تعالیٰ) جو اپنے بندے (محمد ﷺ) پر واضح آیات نازل فرماتا ہے' تاکہ تمہیں اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لائے۔ اور یقیناً اللہ تمہارے حق میں رؤف بھی ہے' رحیم بھی ہے''۔ یہ دونوں صفات رء و ف اور رحیم اس سورۂ مبارکہ کی آیت ۲۷ میں ''رأفۃ'' اور ''رحمۃ'' کے الفاظ میں آئی ہیں۔ ﴿وَجَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْہُ رَاْفَۃً وَّرَحْمَۃً ؕ﴾ ''اور جن لوگوں نے ان (عیسٰی علیہ السلام) کی اتباع کی ان کے دلوں میں ہم نے نرم دلی اور رحم ڈال دیا''۔ یہاں پر ذرا اچھی طرح جان لیجیے کہ لفظ ''رَءُ و ف'' قرآن مجید میں گیارہ مرتبہ آیا ہے اور ان میں سے نو مرتبہ لفظ ''رَحِیْمٌ'' ہی کے ساتھ جڑ کر آیا ہے۔ قرآن مجید میں کسی اور صفت کے ساتھ اس لفظ (رَءُ وْ فٌ) کی combination نہیں ہے' البتہ بعض مقامات پر تنہا آیا ہے' جیسے ﴿رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ﴾۔ یہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ یہ دس مرتبہ تو اللہ تعالیٰ کے لیے آیا ہے اور ایک مرتبہ سورۃ التوبۃ کی آیت ۱۲۸ میں محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے لیے آیا ہے بایں الفاظ: ﴿بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۲۸﴾﴾ ''مؤمنوں پر نہایت مہربان اور رحم والا ہے''۔

''رأفت'' اور ''رحمت'' میں جو ایک نسبت اور رشتہ ہے اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اگرچہ ہم اللہ تعالیٰ کے لیے یہ لفظ استعمال کرتے ہوئے جھجک محسوس کریں گے کہ اللہ تمہارا ہمدرد ہے' یہ لفظ اللہ کے شایانِ شان نہیں ہے' لیکن رأفت کی اصل حقیقت ہمدردی ہی ہے۔ مشہور شعر ہے ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے!

ایک سلیم الفطرت انسان کے دل میں کسی کو تکلیف اور مصیبت میں دیکھ کر جو احساس ہوتا ہے اور وہ اس کے درد کو اپنے اندر محسوس کرتا ہے' اسی کو ہم رأفت یا ہمدردی کہتے ہیں۔ درحقیقت جس شخص کے اندر رأفت کا وصف ہوگا وہی اس مصیبت زدہ شخص کے لیے بھلائی کی کوشش کرے گا' اس کے لیے کوئی relief فراہم کرنے اور اسے کسی طریقے سے مصیبت سے نجات دلانے کی کوشش کرے گا۔ پہلے ایک احساس ہوگا تب اس کا نتیجہ برآمد ہوگا۔ تو ''رأفت'' اصل میں وہ عکس ہے کہ جو کسی کے دکھ اور درد کو دیکھ کر باطن میں پڑتا ہے اور اس کا نتیجہ ''رحمت'' ہے۔ اس احساس کے نتیجے میں اب اس کے درد کو رفع کرنے کے لیے' اس کے مسئلہ اور مشکل کو حل کرنے کے لیے جو کوشش ہوگی وہ درحقیقت رحمت کا مظہر ہے ۔ گویا ''رأفت'' اور ''رحمت'' کا تعلق باہم sensory اور motor کا سا ہے' جو کہ فزیالوجی کی اصطلاح ہے۔ کسی بھی معاملے میں پہلے sensation ہوتی ہے۔ اگر کسی چیونٹی نے آپ کے ہاتھ پر کاٹا ہے تو پہلے sensation کے ذریعے دماغ کو اس کی اطلاع ملی اور وہاں سے motor کے ذریعے حکم آیا تو آپ نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا کہ یہاں تو کوئی چیز ہے جو تجھے تکلیف پہنچا رہی ہے۔ یہی معاملہ رأفت اور رحمت یا رؤف اور رحیم کے مابین ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہمیشہ لفظ رء و ف لفظ رحیم سے پہلے آیا ہے۔ جیسے ہم نے ''العزیز'' اور ''الحکیم'' کی نسبت کو سمجھا تھا کہ ایک طرف اس کے پاس اختیارِ مطلق (authority) ہے' اس پر کوئی checks and balances نہیں ہیں' دوسری طرف اس کی حکمت کامل ہے' اور اس کا اختیارِ مطلق اس کی حکمتِ کاملہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے' اسی طرح اللہ تعالیٰ رؤف بھی ہے اور رحیم بھی ہے۔ اپنی زبان میں ہم الفاظ استعمال کر سکتے ہیں کہ نہایت شفیق اور مہربان ہے۔

اب یہاں جو بات قابل غور ہے وہ یہ کہ اللہ کی رحمت کا مظہر اعظم اور مظہر اتم یہ قرآن ہے۔ سورۃ الرحمٰن کی پہلی چار آیات میں دراصل اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿اَلرَّحْمٰنُ ۙ﴿۱﴾ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ؕ﴿۲﴾﴾ ''نہایت رحم والا ہے جس نے قرآن سکھایا''۔ اب دیکھئے ان میں کیا نسبت ہے! یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی شانِ رحمانیت کا مظہر ہے کہ اس نے قرآن سکھایا۔ ''رَحْمٰن'' ''فَعْلان'' کے وزن پر اسم مبالغہ ہے کہ جس میں کوئی بھی کیفیت پورے جوش وخروش کے ساتھ ہوتی ہے' ایک طوفانی کیفیت

ہوتی ہے۔تو درحقیقت اللہ تعالیٰ کی رحمت کی طوفانی اور ہیجانی کیفیت کا مظہر اَتم یہ قرآن ہے۔اس لیے کہ یہ ہدایت ہے اور رحمت ہے۔اسی سے تمہاری عاقبت یعنی آخرت کی زندگی سنورے گی جو کہ اصل اور ابدی زندگی ہے۔یہی نور ہے‘ یہی راستہ دکھانے والا ہے۔جیسے کہ حضور کریم ﷺ سے ایک بہت ہی پیاری اور جامع دعا مروی ہے جس میں ہم کہتے ہیں ...... وَاجۡعَلۡهُ لَنَا اِمَامًا وَّنُوۡرًا وَّهُدًى وَّرَحۡمَةً کہ اے ہمارے پروردگار! اس قرآن مجید کو ہمارا امام بنا دے‘ اسے ہمارے لیے نور‘ ہدایت اور رحمت بنادے۔

انفاق فی سبیل اللہ کی زوردار دعوت

آگے فرمایا: ﴿وَمَالَكُمۡ اَلَّا تُنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ﴾ ’’تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ خرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں‘‘ ﴿وَلِلّٰهِ مِیۡرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ﴾ ’’حالانکہ (تم خوب جانتے ہو کہ) آسمانوں اور زمین کی کُل میراث بالآخر اللہ کے لیے رہ جائے گی‘‘۔اگرچہ اس آیت پر اصل گفتگو تو اگلی نشست میں ہو گی‘ لیکن نوٹ کر لیجیے کہ ایک تو ہم پہلے سمجھ چکے ہیں کہ سورۃ الحدید کی آیت ۷ میں جو انفاق کا لفظ آیا ہے اس سے مراد ’’انفاق فی سبیل اللہ‘‘ ہے۔اور دوسرے یہ کہ اس سے مراد ’’انفاقِ مال‘‘ بھی ہے اور ’’بذلِ نفس‘‘ بھی ہے۔اب یہاں لفظ ’’قتال‘‘ کے حوالے سے اس کی تشریح آ رہی ہے۔ایک حدیث نبویؐ کے حوالے سے لفظ ’’میراث‘‘ کو سمجھئے۔حضور ﷺ فرماتے ہیں: ’’ابن آدم کہتا ہے کہ میرا مال‘ میرا مال! لیکن اے ابن آدم! تمہارے مال میں سے تمہارا اس کے سوا اور کیا ہے کہ جو تم نے کھا لیا اور ختم کر دیا‘ یا پہنا اور پرانا کر دیا‘ یا پھر جو تم نے (اپنی زندگی میں) صدقہ کر دیا اور آگے بھیج دیا‘‘۔(مسلم‘ ترمذی‘ نسائی) مسلم کی ایک دوسری روایت میں الفاظ آئے ہیں کہ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ اسے لوگوں کے لیے چھوڑ کر جانے والا ہے۔یعنی باقی جو مال ہے وہ تمہارا نہیں‘ تمہارے وارثوں کا ہے۔اسی طرح ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہؓ سے سوال کیا: ((اَیُّکُمۡ مَالُ وَارِثِهٖ اَحَبُّ اِلَیۡهِ مِنۡ مَالِهٖ؟)) ’’آپ لوگوں میں سے کون ہو گا جسے اپنے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ عزیز ہو؟‘‘ صحابہ کرامؓ نے بالکل سادگی کے ساتھ حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم میں سے کوئی ایسا نہیں جسے خود اپنا مال (وارث کے مال سے) محبوب تر نہ ہو۔اس پر حضور ﷺ نے فرمایا: ((فَاِنَّ مَالَهٗ مَا قَدَّمَ وَمَالَ وَارِثِهٖ مَا اَخَّرَ)) ’’اس کا مال تو وہ ہے جو اُس نے آگے بھیج دیا اور اس کے وارث کا مال وہ ہے جو اُس نے پیچھے چھوڑا‘‘۔(صحیح بخاری)۔ یعنی تمہارا مال تو وہی ہے جو تم اللہ کی راہ میں اپنی زندگی کے اندر خرچ کرتے ہو‘ باقی تمہارے وارث کا مال ہے جو تم جمع کر رہے ہو۔دیکھئے خرچ کرنا ایک ضرورت ہے‘ اپنے آپ کو maintain کرنا ہے‘ اپنے جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنا ہے۔سر چھپانے کے لیے کوئی ایک چھت بھی چاہیے‘ آپ کو کھانا بھی چاہیے۔اپنی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنا اپنی جگہ صحیح ہے۔اور اگر آپ نے ﴿اِنَّ صَلَاتِیۡ وَنُسُکِیۡ وَمَحۡیَایَ وَمَمَاتِیۡ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ﴾ کے مصداق اپنے آپ کو اللہ کے لیے وقف کر دیا ہو تو درحقیقت یہ سب کچھ بھی فی سبیل اللہ شمار ہو گا۔گویا جو کچھ آپ اپنی ضروریات پر صرف کر رہے ہیں وہ بھی اللہ کے لیے کر رہے ہیں۔صرف یہ بات پیش نظر رہے کہ ضرورت سے زائد کو جمع نہ کریں۔جمع صرف آسمان پر کریں‘ جیسے حضرت مسیح علیہ السلام کے ایک وعظ کا مفہوم ہے کہ زمین پر جمع نہ کرو جہاں چوری کا بھی ڈر ہے‘ ڈاکے کا بھی اندیشہ ہے‘ کیڑا بھی خراب کرتا ہے‘ دیمک بھی لگ جاتی ہے‘ بلکہ آسمان پر جمع کرو‘ جہاں نہ چوری کا ڈر‘ نہ ڈاکے کا خوف‘ نہ کیڑا خراب کر سکے۔اس لیے کہ میں تم سے صحیح کہتا ہوں کہ جہاں تمہارا مال ہو گا وہیں تمہارا دل بھی ہو گا—— مال یہاں جمع کیا ہوا ہو گا تو ظاہر ہے دل بھی یہیں پر لگا ہو گا۔دنیا سے جانے کو دل نہیں چاہے گا اور فرشتے دھکے دے دے کر لے کر جائیں گے۔آدمی آگے جانے کے لیے تیار نہیں ہو گا۔بلکہ حدیث میں الفاظ آتے ہیں کہ جیسے کانٹے دار سیخ کے اوپر سے کباب اتارا جاتا ہے اسی طریقے سے ایسے لوگوں کی روحیں کھینچی جائیں گی۔ان کے برعکس ایک وہ ہیں جو جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔بقول اقبال ؎

نشانِ مَردِ مؤمن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم بر لبِ اوست!

اس لیے کہ وہ اپنا سب کچھ تو پہلے ہی آگے بھیج چکے ہیں۔ان کے لیے تو موت گویا ایک خوشخبری ہے۔انہوں نے تو زندگی بھر کی کمائی وہاں آسمانوں پر جمع کی ہوئی ہے۔ان کے لیے تو موت ایسے ہوگی جیسے کہ ایک بند مشکیزے میں سے ایک بوند پانی کی ٹپک جائے۔ان کے لیے یہاں سے نقل مکانی کرنے میں کوئی ناگواری نہیں ہوگی' کوئی سختی نہیں ہوگی۔اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو ایسی موت عطا فرمائے۔آمین!

مال ودولتِ دنیا کی حقیقت

دیکھئے' جس چیز کو ہم مال کہہ رہے ہیں حضورﷺ نے مختلف احادیث مبارکہ میں اس کی حقیقت کھول کر بیان کر دی کہ مال کیا ہے؟ خرچ کیا ہے اور بچت کیا ہے؟ نفع کیا ہے اور نقصان کیا ہے؟ ''التغابن'' جو کہ ایک سورۃ کا نام ہے اس کا مطلب ہی نفع و نقصان اور ہار جیت کا فیصلہ ہے۔سورۃ التغابن میں فرمایا گیا ہے: ﴿ذٰلِکَ یَوْمُ التَّغَابُنِ﴾ کہ وہ ہوگا نفع ونقصان اور ہار جیت کے فیصلے کا دن! جو قیامت کے دن جیتا وہ حقیقت میں جیتا اور جو اُس دن ہارا وہ درحقیقت ہارا۔جو اُس دن کامیاب قرار پایا وہ اصل میں کامیاب ہے اور جو اُس دن ناکام قرار پایا وہ دراصل ناکام ہے۔

اس بارے میں ایک حدیث کا تذکرہ اس سے قبل ہمارے ان دروس میں کئی مرتبہ آیا ہے۔حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ہاں ایک بکری ذبح ہوئی' اس کا سارا گوشت اصحابِ صفہ میں تقسیم کر دیا گیا سوائے ایک شانے کے جو حضورﷺ کے لیے رکھ لیا گیا' کیونکہ اس کا گوشت حضورﷺ کو بہت مرغوب تھا۔تو جب حضورﷺ تشریف لائے اور پوچھا: ((مَا بَقِیَ مِنْھَا؟)) ''بکری میں سے کیا بچا ہے؟'' حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: مَا بَقِیَ مِنْھَا اِلَّا کَتِفُھَا ''اس میں سے کچھ نہیں بچا سوائے ایک شانے کے''۔اس پر آپؐ نے فرمایا: ((بَقِیَ کُلُّھَا غَیْرَ کَتِفِھَا)) (ترمذی' صفة القیامة والرقائق) ''بکری کا سارا گوشت (جو فی سبیل اللہ تقسیم کر دیا گیا ہے) بچ گیا ہے سوائے اس شانے کے'' کہ یہ ہم کھالیں گے تو یہ استعمال ہو کر ختم ہو جائے گا۔یہی بات حضورﷺ نے اس طرح فرمائی کہ تم کہتے ہو میرا مال' میرا مال' میرا مال! تمہارا مال وہ ہے جو تم نے کھالیا' یعنی وہ تمہارے وجود کا حصہ بنا' اس سے تمہاری ضرورت پوری ہوگئی تو واقعتاً وہ تمہارا تھا۔اس کے علاوہ تمہارا مال وہ ہے جو تم نے پہنا اور اسے بوسیدہ کر دیا' پرانا کر دیا۔یعنی جو چیز تمہاری ضرورت کی تھی وہ تم نے استعمال کی اور ختم کر دی۔باقی تمہارا مال صرف وہ ہے جو تم اپنی زندگی میں اپنے ہاتھوں آگے بھیج دیتے ہو۔اس کے علاوہ باقی سب مال وارثوں کا ہے!

سکندرِ اعظم کے بارے میں ایک کہانی سی بیان ہوتی ہے کہ اس نے یہ وصیت کی تھی کہ جب میرا جنازہ نکلے تو میرے دونوں ہاتھ کفن سے باہر نکلے ہوں' تاکہ لوگ دیکھ لیں کہ اس کی فتوحات کا سلسلہ کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا' لیکن جب اس دنیا سے رخصت ہوا ہے تو اپنے دونوں ہاتھ خالی لے کر گیا ہے' کیونکہ مال سارے کا سارا اس دنیا میں ہی رہ جاتا ہے اور پھر وارثوں کو منتقل ہو جاتا ہے۔بالآخر یہ سب کچھ اللہ ہی کی ملکیت ہے' اللہ ہی کے لیے رہ جاتا ہے۔

داخلی وخارجی حالات کے اعتبار سے درجات میں فرق وتفاوت

آگے فرمایا: ﴿لَا یَسْتَوِیْ مِنْکُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ﴾ ''تم میں سے جن لوگوں نے فتح سے پہلے خرچ کیا اور جہاد کیا (اور جنہوں نے فتح کے بعد خرچ کیا اور جہاد کیا) وہ برابر نہیں ہیں''۔آیت کریمہ کا یہ حصہ بہت اہم ہے۔ہر عمل کی ایک ظاہری شکل اور کمیت ہوتی ہے اور ایک اس کی باطنی کیفیت ہوتی ہے کہ کن حالات میں وہ عمل کیا گیا ہے۔ان دونوں اعتبارات سے عمل کے اجر وثواب میں اور اللہ کے ہاں درجے کے تعین میں زمین وآسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔دیکھئے ایک انفاق اور قتال فتح سے پہلے ہوا ہے۔اور یہاں اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ سورۂ مبارکہ کم سے کم صلح حدیبیہ کے بعد نازل ہوئی ہے۔میں حیران ہوا ہوں کہ دورِ حاضر کے بعض مفسرین نے اس سورۂ مبارکہ کے زمانہ نزول کے طور پر غزوۂ اُحد اور صلح حدیبیہ کے

مابین کا کوئی زمانہ معین کیا ہے' حالانکہ اس آیہ مبارکہ کے متذکرہ بالا الفاظ معین کر رہے ہیں کہ یہ سورۂ مبارکہ فتح کے بعد نازل ہوئی ہے۔ فتح کا اطلاق ظاہری اعتبار سے تو فتح مکہ پر زیادہ ہوتا ہے' لیکن قرآن مجید نے چونکہ صلح حدیبیہ کو بھی ''فتح مبین'' کہا ہے لہٰذا صلح حدیبیہ سے قبل تو اس سورۂ مبارکہ کے نزول کا کوئی امکان نہیں ہے۔ بہرحال فتح سے قبل اور بعد کی صورت حال میں بنیادی طور پر بہت زیادہ فرق ہے۔ اس بات کی وضاحت حضورﷺ کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے: ((بَدَاَ الْاِسْلَامُ غَرِیْبًا وَسَیَعُوْدُ کَمَا بَدَاَ غَرِیْبًا فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَاءِ)) (مسلم' کتاب الایمان) ''اسلام کا آغاز ہوا تو وہ غریب تھا' اور عنقریب یہ دوبارہ اسی غربت کی حالت کو لوٹ جائے گا جیسے یہ شروع ہوا تھا' پس خوشخبری ہے ایسے اجنبیوں کے لیے''۔ غریب سے مراد قلاش اور مفلس نہیں ہے' بلکہ غریب عربی میں ایسی شے کو کہتے ہیں جو جانی پہچانی نہ ہو' جس کا کوئی مونس و ہمدرد اور غمخوار نہ ہو۔ ہم عام طور پر کسی اجنبی کے لیے غریب الوطن کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ایک شخص اپنے وطن میں ہے تو لوگ اسے جانتے اور پہچانتے ہیں' اس کا وہاں اعتماد ہے' اس کے وہاں دوست اور رشتے دار ہیں' لیکن ایک شخص اگر اکیلا کہیں باہر چلا گیا ہے تو اب وہاں کوئی اس کا جاننے پہچاننے والا نہیں' کوئی ہمدرد نہیں' کوئی مونس و غمخوار نہیں۔ گویا یہ شخص غریب الوطن ہے۔ اسی طرح اسلام بھی ابتدا میں غریب اور اجنبی تھا۔ اس کے بعد اسلام پر ایک دور آیا کہ اللہ نے اس کو قوت اور غلبہ دیا۔ اب ظاہر بات ہے کہ جس شے کو غلبہ حاصل ہو اس کے جاننے پہچاننے والے' اس کے ہمدرد و غمخوار تو سبھی ہو جائیں گے' تو بہت سے لوگ اس کے دامن سے وابستہ ہو گئے۔ حضورﷺ نے یہ خبر دی تھی کہ عنقریب یہ دوبارہ اسی حالتِ غربت کو لوٹ جائے گا جیسے کہ یہ شروع ہوا تھا۔

اس بات کو نوٹ کیجیے کہ مسلمانوں کا غلبہ اور اقتدار اگرچہ بہت عرصے تک چلا ہے' لیکن اسلام تو بہت جلد غریب ہو گیا۔ یہ وہی دور ہے جب حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے نبی اکرمﷺ سے علم کے دو برتن حاصل کیے تھے' ان میں سے ایک سے تو میں نے خوب علم بانٹا ہے' اسے خوب پھیلایا اور عام کیا ہے' لیکن اگر دوسرے کا مُنہ بھی کھول دوں گا تو میری گردن اڑا دی جائے گی۔ (صحیح بخاری) تو واقعہ یہ ہے کہ اسلام بہت جلد غریب ہو گیا تھا البتہ مسلمانوں کا غلبہ' ان کی سطوت اور شان و شوکت بہت عرصے تک چلی ہے۔ پھر عربوں کا یہ دورِ عروج ختم ہوا تو دو تین صدیوں پر محیط ایک ایسا دَور آیا جو اُمت مسلمہ کے لیے بہت ہی زوال کا دور تھا۔ اس کے بعد پھر سے ترکوں کے ذریعے مسلمانوں کو ایک عظمت اور سطوت ملی' لیکن اسلام پھر بھی غریب کا غریب رہا۔ مغلِ اعظم کا دَور تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے لیے سب سے بڑی غربت کا دور تھا۔ اگرچہ برعظیم پاک و ہند میں مسلمانوں کی سیاسی حکومت نصف النہار پر تھی لیکن اسلام تو درحقیقت بالکل زیریں سطح پر پہنچ چکا تھا' بلکہ اندیشہ ہو گیا تھا کہ اس برعظیم سے اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ وہاں پر ''دینِ الٰہی'' کے نام سے ایک نیا دین وجود میں آ چکا تھا۔

بہرحال یہ نوٹ کیجیے کہ جب اسلام حالت غربت میں ہو گا تو انفاق اور قتال کا درجہ اللہ کی نگاہ میں بہت بلند ہو گا' جبکہ وہی کام یعنی انفاق اور قتال اگر اسلام کے غلبے کے دور میں ہو گا تو اس کے مقابلے میں درجہ بہت کم رہ جائے گا' اگرچہ حسن نیت اگر ہے تو بہرحال سب کے لیے اللہ کا اچھا وعدہ ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الْحُسْنٰی﴾ ''اللہ تعالیٰ نے سب سے بہت عمدہ وعدہ کیا ہے''۔ حسنیٰ' احسن کا مونث ہے' یعنی اللہ کا سب اہل ایمان سے بہت عمدہ وعدہ ہے' لیکن جو لوگ بعد میں قتال اور انفاق کرنے والے ہیں ان کا وہ درجہ کبھی نہیں ہو سکتا جو وہ لوگ لے گئے جنہوں نے یہ کام فتح سے پہلے کیے۔ بقول شاعر ؎

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں!

اب اجر و ثواب اور درجات کے تعین میں جو دوسرا عنصر ہے' یعنی عمل کی باطنی کیفیت' اس کو ذہن میں رکھیے! جس طرح خارجی حالات کے اعتبار سے ہر عمل کے دو

پہلو ہوتے ہیں‘ جیسے ایک عمل اسلام کی غربت اور مغلوبیت کے دور میں ہے اور ایک اسلام کے غلبے اور اس کی قوت وسطوت کے دور میں ہے‘ اسی طرح داخلی اعتبار سے بھی ہر عمل کے دو پہلو ہوتے ہیں جن کے اعتبار سے عمل کی قدر و قیمت بڑھتی یا گھٹتی ہے۔ ایک ہے حسنِ نیت‘ جس کا معاملہ اکثر و بیشتر مشکوک رہتا ہے۔ ایک انسان تو وہ ہے جو شعوری طور پر ریا کاری کر رہا ہے۔ یہ شعوری ریا کاری تو شرک ہے اور ایک ایسی چیز ہے کہ جیسے کوئی بڑی سے بڑی رقم صفر سے ضرب کھا کر صفر ہو جائے۔ بلکہ اس سے تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ جیسے فرمانِ نبویؐ ہے : ((مَنْ صَلّٰی یُرَاءِ یُ فَقَدْ اَشْرَکَ وَمَنْ صَامَ یُرَاءِ یُ فَقَدْ اَشْرَکَ وَمَنْ تَصَدَّقَ یُرَاءِ یُ فَقَدْ اَشْرَکَ)) (رواہ احمد) ’’جس نے دکھاوے کے لیے نماز پڑھی وہ شرک کر چکا‘ جس نے دکھاوے کے لیے روزہ رکھا وہ شرک کر چکا‘ جس نے دکھاوے کے لیے صدقہ کیا وہ شرک کر چکا‘‘۔ لیکن یہ تو شعوری ریا کاری ہوئی‘ جبکہ ایک ہے تحت الشعور میں ریا کاری کا عنصر۔ جیسے سورۃ التغابن میں اللہ تعالیٰ کے علم کی تیسری جہت (third dimension) ان الفاظِ مبارکہ میں لائی گئی ہے: ﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ کہ اللہ تو سینوں کی پوشیدہ باتوں سے بھی واقف ہے۔ بسا اوقات انسان کو خود اندازہ نہیں ہو پاتا کہ کس طرح غیر شعوری اور غیر محسوس طور پر اس کی نیت کے اندر کہیں کسی درجے میں سُمعہ اور ریا کا حصہ شامل ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے یقیناً عمل کے اجر و ثواب اور اس کے مرتبے کے اندر کمی آ جائے گی‘ لیکن اس کا فیصلہ ہم نہیں کر سکتے‘ یہ تو اللہ تعالیٰ کے علم کامل میں ہے۔

اس کے علاوہ ایک داخلی پہلو اور بھی ہے۔ اللہ نے تمام انسان ایک جیسے پیدا نہیں کیے‘ مختلف لوگوں کی جبلتیں مختلف ہیں۔ اس کو سورۂ بنی اسرائیل میں یوں بیان کیا: ﴿قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ﴾ ’’کہہ دیجیے (اے نبیؐ!) کہ ہر شخص اپنے شاکلہ کے مطابق عمل کرتا ہے‘‘۔ شاکلہ کہتے ہیں شکل دینے والی شے کو‘ جسے عام طور پر سانچہ (mould) کہا جاتا ہے۔ آپ لوہا یا کوئی اور دھات پگھلا کر کسی سانچے میں ڈال دیں تو اس کی شکل اس سانچے کے مطابق ہو جائے گی۔ تو یہ سانچہ جو ہے یہ شاکلہ ہے۔ ہر انسان کا ایک جداگانہ شاکلہ ہے۔ آج کے دور میں یہ بات جینز یا جینیٹکس کے حوالے سے بہت معلوم و معروف ہے۔ ہمیں نامعلوم کہاں کہاں سے جینز ملے ہیں! نامعلوم کتنی پشتوں سے یہ جینز چلے آ رہے ہیں جو ہماری شخصیت کو ایک شکل دیتے ہیں۔ ہر شخص کا جو جینیٹک structure ہے اور جو اُس کی شخصیت کا شاکلہ ہے وہ اللہ کے علم میں ہے۔ فرض کیجیے کسی شخص کے اندر اپنے شاکلہ کے اعتبار سے شہوت کا زیادہ زور ہے ہی نہیں‘ اب اگر ایسا شخص پاک دامن ہے تو اس نے کوئی بڑا تیر نہیں مارا۔ لیکن اگر کسی شخص کے اندر شہوت کا زور ہے اور پھر وہ اپنے آپ کو قابو میں رکھے ہوئے ہے اور پاک دامن ہے تو یہاں اب دونوں کے اجر و ثواب اور درجے میں فرق واقع ہو جائے گا۔ پاک دامنی دونوں کی برابر ہے‘ لیکن کس شخص نے کس حالت میں اپنے آپ کو کنٹرول کیا ہے‘ اس اعتبار سے فرق واقع ہو جائے گا۔ اسی طرح ایک شخص طبعاً بزدل ہے‘ اس کے اندر جرأت اور شجاعت نہیں ہے‘ لیکن اس کے باوجود وہ اللہ کی راہ میں آگے بڑھ رہا ہے تو اس کا مقام و مرتبہ اس شخص سے بہت بلند ہو گا جس کو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی طبعاً جرأت مند بنایا ہے اور اس کے اندر سے خوف نکالا ہوا ہے اور وہ بھی اسی شخص کے مانند اللہ کی راہ میں آگے بڑھ رہا ہے۔ تو یہ ساری چیزیں ہیں کہ جن سے کسی کے عمل کی قدر و قیمت اور اس عمل کرنے والے کا درجہ متعین ہوتا ہے۔

اسی لیے فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾ ’’اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے جو تم عمل کرتے ہو‘‘۔ میں یہ بات پہلے نوٹ کرا چکا ہوں کہ اس سورۃ میں بھی اور سورۃ التغابن میں بھی اللہ تعالیٰ کی صفت ’’بصیر‘‘ کا ذکر پہلے ہوا ہے اس کی صفت ’’خبیر‘‘ کے ذکر سے۔ اس سورۂ مبارکہ کی آیت ۴ میں ہے: ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ ’’اور اللہ تعالیٰ خوب دیکھنے والا ہے اس کو جو تم کرتے ہو‘‘۔ سورۃ التغابن میں بھی یہی ترتیب ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت ’خبیر‘ میں بہت گہرائی ہے کہ وہ ہر شے سے خوب باخبر ہے۔ ہماری زبان میں بصارت کا لفظ عام طور پر ظاہری بصارت کے معنوں میں

استعمال ہوتا ہے۔ اس کا تعلق زیادہ تر کسی بھی عمل کے ظاہر سے ہوتا ہے‘ جبکہ اللہ تعالیٰ کی صفت خبیر سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ کس نے کیا عمل کس حالت میں کیا ہے‘ اس نے اس کام کی انجام دہی کے لیے اپنی کتنی اندرونی رکاوٹوں کے اوپر غلبہ حاصل کیا ہے اور اسے اس کے لیے کتنی جدوجہد کرنا پڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ خوب باخبر ہے کہ کس شخص کے لیے یہ کام کتنا آسان ہے۔ لہٰذا حالاتِ خارجی اور حالاتِ داخلی (پھر داخلی حالات میں بھی نیت اور شاکلہ دونوں شامل ہیں) ان سب کے اعتبارات سے کسی بھی عمل کی قدر و قیمت کا تعین ہوگا۔ ہمارے بڑے سے بڑے کمپیوٹر کے لیے بھی یہ قطعاً ممکن نہیں ہے کہ وہ ان تمام حقائق کو پیش نظر رکھ کر کوئی معاملہ طے کر سکے۔ لہٰذا واضح کر دیا گیا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو صرف اللہ اس سے باخبر ہے۔ تمہارے ان اعمال کا ہر پہلو اس کے سامنے واضح ہے۔ ہر شخص کا درجہ اللہ تعالیٰ کے علم قطعی کے اعتبار سے معین ہوگا۔

قرضِ حسنہ کے لیے اللہ کی پکار

آگے فرمایا: ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ ”کون ہے جو اللہ کو قرض دے قرضِ حسنہ؟“ یہاں للکارنے کا اور چیلنج کا انداز ہے کہ کون ہے وہ باہمت آدمی کہ جو اللہ کو قرض حسنہ دے؟ یہ بالکل وہی انداز ہے جو سورۃ الاحزاب میں اختیار کیا گیا: ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاھَدُوا اللّٰہَ عَلَیْہِ فَمِنْھُمْ مَّنْ قَضٰی نَحْبَہٗ وَمِنْھُمْ مَّنْ یَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِیْلًا﴾ ”مؤمنین میں سے کچھ ایسے لوگ ہیں کہ انہوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا اسے سچ کر دکھایا۔ ان میں سے کوئی تو اپنی ذمہ داری پوری کر چکا اور کوئی موقع کا انتظار کر رہا ہے اور انہوں نے اپنے عہد میں کوئی تبدیلی نہیں کی“۔ غالب کا یہ شعر درحقیقت اسی اسلوب میں ہے ؎

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق؟
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد!

اب دیکھئے اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے اس اندازِ کلام سے کیا مراد ہے! اس آیت کے بین السطور درحقیقت یہی بات ہے کہ اللہ کے لیے جان و مال کا لگا دینا‘ کھپا دینا‘ آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے تو یقینِ کامل درکار ہے‘ وہ یقینِ کامل جس کا منبع اور سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ جس نے وہاں سے کسب فیض کیا ہو وہ یہ کام کر سکتا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ آ ؤ یہ گوئے ہے اور یہ چوگان۔ یعنی let him prove his worth —— چنانچہ آپ نے حضرت ابوبکر صدیق h کا معاملہ دیکھا کہ انہوں نے دو مرتبہ اپنا سب کچھ لا کر حضور ﷺ کے سامنے رکھ دیا۔ اوّل تو وہ مکّہ میں ہی اپنا تقریباً سارا سرمایہ ان غلاموں اور کنیزوں کے آزاد کرانے میں لگا چکے تھے جو ایمان لائے تھے۔ آپؓ نے انہیں آزاد کرانے میں ان کے آقاؤں کو مُنہ مانگی قیمتیں ادا کیں۔ اور جب حضور ﷺ کے ساتھ ہجرتِ مدینہ کے لیے روانہ ہوئے تو اپنا بچا کھچا سارا مال ساتھ لے لیا اور اپنے اہل خانہ کے لیے کچھ بھی نہ چھوڑا۔ آپؓ کے والد ابوقحافہ‘ جو اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے اور بعد میں ایمان لائے‘ بینائی سے محروم تھے‘ انہیں جب معلوم ہوا کہ ابوبکر (رضی اللہ عنہ) تو چلے گئے ہیں تو اب وہ اپنی پوتیوں حضرت عائشہ اور حضرت اسماءj کے پاس آئے اور پوچھا کہ وہ کچھ چھوڑ کر بھی گیا ہے یا نہیں؟ تو پوتیوں نے کپڑے میں کچھ کنکر اور پتھر باندھ کر کہا کہ دیکھئے دادا جان! یہ سونے اور چاندی کی ڈلیاں ہیں جو ابا جان ہمارے لیے چھوڑ کر گئے ہیں‘ حالانکہ وہ کنکریوں اور پتھروں کے سوا کچھ نہ تھا۔ اور پھر جب سن ۹ ھ میں غزوۂ تبوک کے لیے مال کے انفاق کا موقع آیا اُس وقت بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ گھر میں جھاڑو پھیر کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ یہ وہی موقع ہے جب حضور ﷺ نے فرمایا: ”ابوبکر کو جو مقام حاصل ہے وہ نمازوں اور روزوں کی وجہ سے نہیں‘ ان کا مقام اس شے کی وجہ سے ہے جو اُن کے دل میں ہے“۔ وہ درحقیقت یقین محکم تھا جو اُن کے دل میں تھا۔ اور یہ درحقیقت اللہ کی ذات اور اس کے وعدوں پر یقین ہی ہے جو انسان کو اپنا سب کچھ لگا دینے پر آمادہ کرتا ہے۔ بصورت دیگر تو یہی ہوتا ہے کہ مال سینت سینت کر رکھے جاؤ‘ جائیدادیں بنائے جاؤ‘ اپنی اولاد کے لیے خوب مال و دولت چھوڑ کر مرو‘ البتہ ہر سال عمرہ ضرور کرتے چلو‘ حج پر حج کیے جاؤ اور اس کی گنتی

بڑھاتے جاؤ۔ ہمارے ہاں تو نیکی کا تصور بس یہی رہ گیا ہے۔ اور وہ عمرے اور حج بھی ہو رہے ہیں حرام وحلال کی کمائی سے قطع نظر کہ وہ مال آیا کہاں سے ہے۔ یا پھر ہمارے ہاں نیکی کا تصور یہ رہ گیا ہے کہ کوئی لنگر کھول کر غریبوں کو کھلا دو' کہیں کوئی چندہ دے دو اور بس۔ جبکہ اصل محنت دنیا بنانے میں ہو رہی ہے۔ اپنا قیمتی وقت' اپنی جان' اپنی صلاحیتیں' اپنی ذہانت' یہ سب کچھ صرف ہو رہے ہیں صرف دنیا بنانے اور مال جمع کرنے میں۔

ان دو تصورات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایمان اگر دل میں جاگزیں ہوگا تو یہ تصور لائے گا کہ میرا سب کچھ خدا کا ہے' میں خود اسی کے لیے ہوں۔ ﴿اِنَّ صَلَاتِیۡ وَنُسُکِیۡ وَمَحۡیَایَ وَمَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ﴾ ''یقیناً میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا ربّ ہے''۔ انسان اپنے مال میں سے اپنے لیے صرف اتنا رکھے جتنا جسم اور روح کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہو' اور یہ اپنے آپ کو برقرار رکھنا بھی اللہ کے دین کی جدوجہد کے لیے ہو۔ فرمایا: ﴿مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یُقۡرِضُ اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ﴾ ''کون ہے جو اللہ کو قرض دے؟ اچھا قرض' تاکہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا کر واپس دے''۔

ہمارے ہاں تو قرضِ حسنہ کا تصور یہ ہے کہ جو قرض دیا جائے بس صرف وہی واپس لینے کی امید ہو یا وعدہ ہو' لیکن اللہ تعالیٰ جس قرضِ حسنہ کا مطالبہ کر رہا ہے وہ اسے کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس کرے گا۔ قرضِ حسنہ کے ضمن میں حضورﷺ کا یہ معمول تھا کہ آپؐ کبھی کسی سے قرض لیتے تھے تو واپس کرتے ہوئے رضا کارانہ طور پر اپنی طرف سے کچھ بڑھا دیتے تھے۔ لیکن واپس کرتے ہوئے رضا کارانہ طور پر کچھ بڑھا دینا یہ ہدیہ کے درجہ کی شے ہے۔ اگر قرض میں پہلے سے کوئی اضافہ معین ہو تو وہ سود ہے اور حرامِ مطلق ہے۔ دین میں اس سے بڑی حرام چیز اور کوئی نہیں۔ عقائد میں شرک اور اعمال میں سود چوٹی کے گناہ ہیں۔ بہرحال اللہ کا قرضِ حسنہ کچھ اور ہے۔ جو شخص اللہ کو قرضِ حسنہ دے اللہ تعالیٰ اس کے لیے اسے بڑھاتا اور دوگنا کرتا رہے گا۔ واضح رہے کہ یہ صرف دوگنا کرنا نہیں' بلکہ دوگنا کرتے رہنا ہے۔ یعنی جو مال تم نے دیا ہے وہ تو واپس ملے گا ہی' ساتھ اضافی طور پر بھی بہت کچھ ملے گا۔ جیسے سورۃ المزمل کے آخر میں فرمایا: ﴿تَجِدُوۡہُ عِنۡدَ اللّٰہِ ہُوَ خَیۡرًا وَّاَعۡظَمَ اَجۡرًا﴾ ''تم پاؤ گے وہ سب کچھ (جو کچھ تم نے دیا ہے) اللہ کے پاس بہت بہتر حالت میں' اور بہت بڑھا ہوا (فزوں تر)''۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں ساتھ یہ بھی فرمایا: ﴿وَلَہٗۤ اَجۡرٌ کَرِیۡمٌ﴾ ''اور اس کے لیے بڑا باعزت (عزت افزائی کرنے والا) اجر ہے''۔ آیت ۷ میں ''اجرٌ کبیرٌ'' کے الفاظ آئے تھے' یہاں ''اجرٌ کریمٌ'' فرمایا۔ قرآن کریم میں اجر کے لیے ان دونوں dimensions کا ذکر ہوتا ہے کہ بہت بڑا اور باعزت اجر۔

بابِ چہارم
مشتمل بر

سورۃ الحدید کی آیات ۱۲ تا ۱۵

❁

میدانِ حشر کی تاریکیوں میں

اہلِ ایمان کے نور کی کیفیت

اور

ایمان کے دعوے داروں کی

اہل ایمان اور منافقین کے مابین تفریق

☆

’’راہِ نفاق‘‘ کے سنگ ہائے میل

اعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰن الرَّجیم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿ یَوۡمَ تَرَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ یَسۡعٰی نُوۡرُھُمۡ بَیۡنَ اَیۡدِیۡھِمۡ وَبِاَیۡمَانِھِمۡ بُشۡرٰٮکُمُ الۡیَوۡمَ جَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِھَا الۡاَنۡھٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡھَاؕ ذٰلِکَ ھُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ∧ یَوۡمَ یَقُوۡلُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَالۡمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوا انۡظُرُوۡنَا نَقۡتَبِسۡ مِنۡ نُّوۡرِکُمۡ ج قِیۡلَ ارۡجِعُوۡا وَرَآءَ کُمۡ فَالۡتَمِسُوۡا نُوۡرًاؕ فَضُرِبَ بَیۡنَھُمۡ بِسُوۡرٍ لَّہٗ بَابٌؕ بَاطِنُہٗ فِیۡہِ الرَّحۡمَۃُ وَظَاھِرُہٗ مِنۡ قِبَلِہِ الۡعَذَابُ M یُنَادُوۡنَھُمۡ اَلَمۡ نَکُنۡ مَّعَکُمۡؕ قَالُوۡا بَلٰی وَلٰکِنَّکُمۡ فَتَنۡتُمۡ اَنۡفُسَکُمۡ وَتَرَبَّصۡتُمۡ وَارۡتَبۡتُمۡ وَغَرَّتۡکُمُ الۡاَمَانِیُّ حَتّٰی جَآءَ اَمۡرُ اللّٰہِ وَغَرَّکُمۡ بِاللّٰہِ الۡغَرُوۡرُ N فَالۡیَوۡمَ لَا یُؤۡخَذُ مِنۡکُمۡ فِدۡیَۃٌ وَّلَا مِنَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡاؕ مَاۡوٰٮکُمُ النَّارُؕ ھِیَ مَوۡلٰٮکُمۡؕ وَبِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ ۝ ﴾

اس سورۂ مبارکہ کا تیسرا حصہ چار آیات (آیت ۱۲ تا ۱۵) پر مشتمل ہے۔ جیسے پہلے حصے کی آیت: ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ x﴾ فلسفے کی بلند ترین چوٹی پر ہے اور فلسفۂ وجود کے عقدے کو حل کر رہی ہے اسی طرح اس تیسرے حصے میں ایک آیت ہے جو نفاق کی حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ نفسیاتی سطح پر نفاق کے کیا مدارج اور مراحل ہیں؟ نفاق کہاں سے شروع ہوتا ہے' پھر اس کا دوسرا درجہ کیا ہے' تیسرا درجہ کیا ہے؟ نفسیاتی طور پر منافق کے اندر کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟ وغیرہ۔ سورۃ المنافقون کے درس میں یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ نفاق کے تین درجے ہوتے ہیں' جیسے ٹی بی کے تین درجے (stages) ہوتے ہیں۔ نفاق کا پہلا درجہ یہ ہے کہ جب اللہ کی راہ میں مال اور جان کے کھپانے کا حکم آتا ہے تو ایسا شخص اس جہاد و قتال اور انفاقِ مال سے بچنے کے لیے جھوٹے بہانے شروع کر دیتا ہے۔ لیکن جب محض جھوٹے بہانوں کا اعتبار نہیں رہتا تو پھر جھوٹی قسمیں کھائی جاتی ہیں' یہ نفاق کا دوسرا درجہ ہے۔ جیسے فرمایا گیا: ﴿اِتَّخَذُوْا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ''انہوں نے اپنی (جھوٹی) قسموں کو ڈھال بنا لیا اور اللہ کے راستے سے رُکتے گئے!'' نفاق کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ جب سچے اہل ایمان اللہ کی راہ میں جان اور مال کی بازیاں لگا رہے ہوتے ہیں تو ان کے خلاف ان کے دلوں میں بغض اور دشمنی پیدا ہو جاتی ہے۔ سچے اہل ایمان کو تو جب پکارا جاتا ہے تو وہ فوراً لبیک کہتے ہیں۔ بقول فیضؔ:

واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا
تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی
خیریتِ جاں' راحتِ تن' صحتِ داماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہل ہوس کی!

تو جن اہل ایمان کی یہ روش ہوتی ہے وہ اب منافقین کے دلوں میں کھٹکنے لگتے ہیں' کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی وجہ سے ہم نمایاں ہو رہے ہیں۔ ان کے خیال میں ان دیوانوں اور پاگلوں نے انہیں مصیبت میں ڈال رکھا ہوتا ہے۔ تو اب مؤمنین صادقین اور محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ' جو اُن کے امیر ہیں' ان کی دشمنی شروع ہو جاتی ہے ـــــ اور یہ نفاق کا تیسرا درجہ ہے۔

یہ تین مدارج تو علامات ہیں جو عمل میں ظاہر ہوتی ہیں' لیکن ذہن میں اور نفسیات کے اندر جو کھچڑی پک رہی ہوتی ہے وہ کیا ہے؟ اور یہ علامات درحقیقت کس اندرونی مرض کا ظہور ہیں؟ یہ اس سلسلۂ آیات کا مرکزی مضمون ہے۔

میدانِ حشر میں اہل ایمان اور اہل نفاق کی کیفیات

ارشاد ہوا:

﴿يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۸﴾

''اس دن تم دیکھو گے مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کو کہ ان کا نور ان کے سامنے اور دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا' (اور ان سے کہا جائے گا) آج تمہیں ایسے باغوں کی بشارت ہے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہی بڑی کامیابی ہے''۔

سچے اہل ایمان کے فوراً بعد منافقین کا تذکرہ آ رہا ہے۔ یہ قرآن کریم کا ایک خاص اسلوب ہے کہ اہل جنت اور اہل جہنم کا تذکرہ simultaneous contrast کے طور پر ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کے برعکس کیفیت بیان فرمائی گئی:

﴿يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ۭ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ۭ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ M﴾

''اُس دن منافق مرد اور منافق عورتیں ایمان والوں سے کہیں گے ذرا ہمیں مہلت دو اور ہمارا انتظار کرو' تاکہ ہم بھی تمہارے نور سے روشنی حاصل کر سکیں' تو انہیں کہا جائے گا کہ پیچھے لوٹ جاؤ اور نور تلاش کرو' پھر اُن (اہل ایمان اور منافقین) کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ

ہوگا‘اس کے اندر تو رحمت ہوگی اور باہر عذاب ہوگا‘‘۔

قرآن مجید کے مختلف مقامات پر ہمیں میدانِ حشر کے مختلف نقشے ملتے ہیں اور مختلف مکالمات کا ذکر ہے۔اس اعتبار سے ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ میدانِ حشر کوئی ایک مرحلہ نہیں ہے‘ بلکہ اُس روز کے احوال مختلف مراحل سے گزر کر تکمیل تک پہنچیں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرحلہ تو وہ ہے جہاں کافر اور مسلم جدا ہو جائیں گے۔یعنی ایک بڑی چھلنی لگے گی جس سے کھلم کھلا باغی ومنکر اور مدعیٔ ایمان جدا جدا ہو جائیں گے۔گویا کافر اِدھر اور مسلم اُدھر ہیں۔لیکن اب دنیا میں جو قانونی اعتبار سے مسلمان سمجھے جاتے تھے ان میں مؤمنین صادقین بھی تھے اور منافقین بھی تھے۔تو اب ایک اور چھلنی لگے گی جس سے گویا دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔یہ مرحلہ سورۃ الحدید کی ان آیات میں مذکور ہے۔اس کے علاوہ یہی مضمون اس سلسلۂ سُور کی آخری سورۃ‘ سورۃ التحریم کی آیت ۸ میں بھی بیان ہوا ہے۔وہاں ارشاد ہوا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ یُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَ یُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰهُ النَّبِیَّ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ یَسْعٰی بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ بِاَیْمَانِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَ اغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۸﴾

‘‘اے ایمان والو! اللہ کے حضور خالص توبہ کرو‘ کچھ بعید نہیں کہ تمہارا ربّ تم سے تمہاری برائیاں دُور کر دے اور تمہیں ایسی جنتوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں۔اس دن اللہ نبی کو اور ان لوگوں کو جو اُس کے ساتھ ایمان لائے‘ رسوا نہیں کرے گا۔ان کا نور ان کے آگے اور دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا۔وہ کہیں گے اے ہمارے ربّ! ہمارے لیے ہمارا نور پورا کر دے اور ہمیں بخش دے‘ یقیناً تو ہر چیز پر قادر ہے‘‘۔

تو ان دو مقامات پر یہ مضمون آیا ہے۔اور یہ قرآن مجید کا ایک خاص اسلوب ہے کہ آپ کو اہم مضامین کم سے کم دو جگہ ضرور ملیں گے۔تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایسا مرحلہ لازماً ہوگا جس میں مؤمنین صادقین کو منافقین سے جدا کر دیا جائے گا۔اس کے لیے اللہ تعالیٰ اپنی حکمت بالغہ سے جو شکل اختیار فرمائے گا وہ یہ ہے کہ جن کے دلوں میں ایمان موجود ہوگا ان کا نورِ ایمان ظاہر ہو جائے گا اور وہ ان کے سامنے کی طرف روشنی کرے گا۔اور اس ایمان کے تحت جو اعمال صالحہ تھے‘ ان کا نور ان کے دائیں جانب ظاہر ہوگا‘ کیونکہ انسان کا دایاں ہاتھ اعمال صالحہ کا کاسب ہے۔یوں سمجھئے کہ درحقیقت یہ ایمان ایک نور ہے۔اس وقت تو نور قلب میں ہے‘ ہمیں نظر نہیں آ رہا ہے‘ جبکہ اس نور کی ایک اور صورت ہے جو وہاں ظاہر ہوگی۔اسی طرح ہر نیکی کے اندر ایک نورانیت ہے اور یہ نور ہمیں یہاں نظر نہیں آ رہا‘ لیکن اس کی اصل ماہیت اور اصل حقیقت میدانِ حشر میں اس مرحلے پر واضح ہو جائے گی۔

میدانِ حشر کی تاریکیوں میں اہل ایمان کے نور کی کیفیت

میدانِ حشر میں ایک ایسا مرحلہ بھی ہے جسے ہماری زبان میں عام طور پر پل صراط کہا گیا ہے۔یہ انتہائی گھپ اندھیرے میں جہنم کے اوپر بنا ہوا ایک راستہ ہے۔سورۂ مریم میں اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے: ﴿وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰی رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِیًّا ۷۱﴾ ‘‘اور تم میں سے کوئی ایسا نہیں جس کا اس (جہنم) پر گزر نہ ہو‘ یہ طے شدہ بات ہے جو تمہارے ربّ کے ذمہ ہے‘‘۔تو یہ پل صراط ہے جس پر سے ہر ایک کو گزرنا ہے۔یہ گھپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا انتہائی تنگ راستہ ہے جسے ہم اپنی استعاراتی زبان میں کہتے ہیں کہ یہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز راستہ ہے۔اب جن کے پاس تو وہ نورِ ایمان اور نورِ اعمالِ صالحہ ہوگا وہ تو اس نور کی روشنی میں اس راستے کو دیکھ کر اس مرحلے سے گزر کر جنت میں داخل ہو جائیں گے اور دوسرے جو اِس نور سے محروم ہوں گے وہ ٹھوکریں کھا کر جہنم کے اندر گریں گے۔یہ ہے درحقیقت وہ چھلنی کہ جو میدان حشر میں کسی ایک مرحلے پر لگے گی۔

تو فرمایا: ﴿یَوْمَ تَرَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ﴾ یہاں پر یہ بات ذرا وضاحت طلب ہے کہ لفظ ‘‘یَوْمَ’’ یہاں منصوب کیوں ہے۔اس بارے میں ایک رائے تو یہ ہے کہ اس سے ماقبل آیت کے آخر میں ‘‘اَجْرٌ كَبِیْرٌ’’ کا ذکر ہوا ہے‘ یہ اس کا ظرف ہے

کہ وہ اجر کریم کب ظاہر ہوگا: ﴿يَوۡمَ تَرَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ يَسۡعٰى نُوۡرُهُمۡ بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَبِاَيۡمَانِهِمۡ﴾ ''(یہ اجر کریم ظاہر ہوگا) اُس دن کہ جب تو دیکھے گا مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کو کہ ان کا نور ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا''۔ تو اس رائے کے مطابق یہ ظرفیت کا نصب ہے۔ اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ ''یَوۡمَ'' سے پہلے ''اُذۡکُرۡ'' محذوف ہے کہ تصور کرو اس دن کا جس دن مؤمنوں پر یہ عنایت خاص ہوگی۔ اس رائے کے مطابق یہاں سے پھر استیناف ہو جائے گا، یعنی یہاں سے ایک علیحدہ کلام شروع ہوگا۔ میں اسی دوسری رائے کو زیادہ قوی سمجھتا ہوں، لیکن دونوں رائیں ممکن ہیں۔ تو فرمایا جا رہا ہے کہ ذرا تصور کرو اُس دن کا جس دن تم دیکھو گے مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کو کہ ان کا نور دوڑتا ہوگا ﴿بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ﴾ ''ان کے سامنے''۔ ان کے آگے آگے۔ یہ میرے نزدیک ایمان کا نور ہے جو قلب میں ہے، اس کی جو بھی روشنی پڑے گی وہ سامنے کی طرف ہوگی۔ ﴿وَبِاَيۡمَانِهِمۡ﴾ ''اور ان کے دائیں طرف''۔ سورۃ التحریم کی آیت ۸ میں بھی یہی الفاظ ہیں: ﴿يَسۡعٰى نُوۡرُهُمۡ بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَبِاَيۡمَانِهِمۡ﴾ سورۃ التحریم میں تو ان کی دعا کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔ جن کا نور تھوڑا ہوگا، وہ پھر دعا کریں گے: ﴿رَبَّنَاۤ اَتۡمِمۡ لَنَا نُوۡرَنَا وَاغۡفِرۡ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ﴾ ''کہ پروردگار! ہماری ان کوتاہیوں کو جن کی وجہ سے ہمارا یہ نور مدھم ہے، تو اپنے فضل و کرم سے معاف فرما کر ہمارے اس نور کا بھی اتمام فرما دے! گویا وہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے پروردگار! جیسے تو نے حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہما کو نورِ کامل عطا فرمایا ہے ایسے ہی اپنے فضل و کرم سے ہمارے نور کا بھی اتمام فرما دے۔ اس لیے کہ حدیثِ نبویؐ کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نور کے مختلف درجات ہوں گے۔ یہ گویا اس کا quantitative element ہے۔

ظاہر بات ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے ایمان میں اور ایک عام آدمی کے ایمان میں زمین و آسمان کا فرق ہوگا۔ اور ہم سے کسی کو اگر کوئی رتی ماشہ ایمان نصیب ہو جائے تو اس کی کیا نسبت تناسب ہے حضورﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ایمان کے ساتھ! اس حوالے سے حضورﷺ کے الفاظ ہیں کہ کچھ لوگوں کو تو جو نور ملے گا وہ اتنا ہوگا کہ اس کی روشنی مدینے سے صنعا تک پہنچے گی۔ (یہ یمن کا ایک شہر ہے۔) یعنی اس کے اثرات اس قدر زیادہ ہوں گے۔ اور فرمایا کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جن کو بس اتنا نور ملے گا کہ وہ صرف ان کے قدموں کے سامنے روشنی کر رہا ہوگا۔ لیکن یہاں نوٹ کر لیجیے کہ اُس وقت وہ نور بھی بہت غنیمت ہوگا۔ اس کا کسی قدر اندازہ اس مثال سے لگایا جا سکتا ہے کہ کوئی شخص گھپ اندھیری رات میں سفر کر رہا ہو اور وہ پگڈنڈی بھی واضح نہ ہو جس پر جانا ہے تو اس موقع پر اگر اس کو کوئی معمولی ٹارچ بھی مل جائے تو وہ اس کے لیے بڑی قیمتی چیز ہوگی، اور اگر کسی کے پاس لالٹین ہو تو وہ بھی ایسے موقع پر بڑا خوش نصیب ہوگا۔ جیسے اقبال نے کہا ہے ؎

اندھیری شب ہے، جدا اپنے قافلے سے ہے تو
ترے لیے ہے مرا شعلۂ نوا قندیل!

لیکن اگر کسی کو حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما والا نور میسر آ جائے تو اس کے کیا کہنے۔ یہ فرق و تفاوت بہر حال ہوگا۔ حدیث نبویؐ میں یہ فرق و تفاوت اس حوالے سے بھی بیان ہوا ہے کہ چھوٹے اور کم تر درجے کا جنتی اپنے سے اوپر والے جنتی کو ایسے دیکھے گا جیسے تم زمین پر بیٹھ کر آسمان کے ستاروں کو دیکھتے ہو۔ اس قدر فرق و تفاوت ہوگا!

آگے فرمایا: ﴿بُشۡرٰٮكُمُ الۡيَوۡمَ جَنّٰتٌ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ﴾ ''(ان سے کہا جائے گا کہ) آج بشارت ہے تمہارے لیے ان باغات کی جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی''۔ یعنی آج کا دن تمہارے لیے بشارت کا دن ہے۔ تمہاری کلفتوں اور مشقتوں کا دور اب ختم ہوا۔ تم امتحان کے مختلف مرحلوں سے گزر آئے ہو اور اب تمہاری سختیاں اور تمہاری ابتلاء و آزمائش ختم ہوئی۔ آج سے تمہارے لیے بشارت ہے ان باغات کی جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی۔ میں عام طور پر ''تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ'' کا ترجمہ ''دامن میں ندیاں بہنا'' زیادہ پسند کرتا ہوں، اس لیے کہ باغ کا جو فطری تصور ہوتا ہے وہ یہی ہے۔ ایک باغ تو لوگوں کا بنایا ہوا ہوتا ہے جو وہ باقاعدہ

منصوبہ بندی کے تحت بناتے ہیں‘ جس کے مختلف درجات (levels) ہوتے ہیں‘ جیسے کہ شالامار باغ ہے‘ جبکہ ایک باغ فطری ہوتا ہے۔ جیسے ایک وادی ہے‘ اس کے نشیب میں ایک ندی بہہ رہی ہے اور ندی کے دونوں اطراف میں ذرا بلندی پر درخت لگائے گئے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ پانی کے اثرات زمین کے دونوں طرف سرایت کر رہے ہوں گے جو اُن درختوں کے لیے زیادہ مفید ہیں۔ لہٰذا ﴿تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ سے مراد یہ ہے کہ باغات کے دامن میں ندیاں بہہ رہی ہوں گی۔ علامہ اقبال نے اپنی نظم ”ایک آرزو“ میں اس کا ایک خوبصورت نقشہ کھینچا ہے ؏ پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو! بہرحال یہ کہنا کہ ”نیچے ندی بہہ رہی ہے“ یا یہ کہنا کہ ”دامن میں ندی بہہ رہی ہے“ اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

مزید فرمایا: ﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا﴾ ”اس میں تمہیں رہنا ہے ہمیشہ ہمیش“ ﴿ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۸﴾ ”یہی ہے اصل بڑی کامیابی“۔ یہاں ’ذٰلِکَ‘ کے بعد ’ھُوَ‘ بھی آیا ہے اور یہ حصر کا اسلوب ہے کہ ”یہی ہے اصل بڑی کامیابی“۔ اس سے دراصل اس حقیقت کی طرف توجہ دلانی مقصود ہے کہ اگرچہ دنیا میں بھی انسان چاہتا ہے کہ اپنی محنت کے کوئی نتائج دیکھ لے‘ لیکن یہ اصل کامیابی نہیں ہے۔ جیسے سورۃ الصّف میں فرمایا گیا: ﴿وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ﴾ کہ ایک اور وعدہ بھی تم سے کیا جا رہا ہے جو تمہیں بہت پسند ہے‘ اور وہ ہے اللہ کی طرف سے مدد اور فوری (دُنیوی) فتح۔ جبکہ اللہ نے تو یہ دنیا بنائی ہے صرف آزمائش کے لیے: ﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ﴾ (المُلک:۲) ”اس نے تخلیق کیا ہے موت اور زندگی کو‘ تاکہ وہ تمہیں (اس کے ذریعے) آزمائے کہ کون ہے تم میں سے عمل کے اعتبار سے زیادہ بہتر“۔ تو جو اِس آزمائش میں کامیاب ہو گیا بس وہی ہے اصل میں کامیاب‘ چاہے دنیا میں ایسے شخص کی سعی و جہد کا کوئی نتیجہ برآمد ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ یہ دُنیوی کامیابی اس اعتبار سے بالکل غیر اہم ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کئی جلیل القدر رسول دنیا سے یوں ہی چلے گئے کہ انہیں کوئی پیروکار نہیں مل سکے۔ حضرت نوح علیہ السلام کو ساڑھے نو سو (۹۵۰) برس کی تبلیغ کے نتیجے میں صرف ستر یا بہتر افراد ملے‘ بلکہ ایک رائے تو یہ بھی ہے کہ اتنے بھی نہیں ملے۔ سوائے ان کے تین بیٹوں اور ان کے گھر والوں کے کوئی ان کے ساتھ نہیں تھا۔ قرآن کے الفاظ ہیں: ﴿وَمَا اٰمَنَ مَعَهٗ اِلَّا قَلِيْلٌ﴾ (ھود:۴۰) ”اور ایمان نہیں لائے اس کے ساتھ مگر تھوڑے ہی لوگ“۔ ساڑھے نو سو سال کا عرصہ بہت بڑا عرصہ ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ناکامی کا اس کوچے میں گزر ہی نہیں۔ جو آپؑ کا فرض تھا وہ انہوں نے بطریق احسن ادا کیا اور حجت تمام کر دی۔

یہ نفسیاتی اعتبار سے بہت اہم مسئلہ ہے۔ خاص طور پر ہر اُس شخص کے لیے جو دین کی کسی خدمت کا بیڑا اٹھائے اور اس کے لیے کمر کس لے اس پر یہ بات پوری طرح واضح ہونی چاہیے کہ اس کا نصب العین سوائے آخرت کی فلاح اور اللہ کی رضا کے کوئی نہ ہو۔ کوئی اور شے اس کی نظر میں نصب العین کا درجہ اختیار نہ کر لے۔ اصل شے اپنے فرض کی ادائیگی ہے اور یہی اصل کامیابی ہے۔ چنانچہ سورۃ الصّف میں فرمایا: ﴿تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ K﴾ یعنی اگر تم یہ دو شرائط پوری کر لو کہ اللہ اور رسول (ﷺ) پر ایمان لے آؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرو تو یہ چیز تمہارے لیے خیر ہے اگر تم جانو۔ اور وہ خیر کیا ہے! ﴿يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۸﴾ ”وہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تمہیں ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے دامن میں نہریں بہہ رہی ہوں گی اور (تمہارے لیے) پاکیزہ مکانات ہوں گے رہائشی باغات میں۔ یہی ہے بڑی کامیابی“۔ آگے وہی بات کہی جا رہی ہے کہ ﴿وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ M﴾ ”اور وہ دوسری چیز بھی (تمہیں عطا کرے گا) جو تمہیں بہت پسند ہے‘ اللہ کی طرف سے مدد اور قریب ہی میں حاصل ہو جانے والی فتح۔ اور (اے نبیؐ!) اہلِ ایمان کو خوشخبری دے دیجیے!“ اب ظاہر بات ہے کہ یہ بات تو کہی جا رہی ہے سن ۶ ھ کے آس پاس۔

اس سے پہلے کتنے ہی صحابہؓ ہیں جو جامِ شہادت نوش کر چکے اور ابھی تو وہ نصرتِ خداوندی قریب بھی نہیں آئی تھی۔ کچھ صحابہ کرامؓ تو مکے میں ہی شہید ہو گئے تھے جو اسلام کی مغلوبیت کا دور ہے۔ یوں کہیے کہ اسلام ابھی اپنی اجنبیت کے دور میں تھا۔ تو ذرا سوچئے کہ جو مکہ میں ہی شہید ہو گئے' کیا وہ ناکام ہیں؟ (معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ) لہٰذا یہ بات ذہن میں بالکل واضح رہنی چاہیے۔ ورنہ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ آدمی جب دیکھتا ہے کہ اس دنیا میں میری کوشش بارآور نہیں ہو رہی اور لوگوں کا رجوع میری طرف نہیں ہو رہا' لوگ میرا ساتھ نہیں دے رہے تو وہ by hook or by crook کے مصداق کوئی الٹا سیدھا طریقہ آزماتا ہے اور کوئی مختصر اور آسان راستہ (شارٹ کٹ) اختیار کر لیتا ہے۔ یہ صرف اسی صورت میں ہوتا ہے اگر ذہن میں یہ خناس پیدا ہو جائے کہ اصل کامیابی تو یہاں کی کامیابی ہے۔ جبکہ یہ بات ہرگز نہیں ہے' بلکہ اصل کامیابی تو آخرت کی کامیابی ہے۔ لہٰذا فرمایا: ﴿ذٰلِکَ هُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ﴾ ''یہی ہے اصل بڑی کامیابی''۔

حصولِ نور کے لیے منافقین کی دہائی اور اس کا جواب

آگے ترجمہ کر لیجیے: ﴿یَوۡمَ یَقُوۡلُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَالۡمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوا انۡظُرُوۡنَا﴾ ''اس روز منافق مردوں اور عورتوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ اہل ایمان سے کہیں گے کہ ذرا ہمارا انتظار کرو!'' اب ذرا اس کو چشمِ تصور سے دیکھئے کہ جنہیں وہ نورِ ایمان اور نورِ اعمال صالحہ مل گیا وہ خوشی خوشی راستہ طے کر رہے ہیں اور جن کے پاس یہ نور نہیں ہے وہ انہیں باحسرت و یاس پکار رہے ہیں کہ ذرا ہماری حالت پر نظر کرو! ذرا ہمارا انتظار کرو! نَظَرَ ' یَنۡظُرُ دیکھنے کے معنی میں آتا ہے اور اسی سے بابِ افتعال کا مصدر ''انتظار'' آتا ہے۔ انتظار کے معنی تو بالکل معین ہیں کہ کسی کا انتظار کرنا' کسی کی راہ دیکھنا' کسی کو ذرا مہلت دینا۔ تو ''اُنۡظُرُوۡنَا'' یہاں اسی معنی میں ہے کہ ذرا ہمیں مہلت دیجیے' ہمارا انتظار کیجیے! ﴿نَقۡتَبِسۡ مِنۡ نُّوۡرِکُمۡ﴾ ''تاکہ ہم آپ کے نور سے اقتباس کر لیں۔'' آپ کے نور سے ہم بھی کچھ فائدہ اٹھا لیں' کچھ روشنی حاصل کر لیں۔ یعنی ہم خود تو تہی دست ہیں' ہمیں نور نہیں ملا' آپ ذرا ہم پر عنایت کریں! یہ اقتباس کا لفظ بھی قَبَسَ سے بابِ افتعال کا مصدر ہے۔ قَبَسٌ کہتے ہیں چنگاری کو۔ آپ کسی کے چولہے سے چنگاری لے آئے اور اپنے چولہے میں آگ جلالی تو یہ اقتباس ہے۔ اردو میں ہم یہ لفظ quotation کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ آپ اپنا کوئی مضمون لکھ رہے ہیں اور اس میں آپ نے کسی اور کے مضمون سے کوئی شے لا کر شامل کی تو یہ اقتباس ہے۔ گویا آپ نے کسی کے چولہے سے ایک چنگاری لا کر اپنے چولہے میں شامل کی ہے۔ اس کی آپ نشان دہی بھی کر دیتے ہیں کہ یہ اقتباس (quotation) ہے جو فلاں کے مضمون سے لیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دورانِ سفر راستے میں جب آگ نظر آئی تھی تو انہوں نے اپنی رفیقۂ حیات سے کہا تھا: ﴿امۡکُثُوۡۤا اِنِّیۡۤ اٰنَسۡتُ نَارًا لَّعَلِّیۡۤ اٰتِیۡکُمۡ مِّنۡهَا بِقَبَسٍ اَوۡ اَجِدُ عَلَی النَّارِ هُدًی﴾ (طٰہٰ) ''ٹھہرو! مجھے آگ نظر آئی ہے' شاید میں وہاں سے آپ کے لیے کوئی انگارا لا سکوں یا مجھے اس آگ پر سے راستے کا ہی کچھ پتہ چل جائے''۔ تو یہاں منافقین کے قول میں بھی وہی لفظ آیا ہے: ﴿اُنۡظُرُوۡنَا نَقۡتَبِسۡ مِنۡ نُّوۡرِکُمۡ﴾ کہ ذرا ہمیں مہلت دو' ہمارا انتظار کرو' ہمارے لیے ٹھہرو' کہاں قدم بڑھائے چلے جا رہے ہو' ذرا ٹھہرو کہ ہم تمہارے اس نور سے استفادہ کر لیں' تاکہ ہم بھی کسی طور سے اس بڑی کٹھن منزل کو طے کر لیں۔

﴿قِیۡلَ ارۡجِعُوۡا وَرَآءَکُمۡ فَالۡتَمِسُوۡا نُوۡرًا﴾ ''(تو ان سے) کہا جائے گا کہ (اگر ممکن ہے تو) اپنے پیچھے (واپس) چلے جاؤ' پھر (وہاں) نور تلاش کرو''۔ یہاں ذرا نوٹ کیجیے کہ لفظ ''قَالُوۡا'' کے بجائے ''قِیۡلَ'' آیا ہے۔ یعنی ان سے کہا جائے گا۔ اب جبکہ اس بُرے حال میں وہ اِن مؤمنین سے درخواست کریں گے تو اِن اہل ایمان کی مروّت' شرافت اور نجابت سے یہ بات بہت بعید ہے کہ وہ انہیں جھٹک دیں اور تڑخ کر کہیں کہ جاؤ واپس دنیا میں جا کر نور تلاش کرو۔ لہٰذا مجہول کا صیغہ آیا ہے کہ ان سے کہا جائے گا۔ (قِیۡلَ) کوئی کہے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگا۔ جیسے بشارتیں دینے والے ہاتف غیبی ہوں گے' کوئی ملائکہ ہوں گے' اسی طرح ان کو غیب سے کہا جائے گا کہ لوٹ جاؤ پیچھے کی طرف اور تلاش کرو نور۔ لمس کہتے ہیں چھونے کو' تو التماس کا

مطلب ہے کسی شے کو تلاش کرنا' ٹٹولنا' حاصل کرنا۔ ان الفاظ میں یہ اشارہ موجود ہے کہ یہ نور یہاں سے نہیں ملتا' یہ دنیا میں حاصل کیا گیا تھا' یہاں تو بس ظاہر ہوا ہے۔ اہل ایمان نے دنیا میں ہی یہ نور کمایا تھا اور انہوں نے قرآن سے اقتباسِ نور کیا تھا۔ قرآن تمہارے پاس بھی تھا لیکن تم جان بوجھ کر اس سے محروم رہے' اور یہ اعمالِ صالحہ کا نور بھی یہ دنیا سے کما کر لائے ہیں جو یہاں ظاہر ہو رہا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ دنیا میں واپس لوٹنے کا کوئی سوال نہیں' اب دُنیا کی طرف رُجوع کا کوئی امکان نہیں۔ لہٰذا ﴿ارْجِعُوْا وَرَآءَ کُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا﴾ کا ترجمہ ہم کریں گے کہ اگر ممکن ہے تو لوٹ جاؤ پیچھے کی طرف (دنیا میں) اور حاصل کرنے کی کوشش کرو نور کو!

نفاق کی حقیقت اور مراحل و مدارج

آگے بڑھنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نفاق کی حقیقت اور اس کے مراحل و مدارج (stages) کو سمجھ لیا جائے۔ نوٹ کیجیے کہ لفظ 'نِفَاق' اور 'اِنفاق' کا مادہ ایک ہی ہے' یعنی ''ن' ف' ق''۔ نَفَقَ' یَنْفُقُ سے اِفعال کے وزن پر لفظ 'اِنفاق' بنا ہے جس کے معنی ہیں ختم ہو جانا' خرچ ہو جانا۔ جیسے کہا جاتا ہے: نَفَقَ الْفَرَسُ ''گھوڑا مر گیا'' یا ''گھوڑا کام آ گیا''۔ اور نَفَقَتِ الدَّرَاهِمُ ''پیسے ختم ہو گئے!'' یہاں اس انفاق کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے' بایں الفاظ: ﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَکُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْہِ﴾ اور اسی مادے سے بابِ مُفاعلہ میں ''منافقت'' بنا ہے۔ ''نَفَقٌ'' سے مراد ہے زیر زمین راستہ یا سرنگ جس کے دو مُنہ ہوتے ہیں۔ پچھلے زمانے میں بادشاہ عام طور پر ایسے فوجی قلعے بنواتے تھے کہ ان میں محل بھی ہوتے تھے اور شکست کی صورت میں اپنی جان بچانے کے لیے قلعے میں ایسی خفیہ سرنگیں بنائی جاتی تھیں جو دُور کسی جنگل میں جا کر نکلتی تھیں' تا کہ دشمن اگر صدر دروازے سے داخل ہو ہی جائے تو وہ اس سرنگ کے ذریعے سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے فرار ہو سکیں۔ لہٰذا بچاؤ کے لیے یہ سرنگیں بنائی جاتی تھیں۔ اسی طرح گوہ جو ایک صحرائی جانور ہے' اس میں اللہ نے اتنی عقل رکھی ہے کہ وہ اپنے لیے زیر زمین جو بھٹ یا بل بناتا ہے اس کے دو مُنہ رکھتا ہے' تا کہ اگر ایک راستے سے شکاری کتے داخل ہوں تو وہ دوسرے راستے سے نکل کر اپنی جان بچا سکے۔ اس لیے کہ صحرائی لوگ اس کا شکار کر کے اس کا گوشت کھاتے تھے۔ گوہ کے بل کو نَافِقَاء کہتے ہیں۔ اسی ''نفق'' سے لفظ ''منافقت'' بنا ہے۔ تو منافقت کی اصل حقیقت یہی ہے کہ اپنے آپ کو بچا کر رکھنا۔ ایک تو صادق الایمان ہوتے ہیں جن کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ کھپا دینے میں ہی اپنی کامیابی سمجھتے ہیں۔ جیسے اقبال نے کہا: ؎

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں!

لیکن منافقین کا رویہ اس کے برعکس ہوتا ہے کہ بچ بچ کر چلو' جان اور مال کو بھی بچاؤ اور مسلمانوں کے ساتھ بھی چلو۔ بظاہر ایمان لے آنا ان کی مجبوری بن جاتا ہے' کیونکہ اگر سارا قبیلہ ایمان لے آیا ہے تو ان کا بھی ایمان لے آنا معاشرتی دباؤ کی بنا پر لازمی ہو جاتا ہے' ورنہ تو انہیں اپنے قبیلے سے کٹنا پڑتا ہے۔ تو وہ مسلمانوں میں تو شامل ہو جاتے ہیں مگر اپنے آپ کو بچا بچا کر چلتے ہیں۔ تو یہ اپنے آپ کو بچانا دراصل نفاق کی بنیاد ہے۔

اب جب اللہ کی راہ میں مال و جان کے ساتھ جہاد کا حکم ہوتا ہے تو مؤمنین صادقین کی روش یہ ہوتی ہے کہ وہ لبیک کہتے ہوئے حاضر ہو جاتے ہیں' لیکن منافقین اس سے گریز کی راہ اختیار کرتے ہیں اور جھوٹے بہانے بناتے ہیں۔ یہاں نوٹ کیجیے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہو سکتے ہیں جنہوں نے حیلے بہانے سے اپنے آپ کو اس کٹھن صورت حال سے بچا تو لیا ہو' لیکن بعد میں اپنی غلطی اور کوتاہی کا اعتراف کرتے ہوئے حضورﷺ کے سامنے معذرت پیش کی ہو' تو اس کو نفاق نہیں کہیں گے' بلکہ یہ صرف ضعف ایمان ہے۔ لیکن جب ان بہانوں میں جھوٹ کا عنصر بھی شامل ہو گیا' جھوٹے بہانے بنانے شروع کر دیئے تو یہ نفاق کی پہلی سٹیج ہے۔ پھر ایک عرصہ گزرنے کے بعد جب انسان سوچتا ہے کہ اس کا تو اعتبار ہی ختم ہو گیا ہے تو اب وہ جھوٹی قسمیں کھاتا ہے اور یہ نفاق کا دوسرا درجہ ہے۔ اور تیسرا درجہ وہ ہے جب مؤمنین صادقین سے کد ہو جاتی ہے' ان سے بغض ہو جاتا ہے کہ یہ تو پاگل اور جنونی لوگ ہیں جو نہ دائیں دیکھتے

ہیں، نہ بائیں دیکھتے ہیں، نہ انہیں آگے کی فکر ہے، نہ پیچھے کی فکر ہے، کوئی مصلحتیں دیکھتے ہی نہیں۔ اب ان کا قول یہ ہوتا ہے: ﴿اَنُؤۡمِنُ کَمَاۤ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ﴾ ''کیا ہم اس طرح ایمان لے آئیں جیسے یہ بے وقوف ایمان لائے ہیں؟'' یہ تو جنونی ہیں، یہ fanatics ہیں۔ تو جب مؤمنین صادقین سے دشمنی ہوگئی تو یہ نفاق کی تیسری سٹیج ہے۔ یہ نفاق دراصل انسان کی باطنی کیفیت ہے جو مختلف مراحل سے گزر کر انتہائی سٹیج کو پہنچتی ہے۔ یہاں اس کو بہت عمدگی کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔

نفاق کے بارے میں ایک مغالطے کا ازالہ

ایک بات اور نوٹ کر لیجیے کہ دورِ نبویﷺ میں شعوری نفاق بہت شاذ اور کم تھا۔ عام مغالطہ یہ ہے کہ منافق وہی ہوتا ہے جو جان بوجھ کر منافق بنا ہوا ہو، جبکہ درحقیقت یہ بات نہیں تھی۔ منافقین کی اکثریت وہ تھی جو ایمان تو خلوص کے ساتھ لائے تھے، لیکن ایمان کے تقاضے پورے کرنے کے لیے جو ہمت درکار ہوتی ہے ان میں اس کا فقدان تھا۔ گویا ع ''ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم'' والی کیفیت نہیں تھی۔ جس شخص میں ایمان کی پختگی اور گہرائی اتنی نہیں ہوتی کہ وہ اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں لگانے کے لیے تیار ہو جائے تو وہ ایک طرح کی پسپائی اختیار کرتا ہے اور ارتدادِ معنوی کا شکار ہو جاتا ہے اور اندر ہی اندر پیچھے ہٹنا شروع کرتا ہے۔ درحقیقت اسے یہ خیال نہیں ہوتا کہ میں منافق ہو گیا ہوں، بلکہ وہ سوچتا ہے کہ ان (سچے اہل ایمان) کو کیا ہو گیا ہے، خواہ مخواہ یہ لوگ جنگ کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، آخر صلح سے بھی تو کام چل سکتا ہے اور دشمن کو گڑ دے کر بھی تو مارا جا سکتا ہے، جبکہ یہ لوگ ہر وقت جنگ ہی کی فکر رکھتے ہیں۔ غزوۂ بدر کے موقع پر ان کا موقف تھا کہ جب اللہ نے فرما دیا ہے کہ دو میں سے ایک پر تمہیں ضرور فتح مل جائے گی تو قریش کے قافلے کی طرف کیوں نہیں چلتے جہاں بہت سامال و دولت ہے اور ان پچاس آدمیوں کے ہتھیار بھی ہمیں مل جائیں گے۔ مصلحت کا تقاضا تو یہ ہے کہ پہلے اُدھر جائیں! تو اصل میں وہ لوگ یہ نہیں سمجھ رہے ہوتے کہ ہم جھوٹے ہیں، یا ہم دھوکہ دے رہے ہیں، بلکہ یہ اصل میں مسلمانوں کے اندر ہی گڈمڈ ہوتے ہیں۔

چنانچہ سورۃ المنافقون ہی میں فرمایا گیا ہے: ﴿ذٰلِکَ بِاَنَّهُمۡ اٰمَنُوۡا ثُمَّ کَفَرُوۡا﴾ ''یہ اس لیے ہوا کہ یہ ایمان لائے، پھر کفر میں چلے گئے''۔ یعنی یہ ایمان تو لائے تھے خلوص کے ساتھ، نہ کہ دھوکہ دینے کے لیے، لیکن پھر رفتہ رفتہ ارتدادِ معنوی کا شکار ہو گئے اور پسپا ہوتے ہوتے کفر تک چلے گئے۔ یعنی ان کا یہ ارتداد اندر ہی اندر ہوتا ہے۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ انہیں ایک قانونی تحفظ تو حاصل رہتا ہے۔ جیسے دیمک کسی چوکھٹ یا شہتیر کو اندر سے تو چٹ کر چکی ہوتی ہے لیکن اوپر ایک تہہ چھوڑ دیتی ہے تاکہ دیکھنے والوں کو پتہ نہ چل جائے کہ اندر اس چوکھٹ یا شہتیر کے ساتھ کیا قیامت گزر رہی ہے۔ تو نفاق بھی دراصل یہی ہے جو باطن میں شروع ہوتا ہے۔

اس اعتبار سے اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عام معنی میں گناہگار اور اس قسم کے غیر شعوری منافق میں بس تعبیر کا فرق ہے۔ گناہگار بھی تو یہی ہوتا ہے جو جانتا ہے کہ یہ شے اللہ نے حرام کی ہے، پھر بھی اس کا ارتکاب کر رہا ہوتا ہے۔ تو اس وقت وہ بھی ایمان سے تہی ہوتا ہے! اس اعتبار سے جان لینا چاہیے کہ گناہگار اور ایسے منافق میں حقیقت کے اعتبار سے باریک سا پردہ ہے۔ یہ بات میں نے اس لیے بیان کی ہے کہ اس آیت میں ایک خاص اور اہم نکتہ ہے جو اِس کے بغیر سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

اب آگے چلیے! جب اہل ایمان آگے نکل جائیں گے تو یہ منافق مرد اور عورتیں ان سے کہیں گے: ﴿انۡظُرُوۡنَا نَقۡتَبِسۡ مِنۡ نُّوۡرِکُمۡ ۚ﴾ کہ ذرا ہمیں مہلت دو، ہمارا انتظار کرو، تاکہ ہم تمہارے نور سے استفادہ کر لیں، کچھ اقتباس کر لیں۔ ہم بھی اس سے فائدہ اٹھا کر پل صراط پر سے گزر جائیں۔ ﴿قِیۡلَ ارۡجِعُوۡا وَرَآءَکُمۡ فَالۡتَمِسُوۡا نُوۡرًا ؕ﴾ ''کہا جائے گا کہ اپنے پیچھے کی طرف لوٹ جاؤ اور نور تلاش کرو''۔ یعنی اگر تمہارے لیے ممکن ہے تو پیچھے دنیا کی طرف لوٹ جاؤ اور نور تلاش کر کے لے آؤ! اس لیے کہ یہ نور یہاں نہیں دیا گیا، بلکہ یہ دنیا کی زندگی میں کما کر ساتھ لایا گیا ہے۔ دنیا میں ایمان کا بھی کسب کرنا ہوتا ہے اور اعمالِ صالحہ تو ہیں ہی سراسر کسب۔ تو اگر تمہارے لیے بھی ممکن ہو تو لوٹ جاؤ پیچھے کی طرف اور یہ نور تلاش کرنے کی کوشش کرو۔

اہل ایمان اور منافقین کی تقطیب

آگے فرمایا: ﴿فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ؕ﴾ ''پھر ان کے مابین ایک فصیل حائل کر دی جائے گی' جس کا ایک دروازہ ہوگا''۔ یہ فصیل تو درحقیقت ایک فصل قائم کرنے کے لیے ہوگی۔ اہل ایمان آگے نکل گئے ہوں گے اور اِدھر یہ منافق پیچھے سے پکارتے ہی رہ جائیں گے۔ ان کے درمیان فاصلہ تو پہلے سے ہو گیا ہوگا' اب ان کے درمیان فصیل بھی حائل کر دی جائے گی۔ اس طرح اہل ایمان اور منافقین کی تقطیب (polarization) عمل میں آ جائے گی۔ اس در و دیوار کی کیفیت بایں الفاظ بیان کی جارہی ہے: ﴿بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ؕ﴾ ''اس کے اندر کی طرف رحمت ہوگی اور اس کے باہر عذاب ہوگا''۔ یعنی اس دیوار کے اندر کی طرف رحمت خداوندی کا نزول شروع ہو جائے گا' اہل ایمان کی ابتدائی مہمان نوازی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا' جبکہ اس فصیل کے باہر کی طرف عذاب کا آغاز ہو جائے گا۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ بَاطِنُهٗ اور ظَاهِرُهٗ کی ضمیر کا مرجع کیا ہے؟ بہت سے حضرات نے اس سے دروازہ مراد لیا ہے کہ اس دروازے کے اندر کی جانب اللہ کی رحمت کا نزول اور اس کے باہر کی جانب عذابِ خداوندی کا ظہور شروع ہو جائے گا۔ لیکن مجھے اس نقطۂ نظر میں کافی تامل تھا۔ اس مقام پر غور و فکر کے نتیجے میں میری جو رائے بنی ہے اس کی تائید مجھے امام رازی سے مل گئی ہے کہ اس ضمیر کی نسبت دروازے کی طرف نہیں ہے' بلکہ سُوْر (فصیل) کی طرف ہے۔ (واللہ اعلم!) یعنی اس فصیل کے اندر کی طرف اللہ کی رحمت ہوگی اور اس فصیل کے باہر کی طرف اللہ کا عذاب ہوگا۔

اہل سنت کے ایک عقیدے کی قرآنی بنیاد

اس مقام پر ایک خیال سا آتا ہے کہ اس فصیل میں دروازے کی کیا ضرورت ہو گی؟ لیکن آج مجھے اس پر انشراح ہوا ہے کہ یہاں دروازے کا تذکرہ کیوں ہے۔ یہ درحقیقت ہمارے اہل سنت کے ایک مجمع علیہ عقیدے کے لیے بنیاد ہے' جس کے لیے قرآن مجید میں اس کے علاوہ کہیں اور ذکر نہیں ہے۔ اہل سنت کا مجمع علیہ عقیدہ ہے کہ جس شخص کے دل میں ایمان کی کچھ رمق بھی ہوگی وہ اپنے گناہوں کی سزا پا کر بالآخر جہنم سے نکال لیا جائے گا۔ جہنم میں خُلود صرف ان کے لیے ہے جن کے دلوں میں سرے سے ایمان کی کوئی رمق نہیں ہوگی۔

جن غیر شعوری منافقین کا میں نے تذکرہ کیا ہے ان کے اور عام گناہگاروں کے مابین درحقیقت صرف ایک تعبیر کا فرق ہے' ورنہ جو تضاد اُن کی زندگیوں میں ہے وہی تضاد اِن کی زندگیوں میں بھی ہے۔ اس بارے میں مَیں سائیں عبدالرزاق صاحب کا یہ قول سنایا کرتا ہوں: ''جو دم غافل سو دم کافر!'' اور ارشادِ الٰہی ہے: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝﴾ (المائدۃ) ''اور جس نے اس کے مطابق فیصلہ نہ کیا جو اللہ نے نازل کیا ہے تو وہی تو کافر ہیں''۔ ہماری عدالتوں میں ہر روز نہ معلوم کتنے فیصلے قرآن وسنت کے خلاف ہو رہے ہیں۔ پورے ملک اور پوری اُمت مسلمہ کی سطح پر جو فیصلے ہو رہے ہیں وہ سب کے سب اللہ کی شریعت کے خلاف ہو رہے ہیں۔ قرآن کے فتوے کے مطابق تو ہم سب کے سب کافر ہیں۔ لہٰذا غیر شعوری منافق اور گناہگار میں کوئی فرق نہیں ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جو فصیل حائل کر دی جائے گی وہ ابدی نہیں ہے' بلکہ ان میں سے بھی جن کے اندر ایمان کی کچھ رمق ہوگی ان کو بہرحال وہاں سے نکلنا ہے۔ اس لیے یہاں پر صراحت کے ساتھ دروازے کا ذکر کیا گیا ہے' ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اس کا کوئی اور محل نہیں ہے۔ جن لوگوں نے اس مقام پر زیادہ غور و فکر نہیں کیا وہ کہتے ہیں کہ اہل ایمان اُس دروازے کے ذریعے سے جنت میں داخل ہوں گے' حالانکہ اس مرحلے کی پوری تصویر جب سامنے آتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ فصل تو پہلے سے قائم ہو چکا ہوگا' کیونکہ جن کے پاس نور ہوگا وہ تو آگے نکل جائیں گے اور دوسرے انہیں پکارتے رہ جائیں گے کہ ذرا ٹھہرو' اور پھر ان کے مابین فصیل قائم کر دی جائے گی۔ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ میں ''ف'' تاکید کے لیے ہے۔ لہٰذا یہ دروازہ اہل جنت کے جنت میں داخلے کے لیے نہیں ہے' بلکہ درحقیقت یہ دروازہ اب آئندہ ان لوگوں کے لیے ہے جن کے دلوں میں ایمان کی کچھ نہ کچھ رمق اور روشنی ہوگی' لیکن وہ

مجموعی طرزِ عمل کے اعتبار سے اس سزا کے مستحق ہو چکے ہوں گے۔ لہٰذا وہ اپنے گناہوں کے بقدر سزا پا کر باہر نکل آئیں گے۔ یہ اہل سنت کا اجتماعی عقیدہ ہے۔

اب قرآن کریم میں کہیں اور اس کا تذکرہ کیوں نہیں ہے' اسے بھی سمجھ لینا چاہیے۔ دراصل بعض چیزیں عقلی اعتبار سے اتنی بلند ہوتی ہیں کہ عام لوگوں کے سامنے ان کو بیان کرنا اُن کے لیے فتنے کا سبب بن سکتا ہے' لہٰذا اعلیٰ ترین فلسفیانہ مسائل کو قرآن حکیم نے بہت ہی خفیہ اور فلسفیانہ انداز میں بیان کیا ہے کہ سمجھنے والا سمجھ جائے گا' عقلمند کے لیے اشارہ کافی ہوتا ہے' لیکن عام آدمی اس مقام پر سے یہ سمجھ کر گزر جائے گا کہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اگر یہ بات بڑے اہتمام کے ساتھ آئی ہوتی تو عام آدمی بھی رک جاتا اور غور کرنے پر مجبور ہو جاتا' جبکہ اس کے اندر اس کی استعداد اور صلاحیت نہیں ہوتی۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے' جس میں سب کے لیے راہنمائی موجود ہے اور اس میں سب کی ضروریات کا احاطہ کیا گیا ہے' جبکہ دین کے بعض حقائق ایسے ہیں کہ ان کو زیادہ عام کر دیا جائے تو لوگوں میں بےعملی پیدا ہو جائے گی۔ ویسے تو یہ تصور کرنا بھی ہمارے لیے ممکن نہیں ہے کہ ایک لمحے کے لیے بھی جہنم کا داخلہ کس درجے شدائد اور مصائب کا ذریعہ بن جائے گا' لیکن اگر آدمی یہ سمجھ لے کہ ایمان کی کوئی رمق بھی ہوئی تو بالآخر جہنم سے نکل جائیں گے تو اس سے خواہ مخواہ اس کے اعصاب ڈھیلے پڑتے ہیں اور اس کے اندر عمل کا جذبہ کمزور پڑتا۔ لہٰذا یہ مضمون قرآن مجید میں شرح و بسط کے ساتھ نہیں آیا۔ اسی طرح سورۃ الفرقان میں ایک مقام ایسا آیا ہے کہ اس سے قرآن مجید میں عذابِ قبر کا ثبوت مل جاتا ہے' ورنہ قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ عذابِ قبر کا تذکرہ نہیں ہے۔ وہاں فرمایا گیا ہے: ﴿یُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ﴾ ''دوگنا کیا جائے گا اس کے لیے عذاب قیامت کے دن''۔ معلوم ہوا کہ قیامت سے پہلے بھی عذاب کی کوئی شکل ہے' جب ہی تو وہ دوگنا کیا جائے گا۔

مسلمان معاشرے میں منافق کا قانونی و دستوری سٹیٹس؟

اب ذرا چشم تصور سے دیکھئے کہ اہل ایمان آگے نکل گئے' منافقین اِدھر رہ گئے اور درمیان میں فصیل حائل ہوگئی۔ ﴿یُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَکُنْ مَّعَکُمْ﴾ ''وہ انہیں پکار کر کہیں گے: کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟'' یہ اس امرِ واقعہ کی تعبیر ہے کہ دنیا میں منافق اور مؤمن' گناہگار اور متقی سب گڈمڈ ہیں' سب قانونی طور پر مسلمان ہیں' بلکہ مسلمان معاشرے میں منافق اور مؤمن کے اور متقی اور فاسق کے قانونی اور دستوری حقوق بالکل برابر ہیں۔ دنیا میں ان کے مابین معاشرتی' سیاسی اور دستوری حقوق میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس لیے کہ قانونی تقسیم تو بہرحال ایک ہی ہے' سب مسلمان شمار ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں امامِ اعظم امام ابوحنیفہؒ کا موقف ہے کہ: اَلْاِیْمَانُ قَوْلٌ لَا یَزِیْدُ وَلَا یَنْقُصُ یعنی ایمان تو زبانی اقرار کا نام ہے' جو نہ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے۔ ان کی مراد حقیقی ایمان نہیں بلکہ قانونی ایمان ہے' جو انسان کو ایک قانونی و دستوری status دیتا ہے' اور وہ گھٹتا یا بڑھتا نہیں ہے' بلکہ جامد ہے۔ جبکہ حقیقی ایمان کا فیصلہ اللہ کے حضور جا کر ہوگا اور اس کا نور میدانِ حشر میں ظاہر ہوگا۔ کوئی متقی ہے تو اللہ کے ہاں اجر لے گا' فاسق ہے تو وہاں سزا بھگتے گا۔ یہاں تو مسلمان کی حیثیت سے سب برابر ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے ''اَلْمُسْلِمُ کُفُوٌ لِکُلِّ مُسْلِمٍ'' یعنی تمام مسلمان آپس میں مرتبہ اور سٹیٹس کے اعتبار سے بالکل ہم پلہ ہیں' قانونی اور دستوری حیثیت سب کی برابر ہے۔

میدانِ حشر میں جب چھلنی لگے گی اور حقیقی مؤمن اور محض نام کے مسلمانوں کے مابین تفریق ہو جائے گی تو یہ لوگ حقیقی اہل ایمان کو پکار پکار کر کہیں گے کہ کیا دنیا میں ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ آج تمہارے اور ہمارے مابین اتنا فرق و تفاوت کیوں ہے؟ کیا ہم بھی مسجد نبویؐ میں تمہارے ساتھ نمازیں ادا نہیں کرتے تھے؟ ظاہر ہے کہ یہ لوگ اہل ایمان میں گڈمڈ تھے۔ یہ تو جب اُحد کا موقع آیا تو معلوم ہوا کہ کون کیا ہے' جب رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی تین سو آدمیوں کو لے کر میدانِ جنگ سے واپس آ گیا۔ معلوم ہوا کہ جب تک آزمائش نہ ہو دنیا میں اصل اہل ایمان اور جھوٹ موٹ کے مسلمان کے مابین تمیز نہیں ہو سکتی۔ ورنہ تو دنیا میں وہ برابر تھے۔ یہاں تک کہ حضورﷺ نے عبداللہ بن اُبی کی نماز جنازہ ادا کی ہے اور اس کی تدفین کے لیے اپنا کرتہ عنایت کیا ہے۔ اس لیے کہ اس کے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عبداللہ بن اُبی مؤمن

صادق تھے' انہوں نے آ کر درخواست کی کہ حضور! میرے باپ کا انتقال ہو گیا ہے' آپ اپنا کرتہ عنایت فرما دیں تو میں اسے اس کا کفن دے دوں۔ حضورﷺ نے کرتہ عنایت فرما دیا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ حضورؐ! آپ اس منافق کے لیے کرتہ دے رہے ہیں! آپؐ نے فرمایا: ''عمر! میرا کرتہ اسے خدا کے عذاب سے بچا نہیں سکے گا''۔ رسول اللہﷺ کی مروّت اور شرافت سے بعید تھا کہ آپؐ ایک مؤمن صادق کی درخواست ردّ کر دیتے۔ گویا مرنے کے بعد بھی قبر میں اترنے تک اسے ''مسلم'' کا لیگل سٹیٹس حاصل رہا۔

راہِ ''نفاق'' کے سنگ ہائے میل اور فتنے کی تین نسبتیں

منافقین کی پکار کے جواب میں اہل ایمان کا جواب نقل ہوا: ﴿قَالُوْا بَلٰى﴾ ''(اہل ایمان) کہیں گے: کیوں نہیں!'' اب آگے جو الفاظ آ رہے ہیں وہ علم و معرفت اور تفقہ کا بہت بڑا خزانہ ہیں۔ فرمایا: ﴿وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ﴾ ''لیکن تم نے اپنے آپ کو (اپنے ہاتھوں) فتنے میں ڈالا''۔ اب اہل ایمان جواب دے رہے ہیں کہ دنیا میں تو تم ہمارے ساتھ ہی تھے' اس میں کوئی شک نہیں' لیکن تم نے اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں فتنے میں ڈالا۔

فتنے کی تین نسبتیں ہیں جنہیں اچھی طرح نوٹ کر لینا چاہیے۔ کہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم نے تمہیں فتنے میں ڈالا۔ مثلاً: ﴿وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ (العنکبوت:۳) ''اور ہم نے فتنے میں ڈالا ہے ان کو جو اِن سے پہلے تھے''۔ اللہ تعالیٰ اپنی طرف نسبت فرما رہا ہے کہ جو اِن سے پہلے تھے انہیں بھی ہم نے فتنے میں ڈالا تھا۔ یہ ہمارا قاعدہ رہا ہے کہ ہم آزما کر ظاہر کر دیں کہ کون کھرا ہے' کون کھوٹا ہے' کون حقیقتاً مؤمن ہے اور کون جھوٹ موٹ کا مدعیٔ ایمان ہے۔ تو اصل امتحان اللہ کی طرف سے ہے۔ لیکن مکہ میں اہل ایمان کا یہ امتحان کن کے ہاتھوں آ رہا تھا؟ ابوجہل اور دیگر کفار کے ہاتھوں! تو گویا دوسری نسبت ان کفار کی طرف ہو گئی جو مسلمانوں کو ستا رہے تھے اور انہیں فتنے میں ڈال رہے تھے۔ جیسا کہ سورۃ البروج میں فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ﴾ ''وہ لوگ جنہوں نے اہل ایمان مردوں اور عورتوں کو فتنوں میں مبتلا کیا اور پھر اس سے توبہ نہیں کی یقیناً ان کے لیے جہنم کا عذاب اور جلائے جانے کی سزا ہے''۔ جو لوگ اہل ایمان کو آزمائشوں میں ڈالتے ہیں' انہیں ستاتے اور تکالیف میں مبتلا کرتے ہیں' اگر مرنے سے پہلے پہلے انہوں نے توبہ کر لی اور ایمان لے آئے تب تو پچھلا کیا دھرا سارا معاف ہو جائے گا' ورنہ ان کے لیے عذابِ جہنم ہے۔

تیسری نسبت یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو خود فتنے میں ڈالتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ اہل وعیال اور مال و متاعِ دُنیوی کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور ان کی محبت کو اللہ کی محبت پر ترجیح دیتے ہیں وہ اپنے آپ کو فتنے میں مبتلا کر لیتے ہیں۔ سورۃ التغابن میں ارشادِ الٰہی ہے: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ﴾ (آیت۱۴) ''اے ایمان والو! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں' ان سے ہوشیار رہو''۔ مزید فرمایا: ﴿اِنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ (آیت ۱۵) ''یقیناً تمہارے مال اور تمہاری اولاد (تمہارے لیے) فتنہ ہے''۔ یعنی اگر تم اپنے اہل وعیال سے اللہ کی محبت کے ماتحت رہتے ہوئے محبت کرو تو ٹھیک ہے' یہ بھی فطری محبتیں ہیں اور دُنیوی ضرورت ہے' لیکن جہاں ان میں سے کسی ایک کی محبت بھی اللہ کی محبت سے بالا ہو گئی تو گویا تم نے اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں فتنے میں مبتلا کر دیا۔ یہ انسان کے اپنے عمل پر منحصر ہے۔ تو حقیقی اہل ایمان منافقین کو جواب دیں گے: ﴿وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ﴾ ''لیکن تم نے اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں فتنے میں ڈالا''۔ ﴿وَتَرَبَّصْتُمْ﴾ ''اور پھر تم گومگو کی کیفیت میں مبتلا ہو گئے''۔

تَرَبُّص کے معنی ''انتظار'' کے بھی ہیں کہ آدمی کسی جگہ پر ٹھٹک کر کھڑا ہو جائے۔ کوئی تو ایسا ہوتا ہے کہ جس کی ہرچہ بادا باد والی کیفیت ہوتی ہے' جبکہ کوئی ایسا ہوتا ہے کہ کسی وجہ سے ٹھٹک کر کھڑا ہو جاتا ہے کہ چلوں نہ چلوں؟ آگے بڑھوں نہ بڑھوں؟ یہ اصل میں تَرَبُّص ہے۔ یہ لوگ ''تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو!'' کے مصداق حالات کا

انتظار کرتے ہیں کہ حالات میں کیا تبدیلی آتی ہے۔ تمام صورتوں کو دیکھ بھال کر‘ دائیں بائیں اور آگے پیچھے دیکھتے ہوئے‘ اچھی طرح سوچ سمجھ کر‘ سنبھل کر اور بچ بچ کر چلتے ہیں۔ جیسے کہا گیا ہے: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ﴾ (الحج:۱۱) ’’لوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جو اللہ کی بندگی کرتا ہے کنارے کنارے‘‘۔ یہ لوگ منجدھار میں نہیں کودنا چاہتے۔ ﴿فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ﴾ ’’پھر اگر اسے کوئی خیر پہنچے تو اس سے مطمئن ہو جاتا ہے اور اگر اسے کوئی آزمائش (تکلیف) پہنچے تو اپنے چہرے کے بل واپس پلٹتا ہے۔ اس نے دنیا اور آخرت (دونوں) کا خسارہ اٹھایا‘‘۔ یعنی یہ لوگ بچ بچ کر اور کنارے کنارے چلنا چاہتے ہیں‘ منجدھار میں نہیں جانا چاہتے۔ اگر بس خیر رہے تو مطمئن ہیں اور اگر کہیں کوئی امتحان آ گیا‘ آزمائش آ گئی تو اوندھے مُنہ گر پڑتے ہیں۔ ان کے اس طرزِ عمل کے بارے میں فرمایا گیا کہ یہ دنیا اور آخرت دونوں کے خسارے کا سودا ہے۔ تو یہاں فرمایا گیا کہ جب تم نے اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں فتنے میں ڈالا اور مال و اولاد‘ اہل وعیال‘ علائقِ دُنیوی‘ جائیداد‘ پروفیشنز‘ ان تمام چیزوں کی محبت تم پر غالب آ گئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تم تَرَبُّص اور گومگو کی کیفیت میں مبتلا ہو گئے کہ آگے بڑھیں یا نہ بڑھیں! کہیں ایسا نہ ہو جائے‘ کہیں ویسا نہ ہو جائے! یہ حقیقت ہے کہ انسان کے اندر نیکی کا جذبہ بھی موجود ہے‘ لیکن وہ تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے۔ بقول غالب: ؎

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے!

منافقین کی اس کیفیت کے لیے سورۃ النساء میں الفاظ آئے ہیں: ﴿مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ﴾ کہ یہ مذبذب ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور سورۃ التوبۃ میں فرمایا: ﴿فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ۝﴾ ’’وہ اپنے شکوک و شبہات میں متردّد ہو کر رہ گئے‘‘۔ یہاں آگے فرمایا: ﴿وَارْتَبْتُمْ﴾ ’’اور تم شکوک و شبہات میں مبتلا ہو گئے‘‘۔ یعنی اپنے آپ کو فتنے میں ڈالنے کا تیسرا نتیجہ یہ ہے کہ ایمان کی جو پونجی تمہیں نصیب ہوئی تھی اس میں شکوک و شبہات کے کانٹے چبھنے شروع ہو گئے کہ ہم اپنا سب کچھ یہاں کھپا دیں اور معلوم نہیں کہ اس کا کچھ بدلہ بھی ملے گا یا نہیں! پتہ نہیں آخرت ہو گی بھی یا نہیں۔ یقین تو نہیں ہے‘ کسی نے دیکھا تو نہیں۔ اس لیے کہ یہ سارا ادھار کا سودا ہے۔ جیسے سورۃ التوبۃ میں فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۭ﴾ ’’اہل ایمان سے اللہ نے ان کے مال اور جانیں خرید لیے ہیں جنت کے عوض‘‘۔ جنت تو ملے گی آخرت میں‘ یہاں تو نہیں ملے گی۔ یہ تو ادھار کا سودا ہے اور ادھار کے سودے پر آدمی کچھ نہ کچھ تو متردّد ہوتا ہے۔ اگر نقد سودا ہو تو ٹھیک ہے کہ ہاتھ سے ایک چیز دی اور دوسری لے لی‘ مبادلہ فوراً ہو گیا‘ لیکن یہ تو ادھار کا سودا ہے۔ تو اس تَرَبُّص کے نتیجے میں ایمان کی پونجی برف کی طرح پگھلنا شروع ہو گئی۔

اپنے آپ کو فتنے میں ڈالنے کے سبب جو تَرَبُّص پیدا ہوتا ہے اس حوالے سے سورۃ التوبۃ کی آیت ۲۴ بڑی اہم ہے۔ فرمایا:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝﴾

’’(اے نبیﷺ!) ان سے کہہ دیجیے کہ اگر تمہیں اپنے باپ‘ اپنے بیٹے‘ اپنے بھائی‘ اپنی بیویاں‘ اپنے رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے بڑی محنت سے کمائے (اور جمع کیے) ہیں‘ اور وہ کاروبار جن کے کساد (اور مندے) کا تمہیں اندیشہ رہتا ہے (جو بڑی مشقت سے تم نے جمائے ہیں) اور وہ رہائش گاہیں (جائیدادیں‘ بلڈنگیں‘ حویلیاں اور کوٹھیاں) جو تمہیں بڑی پسند ہیں‘ (یہ آٹھ چیزیں) اگر محبوب تر ہیں (تین چیزوں سے) اللہ سے‘ اللہ کے رسول سے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے‘ تو جاؤ انتظار کرو‘ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ (عذاب) لے آئے‘ اور اللہ ایسے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا‘‘۔

یہ گویا ایک ترازو ہے جسے ہر شخص اپنے باطن میں نصب کر لے۔ ایک پلڑے میں آٹھ چیزیں ڈالیں جن میں سے پانچ علائقِ دُنیوی ہیں‘ یعنی باپ‘ بیٹا‘ بھائی‘ بیوی اور رشتہ دار —— باقی ہر انسان تو اس کے بعد ہی آتا ہے —— اور تین چیزیں دُنیوی مال و اسباب میں سے

ہیں' نقد مال و دولت' کاروبار اور اثاثہ جات یعنی بلڈنگ یا جائیداد وغیرہ۔ اور ترازو کے دوسرے پلڑے میں تین کی محبت ڈالیں' یعنی اللہ کی محبت' رسولؐ کی محبت اور اللہ کی راہ میں جہاد کی محبت۔ پھر دیکھیں کہ کون سا پلڑا بھاری ہے! اگر یہ آٹھ والا پلڑا بھاری ہے تو اس صورت میں ''فَتَرَبَّصُوْا'' جاؤ' انتظار کرو! یہ وہی لفظ تَرَبُّص ہے جو زیر درس آیت میں ہے۔ اب تَرَبُّص اور گومگو کی کیفیت تو لازماً ہوگی کہ چلوں نہ چلوں۔ اس آیت میں مذکور علائقِ دُنیوی کو اقبال نے ایک شعر میں جمع کیا ہے۔

یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں ' لا الٰہ الا اللہ!

جان لیجیے کہ یہ تَرَبُّص اور اِرتیاب ایک دن میں نہیں ہو جاتا' بلکہ یہ رفتہ رفتہ اور تدریجاً پسپائی کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس کے بعد ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ آدمی ایمان سے بالکل خالی ہو جاتا ہے۔ جیسے سورۃ المنافقون میں فرمایا گیا: ﴿ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا﴾ ''یہ اس لیے ہوا کہ وہ پہلے ایمان لے آئے' پھر کفر میں چلے گئے''۔ یا یہ کہ ایمان اتنا کمزور رہ جاتا ہے کہ وہ عمل پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس صورت میں پھر عمل میں تناقض اور تضاد ہوتا ہے۔ آدمی کہتا کچھ ہے اور کرتا کچھ ہے۔ جیسے سورۃ الصّف کی آیت ۲ میں فرمایا گیا ہے: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾ ''اے اہل ایمان! وہ کہتے کیوں ہو جو کرتے نہیں ہو''۔ یعنی قول وفعل میں تضاد۔

یہاں مختلف کیفیات کے مابین حرفِ عطف آیا ہے۔ عطف میں مغائرت تو ہوتی ہے لیکن لازمی نہیں ہوتا کہ اس میں زمانی ترتیب بھی ہو۔ البتہ اس آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ترتیبِ زمانی بھی ہے' اور وہ اس طرح کہ ایک چیز کے نتیجے میں دوسری چیز واقع ہو رہی ہے' دوسری چیز کے نتیجے میں تیسری چیز اور پھر تیسری چیز کے نتیجے میں چوتھی چیز واقع ہو رہی ہے۔ ان آیاتِ مبارکہ کی درحقیقت یہی عظمت ہے۔ اسی سورۂ مبارکہ کی آیت ۲۰ میں بھی یہی انداز ہے اور وہ بھی اس سورۂ مبارکہ کی عظیم ترین آیات میں سے ہے۔ یہاں فرمایا گیا: ﴿وَلٰـکِنَّـکُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَکُمْ﴾ ''لیکن تم نے اپنے آپ کو (اپنے ہاتھوں) فتنے میں مبتلا کیا''۔ یعنی تم نے علائق دُنیوی اور مال واسباب دُنیوی سے تعلق جائز حد تک نہیں رکھا' بلکہ اس کو حد سے بڑھنے دیا۔ ﴿وَتَرَبَّصْتُمْ﴾ ''اور (اس کے نتیجے میں) تم گومگو کی کیفیت میں مبتلا ہو گئے''۔ تم تردّد اور تذبذب کی کیفیت میں مبتلا ہو گئے۔ ﴿وَارْتَبْتُمْ﴾ ''اور (اس تذبذب کے نتیجے میں) تمہارے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا ہو گئے''۔

جیسے یہ ایک حقیقت ہے کہ عمل صالح سے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور ایمان سے عمل صالح میں اضافہ ہوتا ہے بالکل ایسے ہی برائی کا معاملہ ہے کہ ایک برائی کے نتیجے میں ایک اور برائی جنم لیتی ہے اور پھر اس کے نتیجے کے طور پر برائی اور خرابی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ تو یہاں بھی درجہ بدرجہ پسپائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایمان کی جتنی تھوڑی بہت پونجی حاصل تھی اس میں شکوک وشبہات کے کانٹے چبھنے شروع ہو گئے۔ درحقیقت ایمان لانے کے بعد پھر ثابت قدمی کی ضرورت ہوتی ہے۔ سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ میں ایک مؤمن صادق کی تعریف یوں کی گئی ہے: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا﴾ ''حقیقی (اور سچے) مؤمن تو صرف وہ ہیں جو اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائے' پھر شک میں نہیں پڑے''۔ ﴿وَجٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ؕ﴾ ''اور انہوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے''۔ ﴿اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ﴾ ''یہی لوگ ہیں سچے (اپنے دعوائے ایمان میں)''۔

خوشنما عقائد وخواہشات' شیطان کی پُرفریب چالیں

آگے فرمایا: ﴿وَغَرَّتْکُمُ الْاَمَانِیُّ﴾ ''اور تمہیں آرزوؤں نے دھوکے میں ڈالے رکھا''۔ یہ چوتھا مرحلہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو کچھ من گھڑت اور خوشنما عقائد سے بہلاتا ہے۔ اَمَانِیُّ لفظ اُمْنِیَّۃٌ کی جمع ہے اور اسی مادے سے لفظ ''تمنا'' بنا ہے' یعنی خواہشات' آرزوئیں۔ انگریزی میں انہیں ''wishful thinkings'' کہتے ہیں۔ اس کی مثالیں یہود کے عقائد میں موجود ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے: ﴿سَیُغْفَرُ لَنَا﴾ ''عنقریب ہمیں معاف کر دیا جائے گا''۔ اللہ ہمیں بخش دے گا' وہ بخشنہار ہے' ہمیں تو بخش ہی دیا جائے گا۔ ہم میں سے بھی ایک گروہ ہے جو کہتا ہے آخر کچھ بھی ہیں کلمہ گو ہیں' کچھ بھی

ہیں محمدﷺ کے نام لیوا تو ہیں۔ وہ یہ بھی کہا کرتے تھے: ﴿لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ﴾ ''ہمیں آگ ہرگز نہیں چھوئے گی مگر گنتی کے چند دن'' اور ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَاَحِبَّآؤُہٗ﴾ ''ہم تو (گویا) اللہ کے بیٹے اور اس کے بڑے چہیتے ہیں''۔ آخر ہم ابراہیمؑ کی نسل سے ہیں' تو کیا اللہ تعالیٰ ابراہیمؑ کا بھی کچھ لحاظ نہیں کرے گا جس کو کہ اُس نے اپنا دوست کہا ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ ہیں: ﴿وَاتَّخَذَ اللّٰہُ اِبْرٰھِیْمَ خَلِیْلًا﴾ ''اور اللہ نے ابراہیم کو دوست بنا لیا''۔ تو کیا اللہ اپنے دوست کی اولاد کی کوئی فکر نہیں کرے گا؟ ہمارے ساتھ عام لوگوں والا معاملہ نہیں ہوگا' بلکہ خاص معاملہ ہوگا۔ تو یہ سب ان کی اَمَانِی ہیں۔ قرآن جہاں کہیں ان کے عقائد نقل کرتا ہے تو ساتھ ہی فرماتا ہے: ﴿تِلْکَ اَمَانِیُّھُمْ﴾ کہ یہ ان کی wishful thinkings ہیں' یہ ان کے من گھڑت خیالات ہیں۔ ﴿قُلْ ھَاتُوْا بُرْھَانَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ ''(اے نبی! ان سے) کہئے کہ لاؤ دلیل اگر تم (اپنے دعوے میں) سچے ہو''۔ کہیں تورات میں اللہ نے یہ گارنٹی تمہیں دی ہے؟ تو یہ انسان کی اَمانی اور من گھڑت عقائد اسے طفل تسلیاں دیتے ہیں۔

آخری بات یہ فرمائی: ﴿حَتّٰی جَآءَ اَمْرُ اللّٰہِ﴾ ''یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آ گیا''۔ یہ وہی الفاظ آ گئے ہیں جو سورۃ التوبۃ کی آیت ۲۴ میں ہیں: ﴿فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ﴾ ''جاؤ' انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ لے آئے''۔ یعنی یہ جو حق و باطل کی کشمکش ہو رہی ہے اس کے ضمن میں اللہ کا فیصلہ آ جائے۔ دوسرے یہ کہ اللہ کا فیصلہ موت بھی ہے' اللہ کا فیصلہ قیامت بھی ہے۔ آگے فرمایا: ﴿وَغَرَّکُمْ بِاللّٰہِ الْغَرُوْرُ﴾ ''اور وہ بڑا دھوکے باز (شیطان) تمہیں اللہ کے معاملے میں دھوکہ دیتا رہا''۔ یہاں نوٹ کیجیے کہ یہ لفظ 'غرور' 'غ' کے زبر (َ) کے ساتھ ہے اور یہ فَعُول کے وزن پر مبالغے کا صیغہ ہے' جس کا مطلب ہے بہت بڑا دھوکے باز۔ اس کے علاوہ ایک لفظ 'غُرور' ہے جو 'غ' کے پیش (ُ) کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہم اردو میں بھی غُرور کا لفظ استعمال کرتے ہیں کہ اسے بڑا غُرور ہے۔ اور مغرور اس سے اسم الفاعل ہے۔ تو فرمایا جا رہا ہے کہ ''تمہیں خوب دھوکہ دیا اس بہت بڑے دھوکے باز نے''۔ اس سے شیطان لعین مراد ہے۔ یہ شیطان لعین بھی انسان کو مزید لوریاں دے دے کر سلاتا ہے۔ اور اس کی لوری یہ ہے کہ اللہ بڑا غفور ہے' وہ کہاں سزا دے گا! وہ تو لوگوں کو ایسے ہی ڈرانے کے لیے کہتا ہے تاکہ وہ سیدھے ہو جائیں۔ ورنہ کیا ماں اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں جہنم میں ڈال سکتی ہے؟ تو جو خالق و مالک ہے وہ یہ کیسے کر سکتا ہے! یہ تو صرف کہنے کی باتیں ہیں' ہونے والی باتیں نہیں ہیں! یہ عقائد ہمارے ہاں بھی ملنگ قسم کے صوفیوں میں موجود ہیں۔ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کا صرف ڈراوا ہی ہے' وگرنہ ایسا نہیں ہوگا۔ اللہ تو بڑا کریم ہے' بڑا نکتہ نواز اور بندہ نواز ہے' وہ بڑا ہی غفور اور رحیم ہے' لہٰذا اس کے بارے میں یہ گمان نہ کرو کہ وہ تمہیں عذاب دے گا۔ سورۃ الانفطار پوری کی پوری ان کے اسی عقیدے کی تردید میں ہے۔ فرمایا: ﴿یٰٓاَیُّھَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْمِ﴾ ''اے انسان! کس شے نے تجھے دھوکہ دیا ہے اپنے ربّ کریم کے بارے میں؟'' وہ کریم بھی ہے' اس میں کوئی شک نہیں' لیکن وہ عزیزٌ ذوانتقام (انتقام لینے میں سخت) بھی ہے۔ وہ قہار بھی ہے' وہ شدیدُ العِقَاب (سخت سزا دینے والا) بھی ہے۔ اس کی تو تمام شانیں ہیں اور ان تمام شانوں کو اپنے سامنے مستحضر رکھنا ضروری ہے۔

بندۂ مؤمن کا معاملہ اللہ کے ساتھ ''بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ'' والا رہنا چاہیے کہ اس کی شانِ غفاری سے امید بھی ہو کہ اللہ بخش دے گا' لیکن اس کی سزا کا اندیشہ اور خطرہ بھی رہے۔ اس طرح رویہ متوازن رہے گا۔ اگر ذرا سا بھی رویہ غیر متوازن ہو گیا اور اللہ کی شانِ رحیمی اور شانِ غفاری پر تکیہ زیادہ ہو گیا تو نتیجتاً تم ڈھیلے ہو جاؤ گے' تمہارے اعصاب ڈھیلے پڑ جائیں گے۔ اس لیے کہ پھر آدمی خیال کرتا ہے کہ وہ کاہے کو زیادہ کھکھیڑ مول لے' کاہے کو زیادہ قربانیاں دے' کاہے کو زیادہ مشقتیں جھیلے' کاہے کو پیٹ پر پتھر باندھے' کاہے کو اپنی معاش کے دروازے تنگ کرتا چلا جائے' کاہے کو اپنے لیے دُنیوی ترقی کے راستے مسدود کرے؟ ظاہر بات ہے یہ سب کچھ تو وہی کرے گا جو سمجھے گا کہ مسئولیت لازماً ہونی ہے' ورنہ اللہ کی طرف سے پکڑ اور عذاب کا شدید خطرہ ہے۔

یہ مضمون اتنا اہم ہے کہ سورۂ لقمان اور سورۂ فاطر میں اس پر پوری پوری آیتیں آئی ہیں۔ سورۂ لقمان میں فرمایا گیا ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا یَوْمًا لَّا یَجْزِیْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ ۡ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَیْـًٔا ؕ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا ۥ وَلَا یَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۳۳﴾

"اے لوگو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور ڈرو اس دن سے جس دن کوئی باپ اپنے بیٹے کی طرف سے کوئی بدلہ (فدیہ' کفارہ وغیرہ) نہیں دے سکے گا' اور نہ ہی کوئی بیٹا اپنے باپ کے کسی درجے میں کام آ سکے گا۔ (یاد رکھو!) یقیناً اللہ کا وعدہ حق ہے۔ تو (دیکھنا) تمہیں دنیا کی زندگی دھوکہ نہ دینے پائے' اور (دیکھنا) تمہیں اللہ (کی شانِ رحیمی اور شانِ غفاری) پر دھوکہ نہ دے یہ بڑا دھوکے باز (شیطانِ لعین)"۔

اس کا خلاصہ سورۂ فاطر میں یوں ذکر ہوا ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا ۥ وَلَا یَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۵﴾

"اے لوگو! اللہ کا وعدہ یقیناً سچا ہے (شدنی ہے' جزا و سزا ہو کر رہے گی)۔ تو (دیکھنا) تمہیں یہ دنیا کی زندگی دھوکے میں نہ ڈال دے اور (دیکھنا) وہ بہت بڑا دغاباز (شیطان لعین) تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکہ نہ دینے پائے"۔

ایک اور جگہ قیامت کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے: ﴿اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِیَةٌ﴾ کہ قیامت لازماً آ کر رہے گی اور حساب و کتاب ہو کر رہے گا۔ اور: ﴿وَاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ﴾ کہ جزا و سزا واقع ہو کر رہیں گے' اس میں کسی طرح کا شک و شبہ نہ پیدا ہونے پائے۔

بہرحال یہ نفاق کے وہ پانچ مدارج ہیں جن میں ایک صاحب ایمان مبتلا ہو سکتا ہے۔ یعنی یہ اُس آدمی کا نفاق نہیں ہے جو دھوکہ دینے کے لیے ہی ایمان لایا ہو' بلکہ یہ ایسا نفاق ہے کہ آدمی ایمان تو لاتا ہے خلوصِ دل سے' لیکن پھر اُس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا' بلکہ بچ بچ کر چلنا چاہتا ہے' جبکہ ایمان تو قربانیاں مانگتا ہے۔ ع "جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں!" بچ بچ کر چلنے والوں کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ ع "مرحلہ سخت ہے اور جان عزیز!" چنانچہ وہ ایک طرح کی باطنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بقول غالب ع "کعبہ مرے پیچھے ہے' کلیسا مرے آگے!"

منافق کا حسرت ناک انجام

اب اس نفاق کا انجام کیا ہے! فرمایا: ﴿فَالْیَوْمَ لَا یُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْیَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ﴾ "تو آج کے دن نہ تم سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا نہ کافروں سے"۔ یہ بہت پیارا انداز ہے۔ یہاں منافقوں کو کافروں کے ساتھ بریکٹ کر دیا گیا ہے۔ اصل میں یہ جواب ہے ان کے اس قول کا کہ: ﴿اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ؕ﴾ "کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟" تو فرمایا جا رہا ہے کہ دنیا میں تم یقیناً اہل ایمان کے ساتھ تھے' چونکہ تم قانونی طور پر مسلمان تھے لہٰذا ان کے ساتھ شامل رہے' یہاں تک کہ حضورﷺ کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے۔ لیکن یہاں تم انجام کے اعتبار سے کفار کے ساتھ شامل ہو۔ دراصل یہی نفاق ہے کہ قانوناً تو ایسا شخص دنیا کی زندگی میں مسلمان سمجھا جاتا ہے' جبکہ حقیقتاً' عاقبت اور انجامِ کار کے اعتبار سے وہ کفار کے ساتھ ہے۔ آگے فرمایا جا رہا ہے: ﴿مَاْوٰىكُمُ النَّارُ﴾ "تمہارا ٹھکانہ جہنم ہے"۔ نوٹ کیجیے کہ قرآن مجید میں طنز کا پہلو بھی ہے۔ آویٰ' یُؤْوِیْ' اِیْوَاءً کا مطلب ہے "کسی کو پناہ دینا"۔ اس سے لفظ "مَاْوٰی" بنا ہے جس سے مراد ہے پناہ گاہ' جس کی طرف انسان کسی خطرے سے بچنے کے لیے دوڑتا اور لپکتا ہے۔ طوفان سے بچنے کے لیے اگر کسی نے پہاڑ کے اندر کوئی جگہ تلاش کر لی تو وہ اس کے لیے "ماویٰ" ہے۔ تو فرمایا: ﴿مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ؕ﴾ کہ اب تمہاری پناہ گاہ یہی آگ ہے۔ ﴿هِیَ مَوْلٰىكُمْ ؕ﴾ "یہی تمہاری خبرگیری کرنے والی ہے"۔ یہاں 'مولیٰ' کا لفظ بھی طنزاً استعمال ہوا ہے۔ مولیٰ کا مطلب ہے ہمدرد' غم گسار' مددگار' دوست' پشت پناہ' ساتھی وغیرہ۔ لہٰذا فرمایا: ﴿هِیَ مَوْلٰىكُمْ ؕ﴾ کہ یہی آگ تمہاری ہمدرد اور غمگسار ہے' دکھ درد کہنا ہے تو اس سے کہو' نالہ و شیون ہے تو اسی سے کرو۔ مزید فرمایا: ﴿وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ۝﴾ "اور یہ بہت ہی بری ہے لوٹنے کی جگہ"۔ "مَصِیْر" کا مطلب ہے جانے کی جگہ' وہ جگہ جہاں انسان انجامِ کار پہنچا دیا جائے۔

بابِ پنجم
مشتمل بر

سورۃ الحدید کی آیات ۱۶ تا ۱۹

❁

مسلمانوں کو آمادۂ عمل کرنے کے لیے ترغیب وترہیب

اور

سلوکِ قرآنی......منزل بمنزل

☆

سلوکِ قرآنی کا اصل الاصول: انفاق

ترقی کے امکانات: مراتبِ صدّیقیت وشہادت کا حصول!

اعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰن الرَّجیم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اَلَمۡ یَاۡنِ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ تَخۡشَعَ قُلُوۡبُھُمۡ لِذِکۡرِ
اللّٰہِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الۡحَقِّ ۙ وَلَا یَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ
اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلُ فَطَالَ عَلَیۡھِمُ الۡاَمَدُ فَقَسَتۡ
قُلُوۡبُھُمۡ ؕ وَکَثِیۡرٌ مِّنۡھُمۡ فٰسِقُوۡنَ Π اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ
یُحۡیِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِھَا ؕ قَدۡ بَیَّنَّا لَکُمُ الۡاٰیٰتِ
لَعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ Θ اِنَّ الۡمُصَّدِّقِیۡنَ وَالۡمُصَّدِّقٰتِ
وَاَقۡرَضُوا اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا یُّضٰعَفُ لَھُمۡ وَلَھُمۡ
اَجۡرٌ کَرِیۡمٌ P وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖۤ اُولٰٓئِکَ
ھُمُ الصِّدِّیۡقُوۡنَ ٭ۖ وَالشُّھَدَآءُ عِنۡدَ رَبِّھِمۡ ؕ لَھُمۡ
اَجۡرُھُمۡ وَنُوۡرُھُمۡ ؕ وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَکَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَاۤ
اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡجَحِیۡمِ Σ﴾

سورۃ الحدید کا چوتھا حصہ چار آیات (۱۶ تا ۱۹) پر مشتمل ہے۔ ان آیاتِ مبارکہ کا مطالعہ کرنے سے قبل ان کا ایک رواں ترجمہ کر لیجیے:

''کیا ابھی وقت نہیں آیا ہے اہلِ ایمان کے لیے کہ ان کے دل جھک جائیں اللہ کی یاد کے لیے اور (وہ تسلیم کر لیں اس سب کو) جو حق میں سے نازل ہوا ہے؟ اور نہ ہو جائیں ان لوگوں کے مانند جنہیں کتاب دی گئی تھی پہلے' تو ان پر ایک طویل مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے' اور ان میں بہت سے فاسق و فاجر ہیں۔ جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد از سر نو زندگی عطا فرما دیتا ہے۔ ہم نے تمہارے لیے اپنی آیات کو واضح کر دیا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو۔ اور جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر وہی ہیں صدّیق اور شہید اپنے ربّ کے پاس۔ ان کے لیے محفوظ ہے ان کا اجر بھی اور ان کا نور بھی۔ اور جنہوں نے کفر کیا اور تکذیب کی ہماری آیات کی تو وہی ہیں جہنم والے''۔

تأخیر و تعویق = شیطان کا ایک اور وار!

سورۃ الحدید کا یہ حصہ بھی میرے نزدیک اپنے مضمون کے اعتبار سے قرآن مجید کا نقطۂ عروج ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے یہ جو حقائق درجہ بدرجہ منکشف ہوئے ہیں' اس کے بعد اگر کسی کو اپنے گریبان میں جھانکنا نصیب ہو اور اپنی ایمانی کیفیت اور حقیقت کو دیکھنے اور ٹٹولنے کی توفیق میسر آ جائے (اللہ کرے کہ ایسا ہو!) اور وہ اپنی اصلاح کا ارادہ کر لے تو اس پر بھی شیطان حملہ آور ہوتا ہے۔ اُس وقت شیطان کا حملہ یہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کو تأخیر اور تعویق میں مبتلا کر دیتا ہے۔ انسان خیال کرتا ہے کہ ٹھیک ہے مَیں اپنا رویہ صحیح کر لوں گا' لیکن پہلے ذرا یہ کام کر لوں' ذرا یہ ذمہ داریاں ادا ہو جائیں' ابھی ذرا ملازمت سے ریٹائر ہو لوں پھر اپنی اصلاح اور دین کا کام کروں گا۔ یا پھر یہ کہ ذرا بچیوں کے ہاتھ پیلے کرنے ہیں' ذرا بچوں کے مستقبل کا معاملہ ہے۔ اسی طرح بچوں کے بعد پھر بچوں کے بچے سامنے آئیں گے اور ان کے مسائل شروع ہو جائیں گے۔ ع ''کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد!'' تو جان لیجیے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد تو انسان کے ہاتھ میں کچھ رہ ہی نہیں جاتا کہ وہ کچھ کر سکے۔ سرکار کھوکھلا کر کے ہی تو چھوڑتی ہے۔ اس وقت تک تمام توانائیاں ختم ہو چکی ہوتی ہیں۔

اس تأخیر و تعویق کی حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے بہترین تاویل کی ہے۔ یہ ان تین صحابہ ؓ میں سے ایک ہیں جو غزوۂ تبوک میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ غزوۂ تبوک میں نفیرِ عام تھی کہ ہر صاحبِ ایمان اللہ کی راہ میں نکلے' تو منافقین نے تو آ کر جھوٹے بہانے بنا کر معذرت کر لی اور اجازت لے لی' کچھ بغیر اجازت لیے بھی بیٹھے رہے' لیکن جب حضورﷺ واپس آئے تب وہ قسمیں کھا کھا کر کہنے لگے کہ حضور! میں تو لشکر کے ساتھ جانے کے لیے بالکل تیار تھا' مَیں نے تو سواری بھی تیار کی ہوئی تھی' لیکن عین وقت پر یہ مصیبت آ گئی کہ میں رک گیا۔ اور حضورﷺ کی یہ عادتِ ثانیہ تھی کہ ایسے جھوٹوں سے زیادہ اعتناء نہیں فرماتے تھے' بس کہہ دیتے کہ جائیے! لیکن یہ تین صحابہ جن میں سے ایک حضرت کعب بن مالکؓ ہیں' اگرچہ مؤمنین صادقین میں سے تھے مگر اس لشکر کے ساتھ نہیں جا سکے تھے۔ واپسی پر جب حضورﷺ کی طرف سے باز پُرس ہوئی تو انہوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔ حضرت کعب بن مالکؓ نے اس موقع پر عرض کیا: حضور! زبان میرے پاس بھی ہے' طلاقتِ لسانی مجھے بھی حاصل ہے' میں بھی جھوٹے بہانے بنا کر اس وقت آپؐ کی پکڑ سے اپنے آپ کو بچا سکتا تھا' لیکن مَیں صاف اعتراف کرتا ہوں کہ جتنا صحت مند مَیں اِس زمانے میں تھا پہلے اتنا کبھی نہیں رہا' اور جتنا غنی مَیں اس زمانے میں تھا اتنا پہلے کبھی نہیں رہا۔ یعنی نہ تو میرے پاس وسائل کی کمی تھی اور نہ میں بیمار تھا۔ بس ہوا صرف یہ کہ میں تأخیر و تعویق میں پڑ گیا۔ میرے نفس نے مجھے یہ دھوکہ دیا کہ رسول اللہﷺ تو تیس ہزار کا لشکر لے کر چلیں گے' جبکہ تمہاری اونٹنی بڑی صحت مند اور تیز رفتار ہے' چنانچہ حضورﷺ کو لشکر لے کر روانہ ہو جانے دو' اس کی حرکت قدرے آہستہ ہو گی' تم ذرا دو چار دن کے بعد تیزی کے ساتھ منزل پر منزل طے کرتے ہوئے حضورﷺ کے ساتھ مل جانا۔ تو میں اس دھوکے میں آ گیا اور سوچتا رہا کہ شدید گرمیوں کا موسم ہے اور صحرا کا سفر ہے' ذرا گھر میں تھوڑا

عرصہ مزید آرام کرلوں اور ٹھنڈی چھاؤں سے لطف اندوز ہولوں۔ (گویا ع ''تپتی راہیں مجھ کو پکاریں، دامن پکڑے چھاؤں گھنیری!'') تو میں اسی طرح ایک ایک دن کر کے ٹالتا رہا۔ ایک دن اچانک مجھے احساس ہوا کہ اب تو چاہے میں کتنی ہی تیز رفتاری سے جاؤں آپؐ کے ساتھ نہیں مل سکتا، بس میرے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ حضورﷺ نے سزا کے طور پر ان کا سماجی مقاطعہ کر دیا کہ کوئی مسلمان ان سے بات تک نہ کرے۔ یہ ان کے لیے بڑی سخت سزا تھی۔ یہ بخاری شریف کی بڑی پیاری حدیث ہے اور طویل ترین احادیث میں سے ایک ہے۔ ہر شخص کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

تو یہ تاخیر و تعویق اصل میں شیطان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ جیسے اقبال نے کہا: ؎

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ ''اِنَّ الْمُلُوْکَ''
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری!

تو یہاں پر اب اس تعویق و تاخیر سے ٹوکا گیا ہے۔ ارشاد ہوا: ﴿اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ﴾ ''کیا اہل ایمان کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل جھک جائیں اللہ کے ذکر میں اور اُس (قرآن) کے آگے جو نازل شدہ حق ہے''۔ یہ ایک طرح سے جھنجھوڑنے کا انداز ہے کہ کس امید پر تم یہ تاخیر و تعویق کر رہے ہو؟ تمہیں کل کی زندگی کا بھی یقین ہے کہ تمہیں کل کا سورج دیکھنا نصیب ہوگا؟ جبکہ تمہارے منصوبے تو طول طویل ہیں اور تم سالوں کا حساب بنا رہے ہو کہ اس کام سے فارغ ہو جاؤں، یہ ذمہ داریاں ادا کرلوں، یہ معاملہ طے ہو جائے تو پھر میں دین کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دوں گا۔ لیکن قرآن پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ: ﴿اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ﴾ ''کیا وقت آ نہیں گیا ہے اہل ایمان کے لیے کہ جھک جائیں ان کے دل اللہ کے ذکر سے اور اُس کے سامنے جو نازل ہوا حق میں سے''۔ خَشَعَ ، یَخْشَعُ کا مطلب ہے جھک جانا۔ ایک آیۂ کریمہ میں میدانِ حشر کا ایک نقشہ یوں کھینچا گیا ہے: ﴿خَاشِعَۃً اَبْصَارُھُمْ تَرْھَقُھُمْ ذِلَّۃٌ﴾ ''(قیامت کے دن میدانِ حشر میں) ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی اور ذلت اُن پر چڑھی آ رہی ہوگی''۔ یعنی تباہی و بربادی کو اپنے سامنے دیکھ کر شرمندگی سے کافروں کی نگاہیں نیچے زمین میں گڑی ہوں گی اور انہیں نہایت شرمناک سلوک کا سامنا ہوگا۔ تو اہل ایمان کو جھنجھوڑا جا رہا ہے کہ اب بھی تم تاخیر و تعویق میں پڑے ہوئے ہو؟ کیا وہ وقت آ نہیں گیا ہے کہ تم جھک جاؤ اللہ کی یاد کے آگے اور اس حق کے سامنے جو اللہ کی طرف سے نازل ہو چکا ہے۔ اس حق نے جہاں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی جدا کر دیا ہے، حق و باطل کو ممیّز کر دیا ہے، تمہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی میں آنا نصیب فرما دیا ہے، اسی حق نے تمہیں کچھ ذمہ داریاں بھی سونپی ہیں، اسی کلامِ الٰہی نے تمہارے فرائض بھی معین کیے ہیں، اس نے تمہیں یہ بتا دیا ہے کہ دین تم سے کیا چاہتا ہے، دین کا تقاضا کیا ہے۔ تمہارے فرائض کیا ہیں۔ تو کب تک تم اس تاخیر اور تعویق میں پڑے رہو گے؟

اہل کتاب کا عبرت آموز تذکرہ

آگے فرمایا: ﴿وَلَا یَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلُ﴾ ''اور نہ ہو جائیں وہ ان لوگوں کے مانند جن کو کتاب دی گئی تھی پہلے''۔ اِن سورتوں (المُسبّحات) میں اہل کتاب کا تذکرہ بطورِ نشانِ عبرت ہے کہ مسلمانو! تم سے پہلے بھی ایک اُمت مسلمہ (بنی اسرائیل) تھی، جسے اب معزول کر دیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ قرآن میں جیسے الفاظ سابقہ اُمت مسلمہ کے لیے آئے ہیں ہمارے لیے نہیں آئے۔ اُن سے فرمایا گیا تھا: ﴿وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ﴾ ''اور یہ کہ میں نے تمہیں تمام جہان والوں پر فضیلت عطا کی''۔ ذرا ان الفاظ کی گھمبیرتا کا تصور کیجیے! ٹھیک ہے، ہمیں بھی دو مرتبہ خیر اُمت اور اُمت وسط کہا گیا ہے، لیکن ان کے لیے فضیلت اور برتری کے جو الفاظ آئے ہیں وہ ہمارے لیے نہیں

آئے۔ ان میں تو چودہ سو برس تک نبوت کا تار ٹوٹا ہی نہیں۔ ان میں سلسلۂ نبوت و رسالت شروع بھی ہوا تو دو نبیوں حضرات موسٰی اور ہارون علیہما السلام سے اور پھر چودہ سو برس کے بعد اس سلسلۂ انبیاء کا خاتمہ ہوا تو بھی دو نبیوں حضرات عیسٰی اور یحیٰی علیہما السلام پر۔ ان کو کتابیں بھی تین دی گئیں۔ صحیفے تو بے شمار دیے گئے' کیونکہ بے شمار نبی مبعوث ہوئے اور ہر ایک پر وحی آتی رہی' اور یہ انہی انبیاء کی کتابیں ہیں جو "Old Testament" میں جمع ہیں۔ قرآن مجید میں بھی ان کے لیے تین کتابوں تورات' زبور اور انجیل کا تذکرہ ہے۔ لیکن وہی قوم اب نشانِ عبرت ہے۔ اسی قوم کے لیے فرمادیا گیا کہ: ﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ "ان پر (اللہ کی طرف سے) ذلت اور مسکنت مسلط ہوگئی اور وہ اللہ کے غضب (عذاب) میں گھر گئے"۔ انہی پر اللہ کے عذاب کے کوڑے برسے ہیں۔ انہیں بخت نصر کے ہاتھوں تباہ و برباد کیا گیا۔ پھر کبھی رومیوں کے ہاتھوں ان کی پٹائی ہوئی اور کبھی یونانیوں کے ہاتھوں' یہاں تک کہ پچھلی صدی میں دوسری عالمگیر جنگ کے دوران ہٹلر کے ہاتھوں ان کے ساتھ جو عبرت ناک سلوک ہوا اس کی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ اس دوران ساٹھ لاکھ یہودی قتل ہوئے ہیں۔ بخت نصر کی بات تو خیر اڑھائی ہزار سال پرانی ہوگئی ہے' لیکن یہ تو ماضی قریب کا واقعہ ہے۔ حالانکہ ان یہودیوں کا یہ قول رہا ہے: ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾ "ہم تو اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں"۔ ان کے اس ادّعا پر قرآن کا تبصرہ یہ ہے: ﴿فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ﴾ "تو وہ تمہیں سزا کیوں دیتا ہے تمہارے گناہوں کی پاداش میں؟" تم اگر اپنے خیال میں اللہ کے ایسے ہی لاڈلے اور چہیتے ہو تو اللہ تمہیں تمہارے گناہوں کی پاداش میں عذاب کیوں دیتا رہا ہے؟ اس نے دنیا میں تمہیں بری طرح پٹوایا ہے تو آخرت میں بھی تم پر عذاب کے کوڑے برسیں گے۔

ان تمام حوالوں سے مسلمانوں کو عبرت دلائی جا رہی ہے کہ دیکھو مسلمانو! کہیں تم بھی ان کے مانند نہ ہو جانا! چنانچہ فرمایا جا رہا ہے: ﴿وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ "اور وہ نہ ہو جائیں ان لوگوں کی مانند جن کو پہلے کتاب دی گئی تھی' تو اُن پر جب ایک مدت مدید گزر گئی تو اُن کے دل سخت ہوگئے"۔

تأخیر و تعویق کا نتیجہ: قساوتِ قلبی

نوٹ کیجیے کہ ایک تو صرف شدتِ تأثر کے لیے قساوتِ قلبی کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ روایات میں حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ بھی مذکور ہے۔ جب آپؓ کے پاس اہل یمامہ کا ایک وفد آیا اور ان کے سامنے قرآن پڑھا گیا تو ان لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تو اس موقع پر خلیفۃ المسلمین حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "هٰكَذَا كُنَّا حَتّٰى قَسَتِ الْقُلُوْبُ" کہ یہی حال کبھی ہمارا بھی ہوتا تھا' یہاں تک کہ ہمارے دل سخت ہوگئے۔ لیکن یہ صرف شدتِ تأثر ہے۔ جیسے حضور ﷺ فرمایا کرتے تھے: ((اِنَّهٗ لَيُغَانُ عَلٰى قَلْبِىْ)) "بے شک میرے دل پر بھی کبھی کبھی کوئی حجاب سا طاری ہو جاتا ہے"۔ اس سے کہیں آپ لفظی اشتراک کی وجہ سے دھوکہ نہ کھا جائیں کہ ہمارے دلوں کے حجاب اور حضور ﷺ کے دل کے حجاب کی نوعیت کوئی ایک جیسی ہوسکتی ہے۔ (نعوذ باللہ) ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک!

اسی قساوتِ قلبی کے بارے میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۷۴ ہے:

﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِىَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ۭ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝﴾

"پھر (ایسی نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی) تمہارے دل سخت ہوگئے' پتھروں کی طرح سخت' بلکہ سختی میں ان سے بھی کچھ بڑھے ہوئے' کیونکہ پتھروں میں سے تو کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جس میں سے چشمے پھوٹ بہتے ہیں' اور ان میں سے کوئی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پھٹتا ہے تو اس میں سے پانی نکلتا ہے' اور کوئی خدا کے خوف سے لرز کر گر بھی پڑتا ہے۔ اور اللہ تمہارے کرتوتوں سے بے خبر نہیں ہے"۔

اس آیت کا حوالہ قساوتِ قلوب کے ضمن میں بہت ضروری ہے۔ اس آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جب انسان کا دل سخت ہوتا ہے تو پھر کسی چٹان اور پتھر کی سختی بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اور یہ تو ہمارے عام مشاہدے کی بات ہے کہ کوئی بھیڑیا بھی ایسی درندگی نہیں کر سکتا جو انسان انسان کے ساتھ کرتا ہے۔ کوئی درندہ جب بھوکا ہو تو وہ ضرور اپنی درندگی کا مظاہرہ کرتا ہے' لیکن آج انسان قومیت پرستی کے بھوت میں اندھا ہو کر درندگی کا جو مظاہرہ کر رہا ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ آج بوسنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے' تقسیمِ ہند کے وقت مشرقی پنجاب میں جو کچھ ہوا تھا' کبھی مشرقی پاکستان میں جو کچھ ہوا تھا اسے کون بھلا سکتا ہے! افسوس کہ مسلمانوں کے ہاتھوں بھی یہ ظلم وستم ہوا ہے۔ کراچی میں مسلمانوں نے مسلمانوں کے ساتھ ظلم وستم کی جو داستانیں رقم کی ہیں وہ کوئی درندہ بھی نہیں کر سکتا۔ گھروں میں آگ لگائی گئی ہے اور پھر بچوں کو اٹھا اٹھا کر اُس میں پھینکا گیا ہے۔ تو ایسی قساوتِ قلبی کسی درندے کے اندر بھی نہیں ہوگی۔ انسان جب گرتا ہے تو اسفل سافلین میں ہو جاتا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۝﴾ (التین) ''ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا' پھر اسے الٹا پھیر کر ہم نے سب نیچوں سے نیچ کر دیا''۔ تو انسان جب گرتا ہے تو پھر نیچوں میں بھی سب سے نیچے چلا جاتا ہے۔ تو فرمایا کہ اس تأخیر وتعویق کے باعث تمہارے دل سخت ہوتے چلے گئے اور سختی میں پتھروں کے مانند ہو گئے' بلکہ ان سے بھی زیادہ سخت۔ اس لیے کہ پتھروں میں تو ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان میں سے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں۔ اور ایسے پتھر بھی ہیں جو شق ہو جاتے ہیں تو ان میں سے پانی نکل آتا ہے۔ بڑی بڑی چٹانیں اللہ کے خوف سے منہدم ہو جاتی ہیں' اللہ کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہیں۔ اور تمہارے یہ کرتوت اللہ سے ڈھکے چھپے ہرگز نہیں ہیں۔ درحقیقت یہ قساوتِ قلبی اور فسق وفجور اسی تعویق وتأخیر کا نتیجہ ہے۔ اس آیت میں یہودیوں کی طرف صرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ اُس وقت یہود کی سیرت وکردار اور ان کے تمام معاملات مسلمانوں کے سامنے تھے اس لیے ان کی طرف صرف اشارہ کر دینا کافی تھا۔

آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿وَکَثِیْرٌ مِّنْھُمْ فٰسِقُوْنَ ۝﴾ ''اور ان میں سے اکثر فاسق ہیں''۔

اُمید کی روشن کرن

اس ترہیب اور ڈانٹ ڈپٹ کے بعد اب اگلی آیت میں تشویق وترغیب اور حوصلہ افزائی کا انداز ہے۔ کسی بھی قسم کی تربیت وتعلیم کے لیے یہ دونوں چیزیں لازم ہیں۔ یعنی ڈانٹ ڈپٹ' زجر وتنبیہہ اور تہدید بھی ضروری ہے' لیکن پھر ساتھ ہی تھپکی بھی دی جانی چاہیے' حوصلہ بھی بڑھایا جانا چاہیے کہ گھبراؤ نہیں' اگر واقعتاً تمہیں محسوس ہو جائے کہ دل سخت ہو گئے ہیں' دلوں کے اندر ایمان کے بجائے ویرانی ہے' ہم کسی مغالطے میں ہیں کہ ہم مؤمن ہیں' تو یہ احساس بھی بہت قیمتی ہے' اس کو بھی بڑی مضبوطی کے ساتھ تھامو! کہیں یہ لمحہ بھی نہ جاتا رہے۔ اپنے اندر سے تمہارا نفس یا شیطانِ لعین تمہیں کوئی تھپکی دے کر سلا نہ دے۔ لہٰذا فرمایا: ﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا ط﴾ ''جان لو! اللہ تعالیٰ زمین کو اس کے مُردہ ہونے کے بعد دوبارہ زندہ کر دیتا ہے''۔ تمہارے دلوں کی زمین اگر ویران ہو گئی ہے' اگر تم محسوس کرتے ہو کہ نورِ ایمان سے خانۂ دل خالی ہو گیا ہے تو بھی گھبراؤ نہیں' مایوس نہ ہو۔ ﴿لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ ط﴾ ''اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جانا''۔ اللہ تعالیٰ زمین کو اس کی موت کے بعد دوبارہ زندہ کر دیتا ہے۔ بے آب وگیاہ زمین پر' جہاں زندگی کے آثار نہ ہوں' ویرانی ہی ویرانی ہو' بارش برستی ہے تو وہیں پر سبزہ اگ آتا ہے۔ ع ''مگر اب زندگی ہی زندگی ہے موجزن ساقی''۔[1]

آپ کو معلوم ہے کہ جہاں ہر طرف ویرانہ ہی ویرانہ ہو اور موت کا سماں ہو تو کوئی پرندہ بھی وہاں نہیں جاتا۔ وہ کا ہے کو وہاں جا کر چہچہائے؟ کون ہے اس کی آواز سننے والا؟ لیکن جب اسی جگہ پر بارش برستی ہے تو ہریالی ہی ہریالی ہوتی ہے۔ اب پرندے بھی وہاں ڈیرے ڈال لیتے ہیں' حشرات الارض بھی رینگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ

ساری حیات کہاں سے آ گئی؟ تو اگر اللہ تعالیٰ مُردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے تو پھر تمہارے لیے بھی مایوس ہونے کی بات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جیسے مُردہ زمین کو دوبارہ زندہ کر دیتا ہے اسی طرح وہ تمہارے دلوں کی مُردہ زمین کو بھی حیاتِ تازہ عطا کر دے گا اور ایمان کے نور سے منور کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ایمان کی لہلہاتی ہوئی فصل تمہاری اسی کشتِ قلوب کے اندر پیدا ہو جائے گی۔ آگے اس کے لیے راہنمائی بھی کی جا رہی ہے کہ: ﴿قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ ”ہم نے (اپنی) آیات تمہارے لیے واضح کر دی ہیں تا کہ تم عقل سے کام لو“۔ تا کہ تم اس سے سبق حاصل کرو۔ مایوس ہونے کی بات نہیں ہے‘ تم اپنی اصلاح کے لیے کمر ہمت کس لو۔

سلوکِ قرآنی کی پہلی منزل

اب اگلی آیت سلوکِ قرآنی سے متعلق ہے۔ یعنی جب دلی کیفیت کا ادراک ہو جائے اور آدمی اپنے باطن میں جھانک کر محسوس کرے کہ دل نورِ ایمان سے خالی ہے تو بھی مایوس نہ ہو‘ اسی زمین میں ایمان کی فصل لہلہا سکتی ہے۔ لیکن اس کے لیے ہل چلانا ضروری ہے۔ وہ ہل کون سا ہے؟ فرمایا: ﴿اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ﴾ ”یقیناً صدقہ دینے والے مَرد اور صدقہ دینے والی عورتیں‘ اور جو قرض دیں اللہ کو قرضِ حسنہ‘ اُن کو یقیناً کئی گنا بڑھا کر دیا جائے گا اور ان کے لیے بڑا باعزت اجر ہے“۔ ہم اسی سورۃ میں وہ آیت بھی پڑھ چکے ہیں کہ: ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ ”کون ہے جو اللہ کو قرض دے قرضِ حسنہ؟“ سورۃ التغابن میں بھی یہی بات ارشاد فرمائی گئی: ﴿اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ﴾ ”اگر تم اللہ کو قرضِ حسنہ دو تو وہ تمہیں کئی گنا بڑھا کر دے گا اور تمہارے قصوروں سے درگزر فرمائے گا۔ اور اللہ بڑا قدردان اور بردبار ہے“۔

اس آیت کا ایک تو فلسفہ سمجھ لینا چاہیے۔ دیکھئے دنیا کی محبت دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک علائق دُنیوی کی محبت اور ایک مال و اسبابِ دُنیوی کی محبت۔ ان دونوں کو یکجا کریں گے تو دنیا کی محبت میں سب سے زیادہ علامتی حیثیت جس چیز کو حاصل ہے وہ مال کی محبت ہے۔ اس لیے کہ مال سے ہی دنیا ہے۔ مال سے دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت اور بڑی سے بڑی آسائش حاصل کی جا سکتی ہے۔ تو اصل میں مال کی محبت ہے جو قربِ الٰہی کے راستے کی رکاوٹ بنتی ہے اور یہ گویا بریک کا کام کرتی ہے۔ جب تک یہ بریک نہ کھلے گاڑی نہیں چلتی‘ چاہے آپ ایکسیلیٹر دباتے رہیں۔ سورۂ آل عمران میں فرمایا گیا ہے: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ ”تم نیکی تک ہرگز رسائی حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ خرچ نہ کر دو وہ چیز جو تمہیں محبوب ہے“۔ یعنی وہ چیز نہیں جو دل سے اُتر چکی ہو‘ بلکہ محبوب شے اللہ کے راستے میں خرچ کرو۔ عربی زبان میں ”لَنْ“ کے ساتھ جو نفی آتی ہے اِس سے زیادہ تاکید ممکن نہیں ہے۔ تو فرمایا جا رہا ہے: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ﴾ ”تم ہرگز رسائی حاصل نہیں کر سکتے نیکی تک“۔ یعنی بخل اور نیکی ساتھ ساتھ ہوں‘ یہ ناممکن ہے۔ آپ زاہد ہو جائیں گے‘ عابد ہو جائیں گے‘ لیکن جب تک بخل کا بریک لگا ہوا ہے آپ نیک نہیں ہو سکتے۔ اللہ کے نزدیک نیکی اور شے ہے۔ اسی طرح آپ محدث ہو سکتے ہیں‘ مفتی ہو سکتے ہیں‘ مفسر ہو سکتے ہیں‘ بڑے عالم ہو سکتے ہیں‘ لیکن نیک نہیں ہو سکتے اگر یہ بریک لگی ہوئی ہے۔ لہٰذا اس بات کو ذہن میں رکھیے کہ دل سے مال کی محبت کو نکالنا ہو گا۔ یہ سلوکِ قرآنی کی شرطِ اوّل ہے‘ یہ ہل تو چلانا ہی پڑے گا۔

اسی کی درحقیقت وضاحت ہے جو سورۃ البلد میں ہے۔ اللہ تعالیٰ بڑے شکوے کے انداز میں گلہ کر رہے ہیں کہ ہم نے انسان کو کیا کیا نعمتیں دیں! ﴿اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ﴾ ”کیا ہم نے اسے (انسان کو) دو آنکھیں‘ اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے؟ اور (نیکی اور بدی کے) دونوں نمایاں راستے اسے (نہیں) دکھا دیے؟“ آگے فرمایا: ﴿فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ﴾ ”پس یہ گھاٹی کو عبور نہیں کر سکا“۔ ہم نے اسے کیسی کیسی نعمتیں دی ہیں‘ مگر یہ کم ہمت‘ تھڑدلا دشوار گزار گھاٹی سے گزرنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ تو یہ ایک طرح کی گھاٹی ہے جسے میں

بر یک کہہ رہا ہوں ۔اس گھاٹی سے نکل جائیں گے تو آگے راستہ کھلا ہے‘ لیکن گھاٹی اوکھی ہے۔پنجابی شاعر عبداللہ شاکر کے بقول ع ’’اوکھی گھاٹی مشکل پینڈا عشق دیاں اسواراں دا!‘‘ تو اس اوکھی گھاٹی کو عبور کرنا مشکل ہے۔آگے ارشاد فرمایا: ﴿وَمَا اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ﴾ ’’اور تم کیا جانو کہ وہ گھاٹی کیا ہے‘‘۔ ﴿فَكُّ رَقَبَةٍ﴾ ’’کسی (غلام کی) گردن کو غلامی سے آزاد کرا دینا ہے‘‘۔ ﴿اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ﴾ ’’یا کھانا کھلانا کسی قرابت دار یتیم یا خاک نشین مسکین کو (جو مٹی میں مل رہا ہے) فاقے کے دن‘‘۔ یعنی قحط کے دن کسی یتیم یا فاقہ کش مسکین کو کھانا کھلانا جب اپنے بھی لالے پڑ رہے ہوں۔ اگر اپنے گودام اناج سے بھرے ہوئے ہیں تب آپ نے لنگر کھول دیا تو یہ اور بات ہے‘ لیکن جب اپنے بھی لالے پڑے ہوئے ہوں تب کسی بھوکے کو کھانا کھلانا‘ یہ ہے دراصل مشکل گھاٹی۔ اس گھاٹی کو اگر عبور کر لیا تو کامیابی ہے۔ یہ بہت اہم مقام ہے اور بہت کم لوگوں نے اس کا گہرائی میں جا کر مطالعہ کیا ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہے: ﴿ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ﴾ ’’پھر (اس کے بعد یہ کہ) آدمی ان لوگوں میں شامل ہو جو ایمان لائے اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور (خلقِ خدا پر) رحم کی تلقین کی‘‘۔ یعنی اس گھاٹی میں سے گزر کر جو ایمان لایا ہے دراصل وہ ہے کہ جس کے لیے آگے راستے کھلے پڑے ہیں۔ دیکھئے ایک ابوبکر ؓ ہیں جو اِس حال میں ایمان لائے ہیں کہ وہ مال کی محبت سے پہلے سے بری ہیں۔ جبکہ ایک شخص وہ ہے جو دل میں مال کی محبت لیے ہوئے ایمان لایا ہے۔ لہٰذا جب تک وہ اپنے دل کو مال کی محبت سے‘ جو کہ نجاست ہے‘ پاک نہیں کرے گا تو سوائے نفاق کے اس کے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔

’’انفاق فی سبیل اللہ‘‘ اور ’’صدقات‘‘ میں فرق کی نوعیت!

ہمارے اس سلسلۂ درس میں اب تک ایک تو ’’انفاق فی سبیل اللہ‘‘ کی اصطلاح آئی ہے: ﴿وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ یعنی اللہ کے راستے میں خرچ کرنا۔ دوسری اصطلاح آئی ہے اللہ کو قرضِ حسنہ دینا۔ ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ اور ﴿وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ جبکہ اب ایک اصطلاح ’’صدقات‘‘ کی آئی ہے۔ صدقہ کس کو کہتے ہیں؟ ہم عام طور پر جو صدقے کا لفظ استعمال کرتے ہیں وہ کسی اچھے معنوں میں نہیں ہوتا۔ جبکہ صدقہ اصل میں صدق سے بنا ہے۔ دراصل یہ انسانیت کی صداقت کا ثبوت ہے کہ آپ کسی انسان کو بھوکا دیکھیں تو اسے کھانے میں شریک کریں‘ اسے کسی تکلیف میں دیکھیں تو اگر آپ اس کی تکلیف کا ازالہ کر سکتے ہوں تو اُدھر متوجہ ہو جائیں اور اس کی تکلیف رفع کریں۔ اگر کسی میں یہ رأفت اور رحمت نہیں ہے تو وہ پھر حقیقی انسان ہی نہیں ہے۔ اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ يُّحْرَمِ الرِّفْقَ فَقَدْ حُرِمَ الْخَيْرَ كُلَّهٗ)) ’’جو شخص دل کی نرمی سے محروم ہو گیا وہ گویا کل کے کل خیر سے محروم ہے‘‘۔ اس کے پاس خیر کہاں سے آئے گا! کسی کٹھور دل اور سنگدل انسان کے پاس خیر آ ہی نہیں سکتا۔ چاہے کوئی شخص اپنے اوپر تقویٰ اور دینداری کے لاکھ لبادے اوڑھ لے‘ مسجدوں کو قالین بھی فراہم کر دے اور بڑے بڑے چندے بھی دے‘ لیکن جب تک وہ دل کی نرمی سے محروم ہے وہ کُل کے کُل خیر سے محروم ہے۔

لہٰذا اب مال خرچ کرنے کی دو اقسام سامنے آئی ہیں جنہیں الگ الگ شناخت کرنا ضروری ہے۔ ایک ہے ابنائے نوع کی دادرسی میں اور ان کی تکلیف دور کرنے میں مال خرچ کرنا۔ یعنی فقراء‘ مساکین‘ بیواؤں‘ یتیموں اور مقروضوں وغیرہ کے لیے مال خرچ کرنا۔ یہ ’’صدقہ‘‘ ہے۔ زکوٰۃ کا بڑا مصرف بھی یہی ہے۔ اگرچہ زکوٰۃ کے مصارف میں ’’فی سبیل اللہ‘‘ بھی ہے لیکن وہ آٹھ مدّات میں سے ایک ہے۔ اسی لیے زکوٰۃ کے مصارف پر سورۃ التوبۃ میں جو آیت آئی ہے اس میں لفظ ’’زکوٰۃ‘‘ آیا ہی نہیں‘ ’’صدقات‘‘ آیا ہے۔ فرمایا: ﴿اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ ......الخ﴾ تو صدقہ اور زکوٰۃ کو ایک طرف کر لیجیے۔ جبکہ ایک ہے اللہ کی حکومت قائم کرنے کے لیے‘ اللہ کے پیغام کو عام کرنے کے لیے‘ اللہ کے دین کی جدوجہد کے لیے ساز و سامان فراہم کرنے کے لیے مال خرچ کرنا۔ یہ ہے ’’انفاق فی سبیل اللہ‘‘ اور یہی ہے اللہ کے

لیے قرضِ حسنہ۔ اس لیے کہ یہ تو اللہ کا ذاتی معاملہ ہے۔ سورۃ الحدید ہی میں آگے جا کر یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ﴾ ''اور تاکہ اللہ جان لے (ظاہر کر دے) کہ کون ہے جو مدد کرتا ہے اس کی اور اس کے رسولوں کی غیب میں رہتے ہوئے''۔ چنانچہ ایسے لوگوں کو اللہ اپنا مددگار قرار دیتا ہے جو اُس کی حکومت قائم کرنے کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر حاضر ہو جاتے ہیں۔

ذرا غور کیجیے، ہندوستان میں شیعیت کب آئی ہے! ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے کے پورے تین سو برس بعد تک شیعیت کا نام و نشان نہیں تھا۔ یہ خالص سنی مسلمان ملک تھا۔ لیکن جب شیر شاہ سوری نے ہمایوں کو شکست دی اور اسے بھاگنے پر مجبور کر دیا تو اب وہ ایران گیا اور وہاں شہنشاہ طہماسپ سے فوج لے کر آیا۔ یہ جو قزلباش کہلاتے ہیں یہ اس وقت ایران سے آئے تھے اور ان کے ساتھ ہی شیعیت آئی ہے۔ اب ظاہر بات ہے وہ تو ہمایوں کے مددگار اور محسن تھے جنہوں نے اسے دوبارہ تخت دہلی لے کر دیا، جنہوں نے حکومت ہند اسے دوبارہ دلوائی تو ان سے بڑا محسن کون ہوگا! یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد سے مغلیہ دربار پر اہل تشیع کو غلبہ حاصل ہوا اور ہندوستان کے اندر شیعیت پھیلتی چلی گئی۔ اب آپ اسی کے اوپر قیاس کیجیے! اس وقت دنیا میں اللہ کی حکومت کے خلاف بغاوت ہے۔ اگر آپ اللہ کے وفادار بن کر دنیا میں اس کی حکومت قائم کرنے کے لیے اپنا تن، من، دھن لگا رہے ہیں تو آپ لازماً اللہ کے مددگار ہوئے۔ اس سورۂ مبارکہ کی مرکزی اور عظیم ترین آیت انہی الفاظ پر ختم ہو رہی ہے: ﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ﴾ ''اللہ دیکھنا چاہتا ہے کون ہیں (اس کے وفادار بندے) جو غیب میں ہونے کے باوجود اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں''۔ سورۃ الصّف کی آخری آیت کا مضمون بھی یہی ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ﴾ ''اے ایمان والو! اللہ کے مددگار بنو! جیسے عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں سے کہا تھا کہ کون میرا مددگار ہے اللہ کی طرف؟'' تو اللہ کے راستے میں جان و مال کھپانے والے اللہ کے بھی مددگار ہیں اور رسول کے بھی مددگار ہیں۔

خرچ کی ان دو مدوں کی علیحدہ علیحدہ شناخت کرنا ضروری ہے۔ ایک ہے غرباء، مساکین، یتیموں، بیوائیوں، مقروضوں، غلاموں اور دیگر محتاجوں کی مدد کے لیے، ان کی احتیاج اور تکلیف کو دور کرنے کے لیے خرچ کرنا۔ یہ ہے صدقہ اور خیرات، اور ایک ہے انفاق فی سبیل اللہ یا اللہ کو قرضِ حسنہ دینا۔ اس آیت میں ان دونوں کو جمع کیا گیا: ﴿اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ﴾ ''یقیناً صدقہ کرنے والے مرد اور صدقہ کرنے والی عورتیں'' ﴿وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ ''اور جنہوں نے اللہ کو قرضِ حسنہ دیا ہے''۔ اب یہاں پر ''وَالَّذِيْنَ'' محذوف ماننا پڑے گا کہ ''وَالَّذِيْنَ اَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا''۔ اس لیے کہ اسم پر فعل کا عطف براہ راست نہیں آتا۔ ''اور وہ لوگ کہ جو اللہ کو قرضِ حسنہ دیں''۔ یعنی اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے، اقامت دین کے لیے، غلبۂ دین حق کے لیے، حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے لیے، نظامِ خلافت کو برپا کرنے کے لیے۔ آگے فرمایا: ﴿يُضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ﴾ ''ان کے لیے دوگنا کیا جائے گا (اجر) اور ان کے لیے بڑا باعزت اجر ہے''۔ اللہ کو قرض حسنہ دینے کا مطالبہ اس سورۃ میں پہلے بھی بایں الفاظ آیا ہے: ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ﴾ اور سورۃ التغابن میں بھی یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ﴾ کم و بیش وہی الفاظ یہاں ہیں کہ: ﴿يُضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ﴾ کہ ان کے لیے اجر میں بڑھوتری ہوتی رہے گی، اضافہ ہوتا رہے گا، اور اضافی طور پر جو اجر کریم دیا جائے گا وہ اس پر مستزاد ہے۔ تمہارا اصل مال تو تمہیں بہت بڑھا ہوا ملے گا ہی، مزید اللہ کی طرف سے بہت باعزت بدلہ، بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ ملے گا۔

مراتبِ صدّیقیت و شہادت کا حصول

فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۤ وَالشُّهَدَاۗءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ ''اور جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر وہی ہیں

صدّیق اور شہیدا پنے ربّ کے پاس''۔ ﴿لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ؕ﴾ ''ان کے لیے محفوظ ہے ان کا اجر بھی اور ان کا نور بھی''۔ ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۧ﴾ ''اور جنہوں نے کفر کیا اور تکذیب کی ہماری آیات کی تو وہ جہنم والے ہیں۔''

جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے' تربیت اور تعلیم کا یہ ایک مسلّمہ اصول ہے کہ ایک طرف زجر وملامت' سختی' تنبیہہ اور تہدید ہو' لیکن ساتھ ہی حوصلہ افزائی بھی ہو' تھپکی بھی دی جائے' شاباش بھی ہو۔ دل کی اُن ہمتوں کو از سرِنو سہارا دیا جائے جو کمزور پڑ رہی ہوں۔ ان چار آیات کے لیے میں نے ''سلوکِ قرآنی'' کا عنوان تجویز کیا ہے۔ پہلی آیت میں جھنجھوڑنے کا انداز ہے کہ کیا ہو گیا ہے؟ کیوں تأخیر وتعویق میں پڑے ہوئے ہو؟ ایمان کا دعویٰ بھی کرتے ہو لیکن اس کے حقوق ادا کرنے کو تیار نہیں ہو! ﴿لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۞﴾ ''کیوں کہتے ہو وہ جو کرتے نہیں ہو؟'' اور اس کے ساتھ ہی تہدید اور تنبیہہ بھی ہے کہ دیکھ لو! تم سے پہلے بھی ایک اُمت تھی' اور بعض اعتبارات سے تو اس کی بڑی فضیلت تھی' ان کے ہاں بیسیوں نبی مبعوث ہوئے۔ ظاہر بات ہے کہ چودہ سو برس تک اُن میں نبوت کا تار ٹوٹا ہی نہیں' تو یقیناً بیسیوں نبی آئے ہوں گے۔ بہرحال انہیں بھی کتابیں دی گئی تھیں۔ ایک کتاب کا یہاں جو خاص طور پر ذکر ہو رہا ہے وہ تورات ہے۔ فرمایا: ﴿وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ﴾ ''اور ان لوگوں کے مانند نہ ہو جائیں جنہیں کتاب دی گئی تھی پہلے''۔ اگر ''الکِتاب'' میں ''ال'' کو لامِ جنس مانا جائے تو یہاں پر تین کتابیں مراد ہو سکتی ہیں' تورات' انجیل اور زبور۔ تو یہاں متنبہ کیا جا رہا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ تم بھی اسی انجام سے دوچار ہو جاؤ جس انجام سے وہ دوچار ہو چکے ہیں اور وہ نشانِ عبرت بن چکے ہیں۔

اگلی آیت میں حوصلہ افزائی ہے کہ گھبراؤ نہیں' مایوس نہ ہو جانا۔ جیسے ایک جگہ فرمایا گیا ہے: ﴿لَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ﴾ (یوسف:۸۷) ''اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہونا'' بلکہ اللہ تعالیٰ کی یہ قدرت ہے کہ وہ تمہاری نگاہوں کے سامنے مُردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کی اس مُردہ کھیتی کو ایمان' عملِ صالح اور انفاق فی سبیل اللہ کی فصل سے آباد کر دے گا۔ البتہ اس کے لیے تمہیں ہل چلانا ہو گا' دل سے حبّ مال کی نجاست کو نکالنا ہو گا۔ حبِّ دُنیا کے لیے علامت (symbol) مال کی محبت ہے۔ اسے ہر دو طریقوں پر دل سے نکالنا ہو گا' محتاجوں کی فلاح و بہبود پر خرچ کر کے بھی اور اللہ کے دین کے قیام کی جدوجہد کے لیے بھی۔ مَیں اس سے قبل عرض کر چکا ہوں کہ یہ حبّ مال ایک طرح کا بریک ہے۔ یہ بریک کھلے گا تو گاڑی چلے گی' ورنہ ایکسیلیٹر دباتے رہو گے گاڑی حرکت نہیں کرے گی۔ اس کے لیے دونوں مدّیں بیان کر دی گئیں۔ ایک مدّ صدقہ اور خیرات ہے کہ غرباء' مساکین' یتیموں کی فلاح و بہبود کے لیے خرچ کرنا' بھوکوں کو کھانا کھلانا' جو بیمار ہیں اُن کے علاج معالجے کی صورت پیدا کرنا' مقروضوں کا قرض ادا کرنا۔ اور دوسری مدّ ہے اللہ کے دین کے لیے قرضِ حسنہ دینا' اللہ کے دین کے غلبے کے لیے' اس کی حکومت قائم کرنے کے لیے بڑھ چڑھ کر مال صرف کرنا۔ اس سے دل کی نجاست دُور ہو جائے گی۔ اسی کا نام ''تزکیہ'' ہے۔ ''زکٰوۃ'' کا لفظ اسی مالی عبادت کے لیے اسمِ علم ہے۔ اس لیے کہ اس سے تزکیہ ہوتا ہے' اس سے دلوں کے اندر کی نجاست دھلتی ہے' اور وہی درحقیقت ایمان کے راستے میں رکاوٹ ہے۔

تزکیہ کا مفہوم ایک مثال سے سمجھئے! دیکھئے ایک باغبان نے اپنے باغ میں کچھ پودے اور درخت تو خود لگائے ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ یہ پودے یا درخت پروان چڑھیں۔ لیکن کچھ خودرو گھاس اور جھاڑ جھنکاڑ اِدھر اُدھر اُگ آئی ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ یہ خودرَو نباتات (unwanted plants) ہوا میں سے آکسیجن کو بھی جذب کر رہی ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو پوری کی پوری آکسیجن جو مہیا ہے وہ اس پودے اور درخت کے لیے ہو گی کہ جو باغبان چاہتا ہے کہ پروان چڑھے۔ اسی طرح زمین کے اندر جو بھی قوتِ نمو ہے اس میں سے بھی یہ کھینچ رہے ہیں' ورنہ یہ ساری قوتِ نمو اُس پودے کے لیے ہو گی جو پودا باغبان چاہتا ہے کہ پروان چڑھے۔ لہٰذا باغبان کُھر پہ

ہاتھ میں لے کر اِن سب کو صاف کر کے پھینک دیتا ہے' تا کہ اصل پودا یا درخت بڑھے اور پروان چڑھے۔ یہ تزکیہ ہے۔ اسی طرح انسان کی اصل نشو ونما کے لیے بھی ضروری ہے کہ مال کی محبت' جو اصل میں علامت ہے دنیا کی محبت کی' اس کی گرفتاری سے اسے نجات ملے۔ یہ بند اور بریک کھلے گا تب ہی اس کی نشو ونما کا راستہ آسان ہوگا۔

آیات ۱۸ و ۱۹ کا باہمی ربط

اب ہم اس چوتھی آیت کا تفصیلاً اور بغور مطالعہ کرتے ہیں۔ دراصل دو حجابات کی وجہ سے اس کی اصل عظمت منکشف نہیں ہو پا رہی۔ سورۃ البلد کی آیات مَیں نے آپ کے سامنے پیش کی تھیں' وہاں لفظ ''ثُمَّ'' آ گیا ہے جو کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔ فرمایا: ﴿فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ﴾ ''انسان گھاٹی کو عبور نہ کر پایا''۔ ﴿وَمَا اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ﴾ ''اور تم نہیں جانتے کہ وہ گھاٹی کون سی ہے''۔ ﴿فَكُّ رَقَبَةٍ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ﴾ ''کسی گردن کو غلامی سے چھڑانا' یا فاقے کے دن کسی قریبی یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا۔ پھر آدمی اُن لوگوں میں شامل ہو جو ایمان لائے اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور (خلقِ خدا پر) رحم کی تلقین کی''۔ اب اس لفظ ''ثُمَّ'' نے وہاں پر موجود اصل مفہوم کے خزانوں کو کھول دیا ہے۔ یوں سمجھئے کہ پہلے اگر آپ نے زمین تیار کی ہے' ہل چلایا ہے' پھر بیج ڈالا ہے تو وہ بیج بار آور ہوگا اور فصل اُگے گی۔ لیکن آپ نے اگر زمین پہلے تیار نہیں کی' ہل چلایا ہی نہیں اور جا کر بیج ڈال دیا تو بیج بھی صاف ظاہر ہے ضائع ہو جائے گا۔ اسی طرح آپ نے اگر اپنے نفس کی یا باطنی شخصیت کی زمین میں ہل چلا لیا ہے' مال کی محبت یہاں سے نکال دی ہے تو اب جو ایمان کا بیج پڑے گا تو اس میں پوری فصل لہلہائے گی۔ چنانچہ سورۃ البلد میں فرمایا: ﴿ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ﴾ ''پھر وہ شامل ہوا اُن لوگوں میں جو ایمان لائے اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور باہمی مرحمت کی تاکید کی''۔

سورۃ العصر کا مضمون بھی بالکل یہی ہے۔ سورۃ العصر کے الفاظ ہیں:

﴿وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾

''قسم ہے زمانے کی' یقیناً تمام انسان خسارے میں ہیں' سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے اور ایک دوسرے کو حق بات کی تاکید اور صبر کی تلقین کی''۔

فرق صرف یہ ہے کہ ترتیب بدل گئی ہے۔ سورۃ العصر میں پہلے ایمان ہے' پھر عمل صالح ہے' پھر تواصی بالحق ہے اور پھر تواصی بالصبر ہے۔ جبکہ یہاں دونوں جوڑوں میں ترتیب الٹ گئی ہے۔ عمل صالح پہلے آیا ہے اور ایمان بعد میں۔ پہلے فرمایا: ﴿فَكُّ رَقَبَةٍ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ﴾ ''کسی گردن کو غلامی سے چھڑانا' یا فاقے کے دن کسی قرابت دار یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا''۔ یہ عمل صالح ہے۔ آگے فرمایا: ﴿ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''پھر وہ شامل ہوا اُن لوگوں میں جو ایمان لائے''۔ یہاں ایمان بعد میں آ رہا ہے۔ اسی طرح تواصی بالحق بعد میں آ رہا ہے اور تواصی بالصبر پہلے آ رہا ہے۔ فرمایا: ﴿وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ﴾ ''اور انہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور باہمی مرحمت کی تاکید کی''۔ یہاں ''تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ'' گویا ''تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ'' کی جگہ ہے۔ لیکن عمل صالح اور ایمان کو جوڑنے والی جو چیز ہے وہ لفظ ''ثُمَّ'' ہے' جس نے کہ حقائق کے خزانے کا دروازہ کھول دیا ہے۔ یہاں (سورۃ الحدید کی آیت ۱۸ اور ۱۹ کے مابین) چونکہ ایسا کوئی لفظ نہیں ہے لہٰذا یہاں تدبر کی ضرورت ہوگی کہ ان دونوں آیتوں میں ربط کیا ہے۔

ان دونوں آیات کا ترجمہ یوں ہے: ''یقیناً صدقہ دینے والے مَرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور جو لوگ اللہ کو قرضِ حسنہ دیں' ان کے لیے ان کا دیا ہوا مال بڑھایا جاتا رہے گا اور ان کو اجر ملے گا بہت ہی باعزت۔ اور وہ لوگ جو ایمان لائے

اللہ پر اور اس کے رسولوں پر وہ صدّیق اور شہید ہیں''۔ ان دونوں آیات کے درمیان بھی گویا لفظ ''ثُمَّ'' محذوف ہے۔ اور یہ آپ کی سمجھ میں اُس وقت تک نہیں آ سکتا جب تک یہ دو اصول سامنے نہ ہوں۔ ایک تو یہ کہ قرآن مجید کی آیات کے مابین بڑا گہرا ربط ہے۔ اس کی اہمیت بھی بہت کم لوگوں کے سامنے آئی ہے اور بہت کم لوگوں نے اس پر توجہ کی ہے کہ آیاتِ قرآنی باہم مربوط ہونی چاہئیں۔ اگر آپ نے علیحدہ علیحدہ آیت پر غور کر کے کچھ علم، معرفت، فہم اور ہدایت حاصل کی اور اس پر اکتفا کر لیا تو یقیناً وہ بھی بہت بڑی قیمتی متاع ہے، لیکن آیات کے باہمی ربط سے اس کے حسنِ معنوی کے کچھ اور پہلو بھی نمایاں اور منکشف ہوتے ہیں، جو یہاں لفظ ''ثُمَّ'' کے نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل رہ گئے ہیں۔

دوسرا اصول یہ سامنے رہنا چاہئے کہ ''اَلْقُرْآنُ یُفَسِّرُ بَعْضُہٗ بَعْضًا'' یعنی قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تفسیر کرتا ہے۔ اس اصول کو سب لوگ تسلیم کرتے ہیں، لیکن اس کا انطباق اور اس کا حق ادا کرنا، یہ اپنی جگہ پر ایک دوسرا مرحلہ ہے۔ لہٰذا یہاں پر اِن دونوں اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے لفظ ''ثُمَّ'' کو محذوف سمجھئے۔ یعنی وہ لوگ جو صدقات کے ذریعے اور اللہ کو قرضِ حسنہ دے کر اپنے دلوں سے مال کی محبت اور اس کی نجاست کو دھو ڈالتے ہیں، پھر وہ جب ایمان لاتے ہیں تو اب ان کے لیے مقامِ صدّیقیت اور مرتبۂ شہادت تک پہنچنے کا راستہ کھلا ہوا ہے۔ اب گویا وہ بریک کھل گئی، اب آگے بڑھنے کے لیے راستے کھلے ہیں۔ آگے بڑھنے کے اعتبار سے یہاں صدّیقیت اور شہادت کے مراتب کا تذکرہ ہوا ہے۔ بدقسمتی سے ان اصطلاحات پر بھی توجہ بہت کم ہوئی ہے۔ میں آج آپ کے سامنے ان چیزوں کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کروں گا۔

قرآنی اصطلاح کے طور پر ''شہید'' کا مفہوم

اب دوسرے حجاب کو سمجھئے۔ لفظ ''شہید'' کے عام طور پر دو مفہوم ہیں۔ ان میں سے قرآن مجید کے اعتبار سے جو مفہوم زیادہ اہم ہے وہ کچھ اور ہے، وہ مَیں آگے چل کر بیان کروں گا۔ لیکن بدقسمتی سے دوسرا مفہوم جو اِس لفظ کا شاذ مفہوم ہے اور قرآن میں تقریباً ذکر ہی نہیں ہوا، وہ عام اور رائج ہو گیا ہے۔ وہ مفہوم اس آیت کے اصل فہم میں پردہ اور حجاب بن گیا ہے۔ عام طور پر ہمارے ہاں شہید کے معنی ''اللہ کی راہ میں قتل ہونے والا'' لیے جاتے ہیں۔ پورے قرآن مجید میں یہ لفظ اس معنی میں کہیں نہیں آیا سوائے سورۂ آل عمران کی ایک آیت کے، جہاں صرف امکان ہے کہ وہ معنی لیے جا سکیں۔ ورنہ اللہ کی راہ میں قتل ہونے والے کے لیے بھی لفظ مقتول فی سبیل اللہ آیا ہے۔ جیسے فرمایا گیا ہے: ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۵۴) ''اور ان لوگوں کو جو اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں مُردہ مت کہو!'' اور ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا ؕ﴾ (آل عمران:۱۶۹) ''اور ان لوگوں کو جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں، مُردہ مت گمان کرو!'' قرآن میں نبیوں اور رسولوں کے لیے بھی قتل کے الفاظ ذکر ہوئے ہیں۔ جیسے: ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ ؕ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤی اَعْقَابِکُمْ ؕ﴾ (آل عمران:۱۴۴) ''اور محمد (ﷺ) نہیں ہیں مگر ایک رسول، ان سے پہلے بھی کئی رسول گزرے ہیں، تو کیا اگر اُن پر موت آ جائے یا وہ قتل کر دیے جائیں (اللہ کی راہ میں) تو تم لوٹ جاؤ گے اپنی ایڑیوں کے بل؟''

قرآن مجید کے کسی مقام پر بھی یہ لازم نہیں آتا کہ مقتول فی سبیل اللہ کے لیے لفظ ''شہید'' ہی ترجمہ کیا جائے۔ سورۂ آل عمران کی ایک آیت میں صرف امکان ہے کہ مقتول فی سبیل اللہ کے لیے لفظ ''شہید'' ترجمہ کیا جائے۔ اس آیت میں الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿وَیَتَّخِذَ مِنْکُمْ شُھَدَآءَ ؕ﴾ (آیت ۱۴۰) ''اللہ چاہتا ہے (ان آزمائشوں کے ذریعے) کہ تم میں سے کچھ کو اپنا گواہ بنا لے'' یا ''تم میں سے کچھ کو اللہ اپنی راہ میں قتل ہونے کا مرتبہ عطا کر دے''۔ ذہنوں میں اس لفظ ''شہید'' کا مفہوم یہ بیٹھ گیا ہے کہ ''اللہ کی راہ میں قتل ہونے والا''۔ اگرچہ حدیث میں یہ لفظ مقتول فی سبیل اللہ کے لیے آیا ہے لیکن وہ بابِ اِستفعال سے ''اُسْتُشْھِدَ'' کی صورت میں ہے کہ اس

کی شہادت قبول کر لی گئی' اس کو شہادت کا مرتبہ دے دیا گیا۔ لیکن عام طور پر ہماری زبانوں پر یہ لفظِ شہید اُس شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے جو اللہ کی راہ میں قتل ہو گیا ہو۔

اس غلط فہمی کے نتیجے میں اس آیت کی قراءت کا بھی فرق پڑ گیا ہے۔ چنانچہ اب اس آیت ﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ﴾ کے ظاہری مفہوم سے پہلا سوال تو یہ پیدا ہو گیا ہے کہ کیا سب کے سب مؤمن صدّیق ہیں جو ایمان لائے ہیں اللہ اور اس کے رسولوں پر؟ اگر آپ اس آیت کو پچھلی آیت سے کاٹ کر یہاں استیناف سمجھیں گے اور پچھلی آیت سے اس کا ربط پیش نظر نہیں ہو گا تو اس کا مطلب تو یہی ہو گا کہ جو لوگ بھی ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر وہ صدّیق ہیں! پھر چونکہ شہید صدّیق سے الگ ایک علیحدہ مفہوم کا لفظ سمجھا جا رہا ہے یعنی ''اللہ کی راہ میں قتل ہونے والا'' تو اس بنا پر اکثر حضرات نے ''ھُمُ الصِّدِّیْقُوْن'' پر وقف کر کے ﴿وَالشُّھَدَآءُ عِنْدَ رَبِّھِمْ لَھُمْ اَجْرُھُمْ وَنُوْرُھُمْ﴾ کو ایک علیحدہ جملہ مانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں قرآن مجید میں ''الصِّدِّیْقُوْنَ'' اور ''وَالشُّھَدَآءُ'' کے مابین وقف کی علامت لگی ہوتی ہے۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اسلاف میں سے حضرت مجاہدؒ جو تابعی ہیں اور علم قرآن اور علم تفسیر کی بڑی بڑی شخصیتوں اور بزرگوں میں سے ہیں' ان کی رائے یہ ہے کہ یہاں پر ﴿اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ وَالشُّھَدَآءُ عِنْدَ رَبِّھِمْ﴾ کلامِ مسلسل ہے' لہٰذا اسے بغیر وقف کیے رواں پڑھا جائے گا۔

اب آپ سمجھئے کہ اس لفظ ''شہید'' کا اصل مفہوم کیا ہے؟ دیکھئے ''صِدِّیْق'' اور ''شَھِیْد'' قرآن کریم کی دو اہم اصطلاحات ہیں۔ اصطلاحات میں صرف لغوی معانی معتبر نہیں ہوا کرتے' بلکہ لغوی مفہوم کی بنیاد پر اصطلاحی مفہوم کو سمجھنا ہوتا ہے۔ جیسے ''اَمن'' سے ''اِیمان'' بنا ہے' اب ''اِیمان'' نے جب اصطلاح کی شکل اختیار کی تو اس کے معنی ہیں: اَلتَّصْدِیْقُ بِمَا جَآءَ بِہِ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ اسی طرح صِدِّیْق' فِعِّیْل کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے۔ لہٰذا صِدِّیْق سے مراد ہے انتہائی راست گو' راست باز' راست رو انسان' کہ جو ہر اچھی بات کی تصدیق کے لیے ہر وقت آمادہ رہے۔

اور اصطلاحاً اس سے مراد وہ سلیم الفطرت لوگ ہیں کہ جن کے لیے نبی کی دعوت ہرگز اجنبی نہیں ہوتی۔ جیسے ہی نبی کی دعوت اُن کے کانوں تک پہنچتی ہے انہیں ایسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ ان کے دل کی آواز ہے۔ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
مَیں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے!

اُن کی فطرت اپنی سلامتی پر برقرار ہوتی ہے۔ وہ غور و فکر اور سوچ بچار کرنے والے لوگ ہوتے ہیں' انہیں خود اپنے اندر سے وہ گواہی ابھرتی ہوئی نظر آ رہی ہوتی ہے' لہٰذا جیسے ہی نبی کی دعوت اُن تک پہنچتی ہے فوراً تصدیق کر دیتے ہیں۔ اس کی سب سے نمایاں مثال حضرت صدّیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں' جن کے بارے میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے جس کے سامنے بھی اپنی دعوت رکھی ہے اس نے کچھ نہ کچھ تأمل ضرور کیا ہے سوائے ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کے۔ انہوں نے ایک لحظہ کی تأخیر کے بغیر تصدیق کی ہے تو یقیناً یہ صرف اس لیے ہوا ہے کہ یہ چیز پہلے سے ان کی فطرت میں موجود تھی' ورنہ تو یہ بہت بڑا دعویٰ تھا' نبوت و رسالت کا دعویٰ کوئی معمولی دعویٰ تو نہیں ہے۔

اسی طرح اب لفظ ''شہید'' پر غور کیجیے! ''شہید'' کے لغوی معنی ہیں ''جو موجود ہو''۔ شَھِدَ' یَشْھَدُ کا مطلب ہے موجود ہونا۔ شاہد و غائب کے الفاظ ہماری عام بول چال میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ شاہد اسے کہتے ہیں جو موجود ہو اور غائب وہ جو موجود نہ ہو۔ اب اسی لغوی معنی سے اس میں دو اضافی مفہوم پیدا ہوئے۔ غور کیجیے کہ جو شخص کسی وقوعہ کے وقت موجود ہو تو اُسی کی گواہی معتبر ہوتی ہے' لہٰذا جو موجود ہے وہ گواہ ہے۔ اگر کہیں کوئی حادثہ ہوا ہے' کسی کا قتل ہو گیا ہے' یا کوئی اور جرم ہوا ہے' تو جو اُس وقوعہ کے وقت موجود ہو گا وہی تو گواہی دینے کا اہل ہے۔ لہٰذا گواہی موجودگی کی بنا پر ہوتی ہے۔ اور اسی لغوی معنی کی بنیاد پر اِس کے معنی مددگار کے بھی ہیں۔ اس لیے کہ جو کسی ضرورت کے وقت موجود ہو گا وہی مدد کر سکے گا۔ فرض کیجیے آپ کا کوئی بہت ہی جگری' وفادار اور مخلص دوست ہے' لیکن جب وہ وقوعہ پر موجود ہی نہیں ہے تو وہ آپ

کی مدد کیسے کر سکے گا؟ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۳ میں یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے:

﴿وَاِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ وَادۡعُوۡا شُهَدَآءَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۝﴾

''اگر تمہیں کوئی شک ہے اُس چیز کے بارے میں جو ہم نے اپنے بندے (محمدﷺ) پر نازل کی ہے تو پھر تم بھی اس جیسی کوئی ایک سورۃ بنا کر لے آؤ اور اس کے لیے تم اللہ کے مقابلے میں اپنے تمام مددگاروں کو بلا لو (جس کو چاہو جمع کر لو اور اپنی ساری صلاحیت کو بھی مجتمع کر لو اور اُس کا مقابلہ کر لو) اگر تم سچے ہو۔''

یعنی فی الواقع تو تمہیں اِس کے اللہ کا کلام ہونے میں کوئی شک نہیں ہے' لیکن تم صرف بات بنا رہے ہو' تمہارا دل تو گواہی دے رہا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ تو وہاں ''اَلشُّهَدَآء'' کے معنی مددگار کے ہیں۔ بہرحال یہاں پر اصطلاحاً شہید سے مراد وہ شخص ہے جو اللہ کی طرف سے اپنی دعوت و تبلیغ کے ذریعے سے لوگوں پر دنیا میں گواہی قائم کرے' حجت قائم کرے اور پھر یہ کہ قیامت کے دن بھی کھڑے ہو کر وہ گواہی دے کہ اے اللہ! میں نے تیرے بندوں تک تیرا یہ پیغام پہنچا دیا تھا' لہٰذا اب یہ خود ذمہ دار ہیں۔ منصبِ رسالت کے لیے قرآن مجید میں یہ لفظ ''شہادت'' انتہائی کثرت کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ رسول دنیا میں حق کی گواہی دیتا تھا۔ (مَیں نے یہاں ماضی کا صیغہ اس لیے استعمال کیا ہے کہ اب یہ سلسلۂ نبوت و رسالت بند ہو چکا ہے۔) یہ فریضۂ منصبی بحیثیت مجموعی اُمت کو ادا کرنا ہے' اب یہ اُمت کا فریضۂ رسالت ہے۔ اب شخصی رسالت نبوت کے ختم ہونے کے ساتھ ختم ہو چکی ہے۔ نبی دنیا میں اپنے قول و عمل سے حق کی گواہی دیتا تھا' وہ جو کہتا تھا کر کے دکھاتا تھا' تاکہ ثابت ہو جائے کہ جس بات کی طرف بلایا جا رہا ہے وہ ناقابل عمل نہیں ہے' یہ دعوت صرف لفّاظی نہیں ہے' بلکہ قابل عمل ہے۔ اور پھر یہ کہ حضور اکرمﷺ نے تو اِس نظامِ حیات کو قائم کر کے دکھا دیا کہ یہ نظام قائم ہو سکتا ہے اور قائم کیا جا سکتا ہے۔ اور پھر حضورﷺ نے یہ نظام چلا کر بھی دکھا دیا' تاکہ حجت اپنے آخری درجے کو پہنچ جائے۔ اسی کا نام اتمامِ حجت ہے۔

چنانچہ قیامت کے دن رسول استغاثہ کے چشم دید گواہ (Prosecution witness) کی حیثیت سے کھڑے ہوں گے اور گواہی دیں گے۔(۱) ارشادِ الٰہی ہے:

﴿فَكَيۡفَ اِذَا جِئۡنَا مِنۡ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيۡدٍ وَّجِئۡنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيۡدًا ۝﴾ (النساء)

''پس اُس (قیامت کے) دن کیا حال ہو گا جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے اور آپؐ کو بھی (اے محمدﷺ) اِن لوگوں کے خلاف بطورِ گواہ کھڑا کریں گے!''

اس آیت سے متعلق ایک واقعہ بھی ہے جو ہمارے لیے بہت ہی عبرت انگیز اور سبق آموز ہے۔ حضور اکرمﷺ نے ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے فرمائش کی کہ مجھے قرآن سناؤ۔ انہوں نے عرض کیا حضور! آپ کو قرآن سناؤں؟ آپ پر تو یہ نازل ہوا ہے۔ فرمایا: ''ہاں یہ ٹھیک ہے' لیکن مجھے دوسروں سے سن کر کچھ اور لذت حاصل ہوتی ہے''۔ اب انہوں نے امتثالاً للامر (حکم کی بجا آوری میں) سورۃ النساء کی پہلی آیت سے تلاوت شروع کی اور پڑھتے گئے۔ جب اِس آیت پر پہنچے: ﴿فَكَيۡفَ اِذَا جِئۡنَا مِنۡ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيۡدٍ وَّجِئۡنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيۡدًا ۝﴾ تو حضورﷺ نے فرمایا: ''اب بس کرو!'' جب حضرت عبداللہؓ نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو آپﷺ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ (یہ حدیث متفق علیہ ہے۔)

ہر اُمت کی طرف جو بھی رسول بھیجے گئے تھے (علیہ الصلوٰۃ والسلام) وہ رسول قیامت کے دن سرکاری گواہ کی حیثیت سے کھڑے ہو کر گواہی دیں گے کہ اے اللہ! تیرا جو پیغام مجھ تک آیا تھا' میں نے ان تک پہنچا دیا۔ اب یہ اپنے طرزِ عمل کے خود ذمہ دار ہیں' خود جواب دہ ہیں۔ متذکرہ بالا آیت کا اگلا حصہ ہے: ﴿وَجِئۡنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيۡدًا﴾ ''اور (اے نبیؐ!) آپ کو ہم لائیں گے ان کے خلاف گواہ کے طور پر''۔ نوٹ کیجیے ''علٰی'' کا صلہ جب بھی آتا ہے وہ مخالفت کے لیے ہوتا ہے۔ جیسا کہ بہت ہی مشہور حدیث ہے: ((اَلۡقُرۡآنُ حُجَّةٌ لَّكَ اَوۡ عَلَيۡكَ)) ''قرآن یا

تو تمہارے حق میں حجت ہوگا یا تمہارے خلاف حجت بنے گا''۔شہادت کسی کے حق میں ہوتی ہے اور کسی کے خلاف ہوتی ہے۔ ہر شخص جو گواہ کی حیثیت سے پیش ہوتا ہے' اس کی گواہی کسی کے حق میں اور کسی کے خلاف جاتی ہے۔ جب یہ گواہی ''لِ'' کے صلے کے ساتھ آتی ہے تو کسی کے حق میں جارہی ہوتی ہے۔ جیسے سورۃ النساء میں ارشاد ہوا: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ﴾ (آیت ۱۳۵) ''اے اہل ایمان! کھڑے ہو جاؤ پوری قوت کے ساتھ عدل کو قائم کرنے کے لیے اللہ کے حق میں گواہی دینے کے لیے''۔ لیکن یہ خاص طور پر نوٹ کیجیے کہ اکثر و بیشتر اس کے ساتھ ''علٰی'' کا صلہ لگتا ہے۔ قیامت کے دن جب ہمارے اپنے اعضاء و جوارح ہمارے خلاف گواہی دیں گے تو ہم کہیں گے: ﴿لِمَ شَھِدْتُّمْ عَلَیْنَا﴾ ''تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دے دی؟'' تم ہمارے اپنے اعضاء و جوارح ہو کر ہمارے خلاف گواہی دے رہے ہو؟ ہمارے یہ اعضاء و جوارح جواب میں کہیں گے: ﴿اَنْطَقَنَا اللّٰہُ الَّذِیْٓ اَنْطَقَ کُلَّ شَیْءٍ﴾ (حٰمٓ السجدۃ:۲۱) ''آج اس اللہ نے ہمیں بھی گویائی عطا کر دی ہے جس نے ہر شے کو نطق و گویائی عطا کی ہے''۔ جہاں بھی رسالت کی گواہی کے لیے یہ لفظ آیا ہے ''علٰی'' کے ساتھ آیا ہے۔ سورۃ المزمل میں ارشاد ہوا: ﴿اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَیْکُمْ رَسُوْلًا شَاھِدًا عَلَیْکُمْ کَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ۝﴾ ''(دیکھو لوگو!) ہم نے بھیج دیا ہے تمہاری طرف اپنا ایک رسول تمہارے خلاف گواہ کی حیثیت سے' جیسا کہ ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا تھا''۔

رسول دنیا میں تو لوگوں کو حق کی دعوت دیتا ہے' وہ ان کے لیے جو اُس کی دعوت کو قبول کرلیں رحمتِ خداوندی کا مظہر بن جاتا ہے' لیکن جنہوں نے اس کی دعوت کو ردّ کر دیا اُن پر گویا حجت قائم ہوگئی۔ قیامت کے دن اب وہی رسول کھڑا ہو کر اُن لوگوں کے خلاف گواہی دے گا کہ اے اللہ! میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا تھا' میری طرف سے کوتاہی نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر حضورﷺ نے' جبکہ سوا لاکھ کا مجمع سامنے تھا' یہ سوال کر کے گواہی لے لی: ((اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ؟)) ''لوگو! میں نے پہنچا دیا کہ نہیں؟'' میری طرف سے حق تبلیغ میں کوئی کمی تو نہیں رہ گئی؟ اور پورے مجمع نے یک زبان ہو کر کہا: ''اِنَّا نَشْھَدُ اَنَّکَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّیْتَ وَنَصَحْتَ'' یعنی ''ہم گواہ ہیں کہ آپ نے حق رسالت ادا کر دیا' حق امانت ادا کر دیا اور ہماری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا''۔ بلکہ ایک روایت میں تو یہ تفصیل ہے: ''اِنَّا نَشْھَدُ اَنَّکَ قَدْ بَلَّغْتَ الرِّسَالَۃَ وَاَدَّیْتَ الْاَمَانَۃَ وَنَصَحْتَ الْاُمَّۃَ وَکَشَفْتَ الْغُمَّۃَ'' یعنی ''ہاں حضور! ہم گواہ ہیں کہ آپؐ نے رسالت کا حق ادا کر دیا' امانت کا حق ادا کر دیا' اُمت کی خیر خواہی کا حق ادا کر دیا اور گمراہی کے اندھیروں کے پردے چاک کر دیے''۔ اب حضورﷺ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور انگشتِ شہادت سے آسمان کی طرف اور پھر لوگوں کی طرف اشارہ کیا: ((اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ' اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ' اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ)) ''اے اللہ تو بھی گواہ رہ! اے اللہ تو بھی گواہ رہ! اے اللہ تو بھی گواہ رہ!'' انہوں نے تسلیم کر لیا ہے کہ مَیں نے انہیں تیرا پیغام پہنچانے کا حق ادا کر دیا ہے۔ پھر حضورﷺ نے لوگوں سے فرمایا: ((فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ)) ''اب پہنچائے وہ جو یہاں ہے اُس کو جو یہاں نہیں ہے''۔ یہ ہے اصل میں اُمت کا فریضۂ رسالت۔ اللہ نے بھیجا ہے محمد رسول اللہﷺ کو اور محمدﷺ نے اپنا یہ فریضۂ منصبی اُمت کے حوالے کیا۔ اس لیے کہ حضور تو پوری نوعِ انسانی کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا﴾ ''اور ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر تمام انسانوں کے لیے خوش خبری دینے والا اور ڈرسنانے والا بنا کر''۔ اور حضورﷺ کی حیاتِ طیبہ میں تو اتمامِ حجت اگر ہوا ہے تو صرف جزیرہ نمائے عرب کے مسلمانوں پر ہوا ہے' قیصر و کسریٰ کو تو آپﷺ کے ابھی صرف خطوط ہی گئے تھے' ایران کے لوگوں کو ابھی کیا معلوم تھا کہ وہ دعوت کیا ہے؟ رومیوں کو کیا پتہ تھا کہ وہ دعوت کیا ہے؟ اس کے دلائل کیا ہیں؟ دعوت کے اتمامِ حجت کی حد تک تو فریضہ ادا نہیں ہوا۔ تو یہ کام اب مسلمانوں نے کرنا ہے۔

اب نوٹ کیجیے کہ یہ ہے اصل میں شہادت! اور قرآن مجید میں دو جگہوں پر اسی مفہوم کو بیان کیا گیا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں یہ مضمون اِن الفاظ میں آیا ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط﴾ (آیت ۱۴۳) ''اور اسی طرح ہم نے تمہیں اُمت وسط بنایا ہے تاکہ تم پوری نوعِ انسانی پر گواہی دو (حجت قائم کرو) اور ہمارے رسول تم پر گواہی قائم کریں (حجت قائم کردیں)''۔ یہ وہ گواہی ہے جو قیامت کے دن ظاہر ہو جائے گی۔ ازروئے الفاظ قرآنی: ﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ۝﴾ ''پس کیا حال ہوگا (اُس دن) جب ہم ہر اُمت میں ایک گواہ کھڑا کریں گے اور آپ کو (اے نبیؐ!) کھڑا کریں گے ان کے خلاف بطورِ گواہ''۔ اس کے بعد اگلی آیت میں فرمایا: ﴿يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ط وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ۝﴾ ''اُس دن جن لوگوں نے (اس دنیا میں) کفر و انکار کیا تھا' اور رسول (ﷺ) کی نافرمانی کی تھی' تمنا کریں گے کہ کاش وہ زمین میں دھنسا دیے جائیں! (اُن کے اوپر زمین برابر ہو جائے' نیست و نابود ہو جائیں' ان کا وجود ہی باقی نہ رہے) لیکن وہ وہاں کوئی بات اللہ سے چھپا نہیں سکیں گے''۔

شہادت علی الناس کا یہی مضمون سورۃ الحج کے اخیر میں آیا ہے۔ فرمایا: ﴿وَجَاهِدُوْا فِى اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾ ''اور جہاد کرو اللہ کے لیے جیسا کہ اس کے لیے جہاد کا حق ہے''۔ اور یہ جہاد کس لیے ہوگا؟ ﴿هُوَ اجْتَبٰكُمْ﴾ ''اس نے تمہیں چن لیا ہے''۔ اپنے نصیب پر فخر کرو کہ یہ اُمت مسلمہ اس سلسلۂ رسالت میں ایک کڑی (link) کی حیثیت سے تاقیامِ قیامت جوڑ دی گئی ہے۔ سورۃ الحج کے آخری رکوع میں پہلے یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿اَللّٰهُ يَصْطَفِىْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ﴾ ''اللہ چن لیتا ہے فرشتوں میں سے بھی اپنے پیغام بر اور انسانوں میں سے بھی''۔ اور اب اس کے بعد فرمایا ہے: ﴿هُوَ اجْتَبٰكُمْ﴾ اس نے تمہیں چن لیا ہے' تمہیں پسند کر لیا ہے۔ اس فریضۂ شہادت علی الناس کی ادائیگی کے لیے تمہارا انتخاب کیا ہے۔ اب آخری رسول تو ہمارے محمدﷺ ہیں اور باقی نوعِ انسانی پر تاقیامِ قیامت یہ شہادت کی ذمہ داری ادا کرنا تمہارے ذمہ ہے۔ اور ذرا آگے چل کر فرمایا کہ یہ محنت اس لیے کرنی ہے کہ: ﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ ''تاکہ رسول تم پر گواہ ہو جائیں اور تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ''۔ یہ ہے قرآن میں شہادت کا اصل مفہوم۔ یہی وجہ ہے کہ تمام رسولوں کو ''شہید'' کہا گیا' حالانکہ رسول تو قتل ہوئے ہی نہیں۔ انبیاء ضرور قتل ہوئے ہیں' لیکن کوئی رسول قتل نہیں ہوا۔ حضرت مسیح علیہ السلام رسول تھے' یہودیوں نے انہیں قتل کرنے کی کوشش کی تو اللہ نے انہیں زندہ آسمان پر اٹھا لیا۔ ﴿وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ﴾ ''انہوں نے نہ تو اسے قتل کیا اور نہ سولی دی''۔ بہرحال یہاں پر (سورۃ الحدید میں) شہید کا مفہوم عام لوگوں نے چونکہ ''مقتول فی سبیل اللہ'' لیا ہے تو اس کی وجہ سے وہ الجھنیں پیدا ہو گئیں جن کی بناء پر اس آیت کی اصل عظمت لوگوں پر منکشف نہیں ہوئی۔

صدّیقیت اور شہادت کی حقیقت

اب آپ ان دونوں اصطلاحات ''صدّیقیت'' اور ''شہادت'' کی اصل حقیقت کو سمجھئے! دیکھئے' سورۃ الفاتحہ کی پانچویں آیت کے الفاظ ہیں: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ اور چھٹی آیت میں الفاظ آتے ہیں: ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ ''راستہ اُن کا جن پر تیرا انعام ہوا''۔ لیکن وہ کون لوگ ہیں جن پر اللہ کا انعام ہوا' اس کی وہاں پر کوئی وضاحت نہیں ہے۔ اس کی وضاحت سورۃ النساء کی آیت ۶۹ میں بایں الفاظ کر دی گئی: ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ﴾ ''جو کوئی بھی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حق ادا کر دے گا تو یہ وہ لوگ ہوں گے جو اُن کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا''۔ اور وہ کون لوگ ہیں؟ ﴿مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ط وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝﴾ ''یعنی انبیاء' صدّیقین' شہداء اور صالحین۔ اور کیا ہی خوب ہے ان کی رفاقت''۔ تو یہ منعم علیہم چار گروہ ہیں: انبیاء' صدّیقین' شہداء اور صالحین۔ ان میں نبوت سرفہرست ہے۔ ''صالحیت'' گویا ان چار مراتب کی base line ہے۔ اس کے اوپر

شہداء' ان کے اوپر صدّیقین اور سب سے اوپر انبیاء ہیں۔ ظاہر بات ہے نبوت تو پہلے بھی ہمیشہ وہبی شے تھی' کسبی نہیں تھی' کوئی شخص اپنی محنت ومشقت' ریاضت وعبادت اور کسی سلوک کی منازل طے کرنے سے نبوت حاصل نہیں کرسکتا تھا' یہ خالص وہبی شے تھی' جس کا دروازہ اب ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا۔ تو گویا عام انسانوں کے لیے تین درجے کھلے ہوئے ہیں: صالحین' شہداء اور صدّیقین۔

صدّیق اور شہید کے مابین فرق کیا ہے' یہ جان لیجیے۔ ذرا نوٹ کیجیے' سورۂ مریم میں حضرت ابراہیم اور حضرت ادریس علیہما السلام کے بارے میں ﴿صِدِّيقًا نَّبِيًّا﴾ جبکہ حضرت موسیٰ اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کے بارے میں ﴿رَسُوْلًا نَّبِيًّا﴾ کے الفاظ آئے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ قرآن کریم کا ایک خاصا مشکل مقام ہے کہ ان کے درمیان فرق کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی شخصیت کے جو سانچے (personality patterns) بنائے ہیں ان میں دو تقسیمیں بہت نمایاں ہیں۔ جدید سائیکالوجی میں آپ انہیں دروں بیں (introvert) اور بیروں بیں (extrovert) کہتے ہیں۔ مقدم الذکر لوگ غور وفکر کرنے والے' سوچ بچار میں منہمک' تنہائی پسند اور سلیم الفطرت ہوتے ہیں' جبکہ مؤخر الذکر لوگ فعّال قسم کے' بھاگ دوڑ کرنے والے ہوتے ہیں۔ یہ باہر کی دنیا میں مگن رہتے ہیں اور انہیں اپنے باطن میں جھانکنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ ان کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ خوب گفتگوئیں ہو رہی ہیں' مجلسوں میں خوب بحث ہو رہی ہے' خوش گپی ہو رہی ہے۔ چنانچہ یہ لوگ حقائق کی طرف زیادہ متوجہ نہیں ہوتے۔ ان دو کے علاوہ بہت شاذ لوگ (ambivert) ہوتے ہیں کہ جن کے اندر دروں بینی اور بیروں بینی کی دونوں صلاحیتیں موجود ہوں اور توازن کے ساتھ ہوں۔ بلکہ اکثر وبیشتر یہ دو چیزیں اگر کسی میں جمع ہو بھی جائیں تو پھر اُس کا توازن پر قائم رہنا چونکہ مشکل ہوتا ہے اس لیے ambivert کا لفظ بالعموم اچھے مفہوم میں استعمال نہیں ہوتا۔ آدمی یکسو اور یک رخا ہو گا تو وہ زیادہ مستحکم (stable) رہے گا' جبکہ ambivert کے اندر عدمِ استحکام (instability) کے امکانات زیادہ ہو جاتے ہیں۔

کسی شخصیت میں دونوں چیزیں موجود ہوں اور توازن کے ساتھ برقرار ہوں تو اس کی کامل مثال تو ایک ہی ہے اور وہ محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ باقی آپ کو انبیاء میں بھی دو درجہ بندیاں ملیں گی' جیسا کہ آپ کو صحابہ کرام ؓ میں دو درجہ بندیاں ملتی ہیں۔ حضرت ابوبکر صدّیق ؓ کی طبیعت کے اندر شروع ہی سے رقیق القلبی موجود تھی۔ کسی کو دکھ میں دیکھتے تو تڑپ اٹھتے' ہر کسی کی تکلیف کو رفع کرنے کی کوشش کرتے۔ پھر یہ کہ سلیم الفطرت تھے' کیسے ممکن تھا کہ کسی بُت کو سجدہ کریں! اور یہ توحید تو فطرتِ انسانی کے اندر موجود ہے' وہ جو ''اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ؟ قَالُوْا بَلٰی!'' کا عہد کر کے آئے تھے اس کے اثرات اس حیاتِ دُنیوی میں موجود تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر الصدّیق ؓ نے کبھی بھی کسی بُت کو سجدہ نہیں کیا' کبھی شرک کا ارتکاب نہیں کیا' کبھی بدکاری نہیں کی۔ گویا کہ ایک پاک طینت' صاف باطن شخصیت ہیں۔ یعنی اندر سے فطرت بھی پاک اور سلیم' اور کردار واخلاق بھی بہت عمدہ۔ تو ایسے شخص کے سامنے جب نبی کی دعوت آتی ہے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی تأخیر ہو۔ حضرت ابوبکر ؓ مقامِ صدّیقیت میں اُمت میں سب سے بلند مرتبہ ہیں اور صدّیق ثانی حضرت عثمان ؓ ہیں۔ حضرت ابوبکر ؓ کی دعوت سے جو لوگ ایمان لائے ان میں سرفہرست حضرت عثمان ؓ ہیں۔

دوسری طرف حضرت عمر اور حضرت حمزہ ؓ ہیں' جن کا مزاج حضراتِ ابوبکر وعثمان i سے مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ میں محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو چھ برس بیت جاتے ہیں اور اِن کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی کہ محمد ﷺ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں نے دو مثالیں اس لیے دی ہیں کہ حضرت عمر ؓ کی تو حضور ﷺ کے ساتھ کوئی ایسی قرابت داری نہیں تھی' ہوسکتا ہے کہ کچھ اور بھی عوامل کارفرما ہوں' لیکن حضرت حمزہ ؓ تو حضور ﷺ کے چچا ہیں' خالہ زاد بھائی ہیں' دودھ شریک بھائی ہیں' ساتھ کے کھیلے ہوئے ہم جولی ہیں اور حضور ﷺ کے ساتھ انتہائی محبت کرتے ہیں۔ بتایئے کون سا

حجاب ہے؟ کیوں نہیں ایمان لائے چھ برس تک؟ اس لیے کہ اُدھر توجہ ہی نہیں ہے۔ سیر وشکار سے فرصت نہیں ہے، کئی کئی دن تک تیر کمان لے کر صحرا کے اندر شکار میں مصروف ہیں۔ غور وفکر اور سوچ بچار والا مزاج ہی نہیں ہے۔ ادھر توجہ ہی نہیں ہے کہ یہ کائنات کیا ہے، اس کا بنانے والا کون ہے اور اس زندگی کا مقصد کیا ہے؟ صرف عدم توجہی ہے، ورنہ حضور ﷺ سے عناد ہونے کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ کوئی منفی عامل سرے سے موجود ہی نہیں ہے سوائے عدم توجہی کے۔ چنانچہ چھ برس بعد ایمان لائے ہیں اور وہ بھی جذباتی طور پر۔ شکار سے واپس آئے تو کنیز (حضرت فوزیہ رضی اللہ عنہا) نے کہا کہ آج تو ابوجہل نے آپ کے بھتیجے (محمد ﷺ) پر بڑی زیادتی کی ہے، بہت گستاخی کے ساتھ پیش آیا ہے۔ پس وہ جو دل میں محبت تھی اس نے جوش مارا اور سیدھے ابوجہل کے پاس پہنچے جہاں وہ اپنی پارٹی کو لے کر بیٹھا ہوا تھا، جاتے ہی کمان اس کے سر پر دے ماری جس سے سر پھٹ گیا۔ اس سے کہنے لگے کہ تمہاری یہ ہمت کہ تم نے میرے بھتیجے کے ساتھ یہ معاملہ کیا! اور پھر اسی وقت کہا کہ اچھا میں اس پر ایمان لاتا ہوں، آؤ مقابلہ کرو! یہ شان ہے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ایمان کی۔ تو اس کو ذرا اچھی طرح سمجھئے۔ اِن دو شخصیتوں کا فرق اگر نہیں سمجھیں گے، اور یہ جو اللہ تعالیٰ نے مختلف انسانوں کے مختلف مزاج بنائے ہیں ان کا جب تک فہم وشعور نہ ہوگا یہ آیت سمجھ میں نہیں آئے گی، اور یہ کہ صدّیقیت اور شہادت کسے کہتے ہیں، یہ بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ شہید کے معنی صرف مقتول فی سبیل اللہ ہی ذہن میں رہ جائیں گے اور یہ جو قرآن مجید کے اصل حقائق ومعارف ہیں ان سے محرومی رہے گی۔

یہی معاملہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہے۔ ان کے ہاں تو معاملہ اس سے آگے بڑھ کر عصبیت جاہلی کا تھا کہ محمد (ﷺ) تو ہمارے آبائی دین اور آبائی عقائد کی نفی کر رہے ہیں، یہاں تک کہ بالآخر وہ دشمنی اس انتہا کو پہنچ گئی کہ گھر سے تلوار لے کر یہ فیصلہ کر کے نکلے ہیں کہ آج میں ان کا کام تمام کر دوں گا۔ کفارِ مکہ درحقیقت یہ دیکھ رہے تھے کہ بنو ہاشم محمد (ﷺ) کی پشت پناہی کر رہے ہیں، اب اگر ہم نے محمد (ﷺ) کو کوئی گزند پہنچا دیا تو بنو ہاشم ان کے انتقام کے لیے کھڑے ہو جائیں گے، اس طرح ہمارا آپس کا اتحاد پارہ پارہ ہو جائے گا، عرب کے اندر ہماری حیثیت مجروح ہو جائے گی، بلکہ ہماری قبائلی جنگ شروع ہو جائے گی۔ ان کے لیے رکاوٹ صرف یہی تھی۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ اب تو پانی سر سے گزر رہا ہے، گھر گھر میں لڑائی ہو رہی ہے، بھائی بھائی سے کٹ گیا ہے، بیوی شوہر سے جدا ہو رہی ہے، شوہر بیوی سے کٹ گیا ہے، والدین سے اولاد علیحدہ ہو گئی ہے تو ''تنگ آمد بجنگ آمد'' کے مصداق عمر بن خطاب نے فیصلہ کر لیا کہ اب تو جو ہو سو ہو، میں تو انہیں قتل کر دوں گا۔ چنانچہ سیف بدست نکل کھڑے ہوئے۔ راستے میں حضرت حذیفہؓ بن عتبہ ملے، وہ ایمان لا چکے تھے، لیکن عمر کو معلوم نہیں تھا۔ انہوں نے کہا کہ عمر کیا بات ہے؟ اتنے جوش وجلال کے ساتھ کہاں چلے؟ کہا کہ میں نے تو فیصلہ کر لیا ہے کہ آج یہ جھگڑا ختم کر کے رہوں گا، میں محمد (ﷺ) کو قتل کرنے جا رہا ہوں۔ انہوں نے بڑی حکمت سے یہ کہہ کر ان کا رخ موڑ دیا کہ تمہارے تو اپنے بہن اور بہنوئی ایمان لا چکے ہیں! اب غصے میں آگ بگولہ ہو کر اپنی حقیقی بہن فاطمہ بنت خطاب اور بہنوئی سعید بن زید (رضی اللہ عنہما) کے ہاں پہنچے اور غصہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ اندر قرآن مجید پڑھ رہے تھے۔ وہاں حضرت خباب بن اَرت رضی اللہ عنہ انہیں قرآن پڑھانے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ سورۂ طٰہٰ کی آیات نازل ہوئی تھیں اور وہ آ کر انہیں سنا رہے تھے۔ عمر کی آواز سن کر انہوں نے حضرت خباب رضی اللہ عنہ کو تو چھپا لیا۔ عمر نے گھر میں داخل ہو کر بہنوئی حضرت سعیدؓ کو مارنا شروع کیا۔ بہن درمیان میں آئیں تو اُن کو بھی ایک ایسا تھپڑ لگایا کہ چہرہ لہولہان ہو گیا۔ لیکن بہن کی زبان سے یہ جملہ نکلا: عمر! چاہے تم ہمیں جان سے مار دو، اب ہم اس دین کو چھوڑیں گے نہیں جسے ہم نے اختیار کیا ہے۔ ان کا یہی جملہ تھا جو عمر بن خطاب کے انقلاب کی وجہ بنا ع

دگرگوں کرد تقدیر عمر را!

عمر سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ صنفِ نازک میں یہ ہمت اور یہ حوصلہ کیونکر پیدا ہوا! یوں سمجھئے

کہ اندر تو سب کچھ تھا' اوپر خول آیا ہوا تھا۔ بس اس خول کے اندر سوراخ ہو گیا' لیکن کسی دلیل و منطق سے نہیں' غور و فکر سے نہیں' یہ ہوا ہے جذباتی طور پر (emotionally)۔
تو اس اُمت کے دو عظیم ترین شہداء ہیں حضرت حمزہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما۔ اور اِس اُمت کے دو عظیم ترین صدّیق ہیں حضرت ابوبکر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما۔
یہ مضمون معارفِ قرآن حکیم کا ایک اہم باب ہے۔ اس پر بدقسمتی سے جتنی توجہ ہونی چاہیے تھی میرے علم کی حد تک اتنی توجہ نہیں ہوئی۔

بعض اہم دینی اصطلاحات کے مابین ربط و تعلق

اب آپ کے سامنے ایک نقشہ پیش کیا جا رہا ہے' جو دین کی بعض اہم اصطلاحات کے مابین ربط و تعلق کے لیے بہت مفید ہے۔ اس نقشے میں دائیں اور بائیں دو انتہائیں وجود میں آ رہی ہیں۔ ایک طرف عروج ہے اور دوسری طرف نزول ہے' یعنی ایک عروجی کیفیت ہے اور ایک نزولی کیفیت ہے اور ان کے مابین base line ''عبدیت'' اور ''صالحیت'' ہے۔ ''عبدیت'' کی اصطلاح قرآن میں سب سے زیادہ استعمال ہوئی ہے۔ سورۃ البقرۃ کے تیسرے رکوع کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے: ﴿یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّکُمُ﴾ ''اے لوگو! اپنے ربّ کی بندگی اختیار کرو''۔ لیکن سورۃ النساء کی آیت ۶۹ میں ''صالحین'' کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ یہ دونوں اصطلاحیں چونکہ base line ہیں اس لیے ان دونوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ جس شخص نے فیصلہ کر لیا ہو کہ میں اللہ کا بندہ بن کر ہی زندگی گزاروں گا' وہ صالحین میں شامل ہو گیا۔

اب اس کے اوپر کے درجات کے لیے تین اصطلاحات ہیں اور یہ تینوں تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں۔ ایک ہے ''ولایت'' یعنی اللہ کی دوستی۔ اس کی تفصیل سورۃ حٰمٓ السجدۃ میں بایں الفاظ آئی ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا ......﴾

''جن لوگوں نے کہا ہمارا ربّ اللہ ہے پھر اُس پر ثابت قدم رہے......''

یعنی جن کو بھی اس عبدیت پر استقامت حاصل ہو گئی' جن کا بھی ایمان پر دل ٹھک گیا اور انہیں اللہ کے ساتھ تسلیم و رضا کی کیفیت حاصل ہو گئی' ان کا توکّل کُل کا کُل اللہ کی ذات پر مرکوز ہو گیا اور وہ اطاعتِ کلی پر کاربند ہو گئے' تو یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

﴿اَلَاۤ اِنَّ اَوۡلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ۚۖ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ کَانُوۡا یَتَّقُوۡنَ ؕ﴾ (یونس)

''آگاہ ہو جاؤ! یقیناً اللہ کے دوست تو وہ ہیں کہ جن پر (قیامت کے دن) نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور انہوں نے پرہیزگاری کی روش اختیار کی۔''

اس دوستی کے لیے ایک لفظ ''خُلّت'' بھی ہے اور یہ خاص طور پر حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام کے لیے استعمال ہوا ہے۔ سورۃ النساء میں ارشاد ہوا: ﴿وَاتَّخَذَ اللّٰہُ

اِبۡرٰهِيۡمَ خَلِيۡلًا ﴿۱۲۵﴾ ''اور اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو اپنا خلیل بنا لیا''۔ تو یہ ''ولایت'' اور ''خُلّت'' دو اصطلاحات ہیں۔ لیکن ایک اعتبار سے ''صدّیقیت'' کی اصطلاح بھی ان کے ہم پلہ ہے۔ صدّیق وہ شخص ہے جو نیک سرشت ہو' جو طبعاً نیک' راست باز' راست گو' راست رو ہو اور وہ ہر اچھی بات کی تصدیق کرنے کے لیے تیار اور آمادہ رہتا ہو۔ یہ ہے وہ مرتبہ جس کے اُوپر عروج کی آخری منزل ''نبوت'' ہے۔ میں نے اسی لیے ''رسالت'' کو نیچے رکھا ہے کہ میں ان حضرات کی رائے سے متفق ہوں جو رسالت کو مقامِ ''نزول'' میں سمجھتے ہیں' اس لیے کہ اصل عروج نبوت ہے۔ اس کے بعد حکم دیا جاتا ہے کہ اب اللہ کا پیغام لے کر لوگوں کی طرف جاؤ! یہ مقام رسالت ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا تھا: ﴿اِذۡهَبۡ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰى﴾ (طٰہٰ) ''جاؤ فرعون کی طرف! یقیناً وہ سرکشی پر اتر آیا ہے''۔ یہ نزول اس اعتبار سے بھی بہت خوبصورت لفظ ہے کہ حضورﷺ پر وحی نازل ہوئی جبکہ آپ جبلِ نور پر غارِ حرا میں تشریف فرما تھے۔ حضرت موسیٰؑ کو حکم ہو رہا ہے: ﴿اِذۡهَبۡ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰى﴾ جبکہ آپؑ کوہِ طور پر اللہ سے ہم کلامی پر مشرف ہوئے۔ کہا جا رہا ہے کہ اب اس بلندی سے نیچے اترو اور جاؤ اللہ کا پیغام ہدایت لے کر لوگوں کی طرف۔

اس کیفیت کو علامہ اقبال نے شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے ایک قول کے حوالے سے اپنے چوتھے خطبے میں بہت خوبصورتی سے واضح کیا ہے۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ ایک بہت بڑے صوفی تھے۔ ان کا ایک جملہ ہے: ''محمد عربیؐ بالائے آسمان رفت و باز آمد' بخدا اگر من رفتمے باز نہ آمدمے''۔ یعنی محمد عربیﷺ ساتویں آسمان پر چلے گئے اور پھر واپس آ گئے' خدا کی قسم! اگر میں وہاں پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ آتا۔ علامہ اقبال کہتے ہیں:

"This is the difference between prophetic experience and mystic experience."

دراصل صوفی اللہ کے ساتھ لو لگا کر بیٹھ رہتا ہے۔ اس کیفیت میں جو سرور و کیف ہے اس سے تو ظاہر ہے کہ وہی شخص آگاہ ہے جس کو یہ کیفیت نصیب ہو جائے۔ جیسے کہا جاتا ہے: ''لذّتِ ایں بادہ نہ دانی بخدا تا نہ چشی''۔ چنانچہ جس نے کبھی اس چیز کو چکھا نہ ہو وہ اس کے اندر جو سرور و کیف ہے اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکتا۔ اگر اللہ کے ساتھ لو لگی ہوئی ہے تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ع ''بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے''۔ عبدالقدوس گنگوہیؒ کا ہی ایک اور واقعہ بھی روایات میں ملتا ہے کہ ایک بار مراقبے میں بیٹھے ہوئے تھے ___ اُس وقت جو بھی کیفیت ہو گی ہم اس کو نہیں سمجھ سکتے ___ کہ اچانک اقامت کی آواز آ گئی: قَدۡ قَامَتِ الصَّلٰوةُ ۔ اُس وقت انہیں کھڑے تو ہونا پڑا' لیکن کہا یہ کہ ''حضوری سے نکال کر دربانی میں کھڑا کر دیا''۔ یعنی مراقبے میں تو مجھے حضوری کی کیفیت حاصل تھی۔ لیکن بہرحال نماز کے لیے کھڑے ہو گئے' اس لیے کہ حکم خداوندی ﴿وَارۡكَعُوۡا مَعَ الرّٰكِعِيۡنَ﴾ پر عمل پیرا ہوتے ہوئے جماعت میں شریک ہونا لازم ہے۔

تو ظاہر بات ہے جو اللہ کا بندہ اس مقام بلند پر پہنچ گیا ہو اَب اسے کہا جائے کہ جاؤ تبلیغ کرو تو اس پر یہ گراں تو گزرے گا! تبلیغ دین میں تو لوگوں کی جلی کٹی سننی پڑتی ہیں۔ جیسے حضورﷺ سے کوئی کہتا پاگل ہو گئے ہیں' کوئی کہتا دماغ خراب ہو گیا ہے' کوئی کہتا یقیناً اس سے ان کا کوئی نہ کوئی مقصد ہے' یہ کوئی لیڈری چاہتے ہیں' یہ چاہتے ہیں کہ کچھ لوگ ان کے نام کی مالا جپیں۔ قرآن نے ان کے الفاظ نقل کیے ہیں: ﴿اِنَّ هٰذَا لَشَىۡءٌ يُّرَادُ﴾ کسی نے کہا جادوگر ہیں' کسی نے کہا شاعر ہیں۔ معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ۔ نقل کفر کفر نباشد! تو اس سے حضورﷺ کے دل پر جو بیت رہی تھی قرآن خود اُس پر اِن الفاظ میں تبصرہ فرماتا ہے: ﴿وَلَقَدۡ نَعۡلَمُ اَنَّكَ يَضِيۡقُ صَدۡرُكَ بِمَا يَقُوۡلُوۡنَ﴾ ''(اے نبیؐ!) ہمیں خوب معلوم ہے کہ جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں اس سے آپؐ کا سینہ بھنچتا ہے (آپ کو صدمہ پہنچتا ہے)''۔ اسی لیے کہا گیا: ﴿وَاصۡبِرۡ عَلٰى مَا يَقُوۡلُوۡنَ﴾ ''صبر کیجیے اس پر جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں''۔ ہمیں خوب معلوم ہے کہ اس سے آپ کو تکلیف پہنچ رہی ہے' کوفت ہو رہی ہے' لیکن صبر کیجیے! اور یہ معاملہ صرف زبانی ایذاء تک محدود نہیں رہا بلکہ اس کے بعد جسمانی ایذائیں بھی شروع ہو گئیں۔ تو رسالت میں تو یہ ساری مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ جبکہ نبوت و ولایت کے مقام پر آدمی آرام و سکون

سے بیٹھا ہوتا ہے ۔ صوفیاء تو صرف اُسے تذکیر کریں گے جو اُن کی خانقاہوں میں آئے گا‘ وہ دربدر تو نہیں جائیں گے‘ انہیں کسی کی کوئی کڑوی کسیلی بات نہیں سننی پڑے گی ۔ خانقاہ تو گویا ایک ہسپتال ہے ۔ جیسے کوئی مریض علاج کی غرض سے ہسپتال میں آتا ہے اسی طرح جس کے اندر احساس بیدار ہو گیا ہے اور وہ تزکیئے کا خواہاں ہے تو وہ خانقاہ میں حاضر ہو جائے گا اور اس کو جو بھی حکم دیا جائے گا وہ مانے گا ۔ اس میں تزکیہ کرنے والے صوفی کو مشقت نہیں اٹھانا پڑتی‘ جبکہ رسول کا معاملہ اس کے برعکس ہے‘ وہ دردر جا رہے ہیں اور کہیں کچھ سن رہے ہیں‘ کہیں کچھ سن رہے ہیں ۔

اس مقامِ عروج ونزول کو مولانا رومؒ نے عالمِ جسمانی کی ایک مثال کے ذریعے بہت خوبصورتی سے واضح کیا ہے کہ جب سمندر میں سورج کی حرارت اور تمازت اثر انداز ہوتی ہے تو سمندر کا پانی بخارات کی شکل میں اوپر جا رہا ہوتا ہے ۔ یہ بالکل صاف و شفاف مقطّر پانی (distilled water) ہوتا ہے‘ اس میں کثافتیں (impurities) نہیں ہوتیں ۔ یہی بخارات اوپر جا کر بادل کی شکل اختیار کرتے ہیں اور پھر بارش بن کر برستے ہیں ۔ بخارات کا اوپر جانا عروج ہے اور بارش کا برسنا نزول ہے ۔ جب وہی پانی بارش کی شکل میں برستا ہے تو سب سے پہلے فضا کو صاف کرتا ہے‘ پھر زمین کو صاف کرتا ہے ۔ یعنی وہی پانی فضا اور زمین کی گندگیوں اور کثافتوں کو اپنے اندر لے کر نالوں اور دریاؤں سے ہوتا ہوا دوبارہ سمندر میں پہنچ جاتا ہے ۔ یہ گویا عروج اور نزول کا ایک سلسلہ ہے ۔ اللہ کے نبیؐ جب رات کے وقت کھڑے ہوتے تھے تو وہ عروج کی کیفیت ہوتی تھی ۔ یہ مقامِ عبدیت ہے‘ جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف رُخ ہے اور اللہ تعالیٰ کی بندگی ہو رہی ہے ۔ اور دن کے وقت جب دعوت وتبلیغ کے لیے گلیوں میں پھر رہے ہیں‘ گھر گھر جا رہے ہیں‘ لوگوں سے بات کر رہے ہیں اور ان کی جلی کٹی باتیں سننی پڑ رہی ہیں تو طبیعت میں ایک انقباض ہوتا ہے‘ کثافت پیدا ہوتی ہے ۔ چنانچہ حضورﷺ سے فرمایا گیا : ﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّکَ یَضِیْقُ صَدْرُکَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ﴾ ’’ہمیں خوب معلوم ہے کہ جو باتیں یہ کہہ رہے ہیں ان سے آپ کا سینہ بھنچتا ہے‘‘ ۔ لیکن آپ اندازہ کیجیے کہ کتنے لوگ ہیں جو اُس دعوت وتبلیغ کے نتیجے میں پاک صاف ہو گئے؟ کتنوں کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ وہ خود بھی عروج کی کیفیت حاصل کریں ۔ تو دراصل رسالت مرتبۂ نزول میں ہے ۔

قرآن مجید میں رسالت کے قریب ترین لفظ شہادت ہے ۔ سورۃ المزمل میں ارشاد ہوا:

﴿اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَیْکُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَیْکُمْ کَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ۝﴾

’’(لوگو!) ہم نے تمہاری طرف ایک رسول تم پر گواہ بنا کر بھیجا ہے جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول (یعنی موسٰی علیہ السلام) بھیجا تھا ۔‘‘

سورۃ الاحزاب میں ارشاد ہوا:

﴿یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ۝﴾

’’اے نبی (ﷺ)! یقیناً ہم نے آپ کو بھیجا ہے گواہ بنا کر اور خوش خبری دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر‘‘ ۔

یہاں تین صفات میں سب سے پہلے شاہد کا لفظ آیا ہے کہ ہم نے آپ کو گواہ بنا کر بھیجا ہے ۔ یہ گواہی ہمیں اپنے قول سے بھی دینی ہے‘ جیسے ہم زبانی اقرار کرتے ہیں: اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۔ پھر ہمارا عمل بھی گواہی دے کہ واقعتاً ہم اللہ کے بندے ہیں اور ہم واقعتاً محمدﷺ کو اللہ کا رسول مانتے ہیں ۔ پھر اِس گواہی کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ لوگوں کو جمع کرو اور ایک اجتماعی نظام قائم کرو‘ جو پوری دنیا کے اوپر گواہ بن جائے کہ بہترین نظام وہی ہے جو اللہ نے اپنے رسولﷺ کے ذریعے سے عطا کیا ہے ۔ اب ظاہر بات ہے اس کے لیے عملی جدوجہد درکار ہے ۔ چنانچہ اس شہادت کے لیے اب ان لوگوں کی اہمیت زیادہ ہو جائے گی جن کے اندر قوتِ کار اور بھاگ دوڑ کی صلاحیت زیادہ ہے ۔ جبکہ تصدیق کرنے میں وہ لوگ پیش قدمی کر جائیں گے جو سلیم الفطرت اور رقیق القلب ہیں ۔ یہ ہیں اصل میں ’’صدّیقین‘‘ اور ’’شہداء‘‘ کے دو مزاج ۔ بیروں بیں (extroverts) شہداء بنیں گے اور دروں بیں (introverts) صدّیق بنیں گے‘ ان کو تصدیق کرنے میں دیر نہیں لگے گی‘ پیش

قدمی کر جائیں گے۔لیکن اس کے بعد عملی جدوجہد میں نبی کے دست و بازو بننے میں شہداء پیش پیش ہوں گے‘ جو بھاگ دوڑ کرنے والے ہیں۔حضراتِ ابوبکر وعثمان رضی اللہ عنہما اور نہ معلوم کتنے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے کہ ان کے ایمان لانے کے بعد بھی مسلمانوں کو کھلم کھلا حرم میں جا کر نماز پڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔لیکن جس سال حضرات حمزہ وعمر رضی اللہ عنہما ایمان لے آئے تو اَب مسلمانوں نے ڈنکے کی چوٹ حرم میں جا کر نماز پڑھی۔حضرت مسیح علیہ السلام کا بڑا پیارا قول ہے: ’’کتنے ہی ہیں جو بعد میں آتے ہیں لیکن پہلوں سے آگے نکل جاتے ہیں‘‘۔حضور ﷺ نے جن کو حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ کے بعد عظیم ترین انسان معین کیا ہے وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہیں جو پیغامِ ہدایت پہنچنے کے تقریباً چھ سال بعد ایمان لائے ہیں۔اندازہ کیجیے کہ آپؓ سے پہلے چھ سالوں میں کم از کم تیس چالیس افراد تو ایمان لا چکے ہوں گے‘ لیکن وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے پیچھے رہ گئے ہیں۔اس لیے کہ آپؓ فعّال انسان ہیں‘ آپ کے قوائے عملیہ زیادہ چاق وچوبند ہیں۔جبکہ ایک وہ ہیں جن کے قوائے فکریہ وعلمیہ کی حیثیت زیادہ ہے۔تو اس اعتبار سے ’’صدّیقیت‘‘ بلند ترین منزل ہے اور ’’شہادت‘‘ اس سے نیچے ہے۔

سورۃ النساء میں ارشاد ہوا:

﴿وَمَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوۡلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیۡقِیۡنَ وَالشُّہَدَآءِ وَالصّٰلِحِیۡنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیۡقًا ﴿۶۹﴾﴾

’’جو لوگ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کریں گے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے‘ یعنی انبیاء اور صدّیقین اور شہداء اور صالحین۔ اور کیا ہی اچھی ہے ان لوگوں کی رفاقت۔‘‘

یعنی جو کوئی بھی معنوی طور پر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر کاربند ہو جائے گا اسے ان لوگوں کی ایک معیت ورفاقت حاصل ہو گی جن پر اللہ کا انعام ہوا ہے۔ان میں سب سے پہلے انبیاء ہیں‘ ان سے نیچے صدّیقین ہیں‘ ان سے نیچے شہداء کا رتبہ ہے اور پھر سب سے نیچے صالحین ہیں جو base line ہے۔یہ ہے درحقیقت وہ ربط وتعلق جو ان الفاظ کے مابین ہے۔

فریضۂ شہادت علی الناس ــــــ قرآن حکیم کی روشنی میں

قرآن مجید میں ’’شہید‘‘ درحقیقت گواہ کے معنی میں آتا ہے۔دنیا کی زندگی میں یہ گواہی دعوت وتبلیغ اور عملی شہادت کے ذریعے سے ہے۔اور یہی لوگ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی عدالت میں استغاثہ کے گواہ (Prosecution Witness) کی حیثیت سے کھڑے ہوں گے کہ اے اللہ! ہم نے تیرا پیغام انہیں پہنچا دیا تھا۔قرآن مجید میں اہم مضامین دو مرتبہ ضرور آتے ہیں۔چنانچہ یہ مضمون بھی دو مرتبہ آیا ہے کہ حضور ﷺ تم پر گواہی دیں گے اور تم بقیہ لوگوں پر گواہی دو گے کہ اے اللہ! تیرے نبیؐ نے تیرا جو پیغام ہم تک پہنچایا تھا‘ وہ ہم نے انہیں پہنچا دیا تھا۔سورۃ الحج کی آخری آیت میں ارشاد ہوا ہے:

﴿وَجَاھِدُوۡا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِھَادِہٖ ؕ ھُوَ اجۡتَبٰکُمۡ وَمَا جَعَلَ عَلَیۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ مِنۡ حَرَجٍ ؕ مِلَّۃَ اَبِیۡکُمۡ اِبۡرٰھِیۡمَ ؕ ھُوَ سَمّٰکُمُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ۬ۙ مِنۡ قَبۡلُ وَفِیۡ ھٰذَا لِیَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ شَھِیۡدًا عَلَیۡکُمۡ وَتَکُوۡنُوۡا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ ۚ﴾ (الحج: ۷۸)

’’اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ اس کی راہ میں جہاد کا حق ہے‘ اس نے تمہیں چن لیا ہے‘ (حق کی پاسبانی اور اشاعت کے لیے) اور نہیں روا رکھی اس نے تم پر دین کے معاملہ میں کوئی تنگی۔پیروی کرو اپنے باپ ابراہیم کے دین کی۔اللہ نے تمہارا نام مسلم (سرِ اطاعت خم کرنے والا) رکھا ہے اس سے پہلے‘ اور اس قرآن میں بھی (تمہارا یہی نام ہے)‘ تاکہ رسولؐ تم پر گواہ ہو اور تم بقیہ نوعِ انسانی پر گواہ بنو!‘‘

سورۃ الحج اور سورۃ البقرۃ اس اعتبار سے ایک دوسری کے ساتھ منسلک ہیں کہ ہجرت سے متصلاً قبل سورۃ الحج اور ہجرت کے فوراً بعد سورۃ البقرۃ نازل ہوئی ہے۔یہی مضمون سورۃ البقرۃ میں بھی بایں الفاظ آیا ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط﴾ (آیت ۱۴۳)

''اور اسی طرح ہم نے تم کو اُمت وسط بنایا ہے' تاکہ تم لوگوں پر بطورِ گواہ کھڑے ہو اور رسول تم پر بطورِ گواہ کھڑا ہو۔''

اس گواہی کا تعلق دنیا سے بھی ہے اور آخرت سے بھی۔ یہاں پر آخرت کو خاص طور پر نمایاں نہیں کیا گیا' لیکن وہ اس میں implied ہے۔ دنیا میں تم گواہی دو گے دعوت وتبلیغ اور اتمامِ حجت کے ذریعے اور قیامت کے دن اسی گواہی کا ظہور ہو جائے گا جبکہ تم اللہ کی عدالت میں کھڑے ہو کر گواہی دو گے۔ تو یہ مضمون بھی قرآن مجید میں دو جگہ آیا ہے۔ ایک سورۃ النحل میں' جو ہجرت سے متصلاً قبل نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے۔ سورۃ النحل کی آیت ۸۹ میں ہے:

﴿وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ ط﴾

''اور اس دن (کا تصور کیجیے اے نبیؐ!) جس دن ہم ہر اُمت میں سے ایک گروہ گواہ بنا کر کھڑا کریں گے ان ہی میں سے' اور آپؐ کو گواہ بنا کر کھڑا کریں گے اِن (اہل عرب) پر''۔

اس ضمن میں دوسرا مقام سورۃ النساء آیت ۴۱ ہے' جس کا ذکر گزشتہ نشست میں حضرت عبداللہ بن مسعودh کی حدیث کے حوالے سے ہو چکا ہے۔ وہاں فرمایا:

﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا o﴾

پھر اُس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے اور آپ کو بھی (اے محمدﷺ!) ان لوگوں کے خلاف بطور گواہ کھڑا کریں گے''۔

نوٹ کیجیے ''علٰی'' کا صلہ مخالفت کے لیے آتا ہے۔ یعنی وہاں گواہی ان کے خلاف پڑے گی۔ اس لیے کہ اگر کوئی قوم اس پوزیشن میں ہو کہ یہ کہہ سکے کہ اے اللہ! تیرا پیغام ہم تک تو آیا ہی نہیں' تو اس چیز کا انہیں اللہ کے ہاں کریڈٹ ملے گا اور انہیں رعایت دی جائے گی۔ ''Ignorance of law is no excuse'' دنیا کا قاعدہ ہے جبکہ اللہ کے ہاں ان لوگوں کو رعایت ملے گی جن تک بات نہیں پہنچی۔ اُن کا جرم اِن کے کھاتے میں جمع ہو گا جن کے ذمہ تھا کہ پہنچائیں لیکن انہوں نے نہیں پہنچایا۔ بہرحال جن لوگوں تک بات نہیں پہنچی ان کے لیے تو وہ عذر ہو گیا' لیکن جن تک بات پہنچا دی گئی ان کے لیے کوئی عذر باقی نہیں۔ سورۃ النساء میں ارشاد ہوا: ﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ط وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ؀﴾ ''ہم نے اپنے رسولوں کو مبشر اور نذیر بنا کر بھیجا تاکہ رسولوں کے آنے کے بعد کوئی عذر باقی نہ رہ جائے لوگوں کے حق میں اللہ کے (محاسبہ کے) خلاف''۔ تاکہ وہ یہ عذر نہ پیش کر سکیں کہ اے اللہ! تو ہم سے کس بات کا حساب لے رہا ہے' ہم تک تو تیرا پیغام پہنچا ہی نہیں۔

اس بات کو ایک سادہ ترین مثال سے سمجھئے! آپ کسی شخص کے ذریعے سے اپنے کسی دوست اور عزیز کو اپنا پیغام بھیجتے ہیں کہ فلاں کام کل شام تک ضرور ہو جانا چاہیے ورنہ میرا بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔ فرض کیجیے وہ کام نہیں ہوا۔ اب آپ غصے میں بھرے ہوئے اس دوست یا عزیز کے پاس جائیں گے جس تک آپ نے اپنا پیغام بھجوایا تھا اور اس سے کہیں گے کہ میں نے آپ تک یہ پیغام بھیجا تھا' آپ نے میرا وہ کام نہیں کیا اور مجھے اتنا بڑا نقصان ہو گیا' اس کا کون ذمہ دار ہے؟ اب اگر وہ صرف ایک جملہ کہہ دے کہ بھائی مجھے تو آپ کا پیغام ملا ہی نہیں' تو اس صورت میں آپ کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا' آپ اس سے شکوہ نہیں کر سکیں گے اور اب آپ کا سارا غصہ پیغام بر کی طرف جائے گا۔ آپ جا کر اس کی گردن ناپیں گے کہ اللہ کے بندے! میں نے تجھے اتنا اہم پیغام دے کر بھیجا تھا' تم نے میرا پیغام کیوں نہیں پہنچایا؟ تو اگر پیغام بر نے پیغام پہنچا دیا تو وہ بری ہو گیا' اب ساری ذمہ داری اس کی ہے جسے پیغام پہنچ گیا' لیکن اگر پیغام بر نے پیغام پہنچانے میں کمی کی ہے تو ساری ذمہ داری پیغام بر کی ہے اور جس کے پاس پیغام پہنچنا تھا اس کی کوئی ذمہ داری نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ سورۃ الاعراف میں فرمایا: ﴿فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِیْنَ اُرْسِلَ اِلَیْھِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِیْنَ ۝﴾ ''ہم لازماً پوچھ کر رہیں گے ان سے بھی جن کی طرف رسولوں کو بھیجا گیا اور ہم لازماً پوچھ کر رہیں گے رسولوں سے بھی۔'' ہم رسولوں سے بھی پوچھ گچھ کریں گے کہ تم نے ہمارا پیغام پہنچا دیا تھا یا نہیں۔ وہ کہیں گے اے اللہ! ہم نے پہنچا دیا تھا اور ہم نے فریضہ رسالت کی ادائیگی پر لوگوں سے گواہی بھی لے لی تھی۔ خطبۃ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے لوگوں سے فرمایا: ((اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ؟)) ''لوگو! کیا میں نے تم تک اللہ کا پیغام پہنچا دیا ہے؟'' اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یک زبان ہو کر کہا: ''اِنَّا نَشْھَدُ اَنَّکَ قَدْ بَلَّغْتَ الرِّسَالَۃَ وَاَدَّیْتَ الْاَمَانَۃَ وَنَصَحْتَ الْاُمَّۃَ وَکَشَفْتَ الْغُمَّۃَ'' ''ہم گواہ ہیں (اے اللہ کے رسولؐ!) آپ نے یقیناً فرض رسالت ادا کر دیا' اور امانت کا حق ادا کر دیا' اور امت کی نصیحت کی ذمہ داری ادا کر دی اور آپ نے (گمراہی کے) تمام اندھیروں کو زائل کر دیا''۔ تو اللہ کے رسول اپنی اپنی ذمہ داریوں سے بری ہو جائیں گے' اب ساری ذمہ داری ان کی ہو گی جن تک اللہ کا پیغام پہنچ گیا ہو گا۔ یہ ہے اصل میں شہادت!

صدّیقیت وشہادت کے مراتب کھلے ہیں

ظاہر بات ہے کہ اہل ایمان میں بھی مختلف قسم کی شخصیتیں ہیں۔ کچھ لوگ اگر دروں بیں قسم کے ہیں' یعنی غور و فکر کرنے والے' سوچ بچار کرنے والے' سلیم الفطرت' رقیق القلب لوگ ہیں تو وہ صدّیقیت کے مقام پر جا پہنچیں گے اور جن کا مزاج ایسا نہیں ہے وہ کم سے کم شہادت کے مرتبے تک پہنچ جائیں گے۔ یہ دونوں راستے ان لوگوں کے لیے کھلے ہوئے ہیں جنہوں نے اپنے باطن سے مال کی محبت کا بریک کھول دیا ہے۔ لیکن اگر یہ بریک لگا ہوا ہے تو وہ آگے بڑھ ہی نہیں سکتے' ان کے لیے کوئی ترفع اور ترقی نہیں ہے' وہ تو بس نام کے مسلمان ہیں جو جیسے بھی ہیں چل رہے ہیں۔ لیکن اگر کسی نے دل سے مال کی محبت کو کھرچ دیا ہو اور پھر اللہ پر ایمان لایا ہو تو وہ مرتبہ صدّیقیت پر فائز ہو سکتا ہے۔ اس کی تفصیل سورۃ الحدید کی آیت ۱۸ اور ۱۹ میں ہے۔

البتہ اس میں یہ مغالطہ ہرگز نہ آنے پائے کہ جس شخص کو نبیؐ کی دعوت براہِ راست پہنچی ہو اور اس نے اس پر لبیک کہا ہو صرف وہی مرتبہ صدّیقیت پر فائز ہو سکتا ہے۔ بلکہ ہم میں سے بھی ہر شخص یہ رتبۂ خاص حاصل کر سکتا ہے۔ ہم نسلی طور پر مسلمان ہیں' عقیدۃً ایمان ہمارے پاس ہے' لیکن شعوری ایمان نہیں ہے۔ تو آج بھی ہم اس کی تحصیل کر سکتے ہیں۔ تجدید ایمان اسی کا نام ہے۔ ہر گناہ کے بعد جب انسان توبہ کرتا ہے تو وہ تجدید ایمان ہے۔ سورۃ الفرقان کا آخری رکوع ہمارے اس منتخب نصاب کے حصہ سوم میں شامل ہے۔ اس میں آیات ۶۸ تا ۷۰ میں توبہ کا مضمون بڑے خوبصورت انداز میں آیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـھًا اٰخَرَ وَلَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا یَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ یَلْقَ اَثَامًا ۝ یُّضٰعَفْ لَہُ الْعَذَابُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَیَخْلُدْ فِیْہٖ مُھَانًا ۝ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِھِمْ حَسَنٰتٍ ۭ وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۝﴾

''اور (رحمٰن کے بندے وہ ہیں) جو اللہ کے سوا کسی اور معبود کو نہیں پکارتے' اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق قتل نہیں کرتے اور نہ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یہ کام جو کوئی کرے گا وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا۔ قیامت کے دن اس کا عذاب دو گنا کر دیا جائے گا اور وہ اس میں ہمیشہ ذلت کے ساتھ پڑا رہے گا۔ الّا یہ کہ کوئی (ان گناہوں کے بعد) توبہ کر چکا ہو اور ایمان لا کر عمل صالح کرنے لگا ہو تو ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں سے بدل دے گا' اور وہ بڑا غفور و رحیم ہے۔''

درحقیقت تجدید ایمان' توبہ اور تجدید عہد ہم معنی الفاظ ہیں (۱)۔ بہرحال آج بھی مرتبۂ صدّیقیت تک پہنچنے کا راستہ کھلا ہے۔ یہ جان لیجیے نبوت کا دروازہ بند ہے' پہلے بھی وہ وہبی تھی' کسبی نہیں تھی' لیکن اب تو اس کا دروازہ مستقلاً بند ہے' البتہ ''صِدّیقیّت'' اور ''شہادت'' کے مراتب کھلے ہیں۔ افتادِ طبع کے اعتبار سے انسان

ترقی کر کے ان مراتب عالیہ کی تحصیل کر سکتا ہے۔ اور صالحین کا درجہ تو base line کی حیثیت رکھتا ہے۔ تو ان دونوں آیات (الحدید:۱۸،۱۹) کے ربط سے واضح ہوا کہ جو لوگ اس مشکل گھاٹی کو عبور کر جائیں' یعنی مال کی محبت سے نجات حاصل کر لیں اور پھر ایمان کے زیور سے آراستہ ہوں تو اُن کے لیے مرتبۂ صدّیقیت یا مرتبۂ شہادت تک رسائی حاصل کرنے کا راستہ کھلا ہے۔

ولایت اور نبوت کا باہمی تعلق

اس سلسلے میں چند اور باتیں وضاحت طلب ہیں۔ ہمارے تصوف کے حلقوں میں عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ ''ولایت''، ''نبوت'' سے افضل ہے۔ ظاہر کے اعتبار سے یہ بات بالکل غلط ہے' البتہ اس کے اندر بھی حقیقت کا ایک عنصر ہے' اگرچہ اصطلاحات غلط استعمال ہو رہی ہیں۔ ان کے ہاں دو نسبتیں ''نسبتِ ولایت'' اور ''نسبت نبوت'' مستقلاً مذکور ہیں۔ دراصل مقام ''نبوت'' ولایت' خلت اور صدّیقیت سب سے بلندترین مقام ہے۔ لغوی اعتبار سے نبوت کی اصل یا تو ''نَبَأٌ'' ہے' جس سے ''نبی'' کا مفہوم ہے ''خبر دینے والا'' اور یا پھر ''نَبْوٌ'' ہے جس کے معنی بلندی کے ہیں۔ تو اس سے اُونچا کوئی مقام نہیں ہے۔ یہ بھی جان لینا چاہیے کہ رسالت' نبوت کے ساتھ منتھی ہے اور نبوت رسالت سے افضل ہے۔ عام طور پر ہمارا تصور یہ ہے کہ رسالت نبوت سے افضل ہے۔ میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ رسالت مقامِ نزول میں ہے اور نبوت مقامِ عروج میں ہے۔ اصل حیثیت مقامِ نبوت کی ہے' لیکن جب کسی نبی کو کسی معین جگہ پر بھیجا جاتا ہے تو اسے رسول بنا کر بھیجا جاتا ہے' جیسے حضرت لوطd کو سدوم اور عامورہ کی بستیوں کو خبردار کرنے کے لیے بھیجا گیا' حضرت ہودd کو قومِ عاد کی طرف بھیجا گیا' حضرت صالحd کو قومِ ثمود کی طرف بھیجا گیا' حضرت موسٰیd کو فرعون اور آلِ فرعون کی طرف معین کر کے بھیجا گیا۔ تو یہ رسالت دراصل ''مقامِ نزول'' ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ نبوت رسالت سے افضل ہے۔

نبوت کا رشتہ درحقیقت ولایت' خُلت اور صدّیقیت سے ہے۔ اور وہ کس اعتبار سے ہے' اسے جان لینا ضروری ہے۔ یہ بڑے اہم مضامین ہیں۔ یہ بات پوری اُمت کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ نبوت عام ہے اور رسالت خاص ہے۔ یعنی ہر رسول تو لازماً نبی ہے لیکن ہر نبی رسول نہیں ہے۔ انہی چیزوں کی وجہ سے یہ تصور ذہن میں قائم ہو گیا کہ رسالت نبوت سے افضل ہے۔ لیکن درحقیقت یہ افضل نہیں ہے' بلکہ ان میں خاص اور عام کی نسبت ہے۔ حضرت یوسفd نبی تھے' لیکن رسول نہیں تھے۔ انہوں نے نہ تو اپنے آپ کو ماننے کی دعوت دی اور نہ کوئی مطالبہ کیا کہ مجھ پر ایمان لاؤ۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہِ مصر کے خواب کی درست تعبیر بتائی' جس کی بنا پر وہ جیل سے رہا ہوئے' اور پھر انہوں نے اس قوم کو قحط سے بچنے کی تدبیر بتائی جو اُن پر آنے والا تھا تو شاہِ مصر نے آپؑ کو وزارتِ مالیات جیسا بڑا عہدہ پیش کیا' جسے آپؑ نے قبول کر لیا' لیکن بادشاہ تو بہرحال وہی شخص تھا۔ قرآن مجید سے اس کے ایمان کا ثبوت بھی نہیں ملتا' البتہ وہ نیک انسان تھا۔ جیل کے لوگوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ''صدّیق'' کہہ کر پکارا تھا کہ: ﴿یُوْسُفُ اَیُّھَا الصِّدِّیْقُ﴾ ''یوسف' اے صدّیق!''

نبی اپنی ذاتی شخصیت کے اندر ولایت کے درجے پر فائز ہوتا ہے۔ اور جب اس پر اللہ کی طرف سے وحی اترتی ہے تو اسے نبوت سے سرفراز کر دیا جاتا ہے۔ ہمارے آج کل کے قلندر قسم کے لوگوں سے قطع نظر' جو شخص واقعتاً اللہ کا دوست' خلیل' وفادار اور مخلص ہے' اس پر اگر وحی آ جائے تو وہ نبی ہے' اور اگر وحی نہیں ہے تو وہ بس اللہ کا ولی اور برگزیدہ ہے۔ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ اور حضرت یوسف علیہ السلام میں یہی فرق ہے کہ حضرت یوسفؑ پر وحیٔ نبوت نازل ہوئی۔ ورنہ شخصیت کے اجزائے ترکیبی جو عبدالقادر جیلانیؒ کے ہیں وہی حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہیں۔ نبی سیرت و کردار کے حوالے سے ایک مکمل انسان ہوتا ہے' وہ لوگوں کو حق کی طرف دعوت بھی دے رہا ہوتا ہے' لیکن وہ اللہ کی طرف سے اس طرح سے مامور ہو کر نہیں آیا ہوتا کہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کی عبادت کرو اور میری اطاعت قبول کرو۔ جبکہ رسول تو لوگوں سے جا کر کہتا تھا کہ اللہ کی بندگی کرو اور میرا حکم مانو' میری اطاعت کرو' مجھے ماننا پڑے گا! سورۃ الشعراء

میں تمام رسولوں کی یہی دعوت نقل ہوئی ہے کہ: ﴿اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿﴾ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ ﴿﴾﴾ ''یقیناً میں تمہاری طرف ایک رسولِ امین (مبعوث ہوا) ہوں' پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو!'' تو یہ رسالت ہے۔

نبوت اور رسالت کا فرق

نبوت اور رسالت کا فرق Simultaneous Contrast کے اعتبار سے حضرت یحییٰ اور عیسیٰ (علیہما السلام) کے تذکرہ میں بہت نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ حضرات یحییٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کا دَور ایک ہی ہے۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام صرف نبی تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام رسول تھے۔ دو سورتوں سورۂ مریم اور سورۂ آل عمران میں اِن دونوں حضرات کا تقابل وارد ہوا ہے۔ سورۂ آل عمران میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی مدح اور ان کی شخصیت اور سیرت و کردار کے بارے میں بہت سے تاریخی کلمات کے بعد آخر میں یہ بات کہی گئی: ﴿وَنَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ﴾ ''وہ نبی ہے صالحین میں سے''۔ نوٹ کیجیے مرتبۂ صالحیت base line ہے اور انسان اسی سے عروج حاصل کرتے ہوئے نبوت تک پہنچتا ہے۔ جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے: ﴿وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ﴾ ''اور وہ رسول تھے بنی اسرائیل کی طرف''۔ یہی وجہ ہے کہ چونکہ نبی قتل بھی ہو سکتا ہے اس لیے حضرت یحییٰ علیہ السلام قتل کر دیے گئے۔ بادشاہِ وقت نے ایک رقاصہ کی فرمائش پر جلاد کے ذریعے آپؑ کا سر قلم کروایا اور طشت میں رکھ کر اُس رقاصہ کو پیش کر دیا۔ قرآن کریم آپؑ کے سیرت و کردار کا ذکر ان الفاظ میں کر رہا ہے:

﴿یٰیَحْیٰی خُذِ الْکِتٰبَ بِقُوَّۃٍ ط وَّاٰتَیْنٰہُ الْحُکْمَ صَبِیًّا ﴿۱۲﴾ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَکٰوۃً ط وَّکَانَ تَقِیًّا ﴿۱۳﴾ وَّبَرًّا بِوَالِدَیْہِ وَلَمْ یَکُنْ جَبَّارًا عَصِیًّا ﴿۱۴﴾﴾ (مریم)

''اے یحییٰ! کتابِ الٰہی کو مضبوطی سے تھام لے۔ ہم نے اسے بچپن ہی میں حکم سے نوازا' اور اپنی طرف سے اس کو نرم دلی اور پاکیزگی عطا کی' اور وہ بڑا پرہیزگار اور والدین کا حق شناس تھا' اور وہ جبار نہ تھا اور نہ نافرمان۔''

دیکھئے قرآن میں آپؑ کی یہ عظمت بیان ہو رہی ہے' لیکن دنیا میں یہ حال سامنے آ رہا ہے کہ ایک آبرو باختہ عورت کی فرمائش پر قتل کر دیے گئے۔ دوسری طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام چونکہ اللہ کے رسول تھے' اللہ کی طرف سے مقرر کردہ تھے لہٰذا قتل نہیں کیے گئے' اس لیے کہ رسول قتل نہیں کیا جا سکتا۔

ان دونوں مراتب ''نبوت و رسالت'' کو ایک مثال سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ ہمارے یہاں CSP ایک کاڈر (cadre) ہے۔ وہ CSP اگر کہیں جا کر ڈپٹی کمشنر لگ گیا ہے تو یہ اس کی تقرری (appointment) ہے۔ اسی طرح جب کوئی صرف نبی ہے تو گویا نبی کی حیثیت سے اس کا ایک کاڈر معین ہو گیا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے بہت سے CSP حضرات کی تقرری نہیں ہو پاتی۔ جو شخص سرکاری یونیفارم میں نہیں ہے اس کے خلاف اقدام عام سی بات شمار ہوتی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص فوجی یونیفارم میں ملبوس ہے تو گویا وہ حکومت کا نمائندہ ہے اور اس کے خلاف اقدام کرنا حکومت کو چیلنج کرنا ہے۔ بعینہٖ جب نبی مامور من اللہ ہو کر کسی قوم کی طرف بھیج دیے جاتے تھے تو وہ اللہ کی نمائندگی کر رہے ہوتے تھے اور ان کو قتل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا رسولوں کے بارے میں یہ وعدہ ہے: ﴿کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ﴾ (المجادلہ:۲۱) ''اللہ نے یہ لکھا ہوا ہے (طے کیا ہوا ہے) کہ میں اور میرے رسول غالب آ کر رہیں گے''۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے جب اللہ تعالیٰ سے فریاد کی تھی: ﴿اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ﴾ ''(پروردگار!) میں تو مغلوب ہوا جا رہا ہوں' پس میری مدد کیجیے!'' ان سے انتقام لیجیے! تو اللہ تعالیٰ نے ان کی قوم کو رہتی دنیا تک کے لیے نشانِ عبرت بنا دیا۔ اس لیے کہ رسول کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرت اور فتح یابی لازم ہے۔ اور اگر قوم نے بحیثیت مجموعی رسول کی دعوت کو ردّ کر دیا ہو تو قوم کا ہلاک کیا جانا لازم ہے۔ جیسے قوم نوحؑ' قوم لوطؑ' قوم صالحؑ' قوم شعیبؑ اور آلِ فرعون

انکارِ رسالت کی پاداش میں ہلاک کر دیے گئے' بلکہ صفحۂ ہستی سے مٹا دیے گئے۔ لیکن نبی کے انکار کے جرم میں دنیا میں ہلاکت لازم نہیں ہے' اس کا حساب کتاب آخرت میں جا کر ہوگا' اس لیے کہ اللہ کی طرف سے اس کی تقرری نہیں ہوئی۔ وہ تو یوں سمجھئے کہ ایک ولی اللہ ہے جس کے پاس اللہ کی طرف سے وحی آ رہی ہے۔ تو درحقیقت نبوت و رسالت کا یہ فرق ہے اور اس کو سمجھنے ہی سے سارے عقدے حل ہوتے ہیں۔

حضرات ابراہیم اور ادریس علیہما السلام کی شخصیات کے مطالعے سے بھی اس عقدے کو حل کرنے میں راہ نمائی ملتی ہے۔ حضرت ادریس علیہ السلام کے تفصیلی حالات تو ہم نہیں جانتے' قرآن مجید میں اُن کا بس اتنا تذکرہ ہے کہ: ﴿وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا﴾ ''اور ہم نے انہیں بھی بہت اونچا مقام و مرتبہ عطا فرمایا''۔ یہ غالباً حضرت نوح اور حضرت آدم علیہما السلام کے مابین کی شخصیت ہیں۔ جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تفصیلی حالات ہمیں معلوم ہیں۔ آپؑ سلیم الفطرت انسان تھے۔ شروع ہی سے سوچ بچار اور غور و فکر کی خو تھی۔ وہ سوچتے تھے کہ ان سورج' چاند اور ستاروں کا کیا مقام ہے جن کو پوجا جا رہا ہے! مظاہر فطرت اور ان کی تخلیق پر غور و فکر کرتے کرتے وہ توحید تک پہنچ گئے اور بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا: ﴿اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ﴾ ''میں نے یکسو ہو کر اپنا رُخ اُس ہستی کی طرف کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا اور (اے پروردگار!) میں شرک کرنے والوں میں نہیں ہوں''۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت ہے۔ اسی لیے ان کو کہا گیا: ﴿صِدِّیْقًا نَّبِیًّا﴾ یعنی آپ صدّیق نبی تھے۔ آپ نبوت عطا ہونے سے پہلے مقامِ صدّیقیت پر فائز ہیں' جیسے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھنے والے صدّیق کہہ رہے ہیں۔ ﴿یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ﴾۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صفتِ شہید سے متصف تھے۔ آپؑ بہت قوی الجثہ انسان تھے۔ ان کی طاقت کی کیفیت یہ تھی کہ قبطی کو بس ایک تھپڑ یا گھونسا رسید کر کے اس کی جان نکال دی۔ قرآن مجید میں اُن کے بارے میں سوچ بچار کی کوئی روداد نہیں آئی۔ وہ تورات کے وقت بیوی بچوں سمیت وطن واپس آ رہے تھے' جبکہ شدید سردی اور اندھیرا تھا' دُور سے کہیں آگ نظر آئی' خیال گزرا کہ شاید کوئی کٹیا ہے جہاں سے راستہ بھی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ گھر والوں سے فرمایا کہ تم یہاں ٹھہرو' میں وہاں سے آگ کی چنگاری لے کر آتا ہوں تاکہ تم لوگ آگ تاپ سکو۔ (قرآن مجید میں ''بِشِهَابٍ قَبَسٍ'' یا ''جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ'' کے الفاظ ہیں) لیکن وہاں اللہ تعالیٰ نے نبوت سونپ دی۔ گویا گئے تھے آگ لینے کو' مل گئی نبوت۔ جبکہ کہاں محمد رسول اللہ ﷺ کا معاملہ ہے کہ آپؐ غارِ حرا کے اندر جا کر بیٹھتے اور کئی کئی دن متواتر غور و فکر کرتے۔ روایات میں الفاظ ملتے ہیں: ''كَانَ صِفَةُ تَعَبُّدِهٖ فِیْ غَارِ حِرَاءَ التَّفَكُّرُ وَالْاِعْتِبَارُ'' ''غارِ حراء میں آپ ﷺ کی بندگی غور و فکر اور عبرت حاصل کرنا تھی''۔ ان دونوں شخصیات کی سیرت کے مطالعہ سے ان کے مابین فرق نمایاں ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں قرآن مجید میں فرمایا گیا: ﴿رَسُوْلًا نَّبِیًّا﴾ ''آپ رسول نبی تھے''۔ یہاں رسول ''شہید'' کے معنی میں ہے۔ ان دونوں الفاظ (رسالت اور شہادت) میں بڑی گہری مناسبت ہے۔ آپ علیہ السلام مزاجاً شہداء میں سے ہیں اور شہادت سے ہو کر نبوت تک پہنچے ہیں' یعنی صالحیت و شہادت سے ہو کر رسالت اور پھر نبوت۔ اسی لیے آپؑ کو ''رَسُوْلًا نَّبِیًّا'' کہا گیا ہے۔

یہی معاملہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا بھی ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شخصیت کے بارے میں بھی کتبِ سیرت میں وہی واقعات ملتے ہیں جو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ہیں۔ دو مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام فلسطین سے چل کر اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے ملنے آئے لیکن آپؑ شکار کے لیے نکلے ہوئے تھے۔ اُن کے گھر میں دو دن مقیم رہنے کے باوجود حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اُن سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بیوی نے ان کے بارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کچھ شکوہ کیا کہ ہمارے حالات اچھے نہیں ہیں' بڑی تنگی ہے'

تو آپؑ جاتے ہوئے کہہ گئے کہ جب میرے بیٹے آئیں تو ان سے کہہ دینا گھر کی چوکھٹ بدل دیں۔ (یعنی وہ بیوی کہ جو شاکی ہے وہ اس لائق نہیں ہے کہ تیرے گھر میں رہے) وہ واپس آئے تو انہیں بیوی نے پیغام دیا اور آپؑ نے اپنے والد محترم کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے بیوی کو طلاق دے دی۔ تو حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت اور حضرت اسماعیلؑ کی شخصیت کے مابین یہی نمایاں فرق ہے۔ اس لیے انہیں ﴿رَسُوْلًا نَّبِيًّا﴾ کہا گیا ہے۔

قرآن مجید میں دو رسولوں کے لیے ﴿صِدِّيْقًا نَّبِيًّا﴾ آیا ہے اور دو کے لیے ﴿رَسُوْلًا نَّبِيًّا﴾ لیکن ہمارے مفسرین کی بے توجہی کا عالم یہ ہے کہ کسی نے بھی ان مقامات پر تدبر کی زحمت گوارا نہیں کی۔ میں نے عہد حاضر کے ایک بہت بڑے مفسر سے سوال کیا کہ قرآن مجید میں دو رسولوں کے بارے میں ''صِدِّيْقًا نَّبِيًّا'' کے الفاظ آئے ہیں اور دو کے بارے میں ''رَسُوْلًا نَّبِيًّا'' کے' اس میں کیا حکمت ہے؟ تو انہوں نے پوچھا واقعی کہیں ''رَسُوْلًا نَّبِيًّا'' آیا ہے؟ میں نے سورۂ مریم کی آیات پڑھ کر سنائیں کہ یہ وہ مقامات ہیں۔ اس کا سبب دراصل قلتِ تدبر ہے کہ آدمی بغیر توجہ کیے گزر جاتا ہے کہ 'رسول' کے بعد 'نبی' کا کیا مطلب ہو سکتا ہے' جبکہ رسالت تو نبوت کے بعد ملتی ہے۔ تو یہاں درحقیقت رسول شہید کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مختلف شخصیتوں کے مزاج مختلف ہوتے ہیں۔ ہماری اُمت میں ایک طرف حضرات ابوبکر و عثمان رضی اللہ عنہما ہیں جو صحابہ کرام ؓ میں سب سے چوٹی کے صدّیقین ہیں' دوسری طرف حضرات حمزہ اور عمر رضی اللہ عنہما ہیں جو صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں شہداء کی بہت نمایاں مثال ہیں۔ جبکہ انبیاء و رسل میں سے حضرات ابراہیم اور ادریس علیہما السلام ''صِدِّيْقًا نَّبِيًّا'' ہیں اور موسیٰ اور اسماعیل علیہما السلام ''رَسُوْلًا نَّبِيًّا'' ہیں۔ یہ وہ حقائق ہیں جن کی قدرے وضاحت ضروری تھی۔

مقامِ صدّیقیت کے اجزائے ترکیبی

مقام صدّیقیت کے اجزائے ترکیبی کی قدرے وضاحت مفید مطلب ہے۔ مقامِ صدّیقیت کے یہ اجزائے ترکیبی سورۃ اللیل میں Simultaneous Contrast کے اعتبار سے بیان ہوئے ہیں۔ (1) اس سورۂ مبارکہ میں تین اوصافِ حمیدہ مقام صدّیقیت پر فائز شخصیت کے بیان ہوئے ہیں اور تین ہی اوصافِ رذیلہ اس کے برعکس شخصیت کے بیان ہوئے ہیں۔ فرمایا:

﴿وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىA وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰىB وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰىX اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰىΔ﴾

''گواہ ہے رات جبکہ وہ ڈھانپ لیتی ہے' اور (گواہ ہے) دن جبکہ وہ روشن ہو جاتا ہے' اور وہ نر اور مادہ جو اللہ نے تخلیق کیا۔ یقیناً (اے لوگو!) تمہاری کوششیں بھی مختلف قسم کی ہیں''۔

پہلے تو اللہ تعالیٰ نے قسموں کی صورت میں استشہاد کیا ہے کہ اے لوگو! جیسے رات کی تاریکی اور دن کی روشنی میں اور نر اور مادہ (اور مرد و عورت) میں فرق و تفاوت ہے' اسی طرح تمہاری کوششوں اور سعی و جہد میں اور تمہارے انجام میں بھی فرق و تفاوت ہے۔ آگے وہ صفات بیان کی جا رہی ہیں:

﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰىE وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰىΦ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰىΓ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰىH وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰىI فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰىθ﴾

''تو جس نے (اللہ کی راہ میں) مال دیا اور (اللہ کی نافرمانی سے) پرہیز کیا' اور بھلائی کو سچ مانا' اس کو ہم آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے۔ اور جس نے بخل کیا اور (اپنے خدا سے) بے نیازی برتی اور بھلائی کو جھٹلایا' اس کو ہم سخت راستے کے لیے سہولت دیں گے''۔

صدّیق کا پہلا وصف یہ ہے کہ اس میں عطا اور جُود و سخاوت ہوتی ہے۔ وہ لوگوں کی مشکلات کو دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے اور ان کی مدد کرتا ہے' بھوکوں کو کھانا کھلاتا ہے۔ دوسرا وصف یہ ہے کہ اس کے اندر تقویٰ ہوتا ہے۔ وہ کسی کا دل نہیں دکھانا چاہتا' کسی کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا' کسی پر دست درازی اور تعدی نہیں کرنا چاہتا۔ اور تیسرا وصف یہ کہ وہ ہر اچھی بات کی تصدیق کے لیے ہر وقت تیار

رہتا ہے۔اس کے اندر تعصب نہیں ہوتا' عصبیت' ضد اور ہٹ دھرمی نہیں ہوتی۔ اس کے سامنے جب کوئی ایسی بات آتی ہے کہ اس کا دل گواہی دے کہ بات صحیح ہے تو اسے فوراً تسلیم کر لیتا ہے۔وہ یہ نہیں سوچتا کہ دوسرے کی بات مان لینے سے اس کی جیت اور میری ہار ہو جائے گی۔ ہونا بھی یہی چاہیے کہ صحیح اور حق بات جس کی صحت پر دل بھی گواہی دے رہا ہو' فوراً قبول کر لی جائے۔تو جس شخص میں یہ تین اوصاف جمع ہو جائیں تو وہ مقام صدّیقیت پر فائز ہے۔جیسے اقبال نے کہا ع ''یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان''۔امام رازیؒ نے اس سورۃ مبارکہ کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ سورتِ صدّیق اکبر ہے' یعنی حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ کی سورت ہے۔اس لیے کہ اِس اُمت میں سب سے زیادہ متقی شخص وہی ہیں' جن میں یہ تینوں اوصاف بتمام وکمال جمع ہو گئے تھے۔

اس کے برعکس جو شخص اِن تینوں اوصاف سے خالی ہو وہ بدترین مخلوق ہے۔اُس میں صفتِ عطا کے برعکس بخل' اور تقویٰ کے برعکس اللہ سے استغناء اور بے پروائی ہوتی ہے۔اسے حلال وحرام کی فکر ہی نہیں ہوتی۔اس کا جہاں ہاتھ پڑتا ہے' حلال وحرام سے بے نیاز ہو کر' اسے حاصل کر لیتا ہے۔جس کا چاہتا ہے استحصال اور حق تلفی کرتا ہے' جس پر چاہتا ہے ظلم کرتا ہے' جس کا چاہتا ہے دل دکھاتا ہے اور جس کی عزت پر چاہے حملہ کرتا ہے۔یہ استغناء اور بے نیازی ہے۔تیسرے درجے میں وہ صحیح وعمدہ بات اور سچائی وصداقت کی تکذیب کرتا ہے۔اس شخص کے بارے میں ارشادِ الٰہی ہے: ﴿فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْعُسْرٰی﴾ ''تو ہم رفتہ رفتہ اسے العُسریٰ (تنگی) تک پہنچا دیں گے''۔ یعنی جہنم تک' جو بڑی تنگی اور سختی کی جگہ ہے۔

صدّیقۂ کبریٰ کون؟

یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ چونکہ نبوت عورتوں کو نہیں دی گئی ـــــ اس لیے کہ یہ بہت بھاری ذمہ داری ہے ـــــ لہٰذا خواتین کے لیے سب سے اونچا مقام صدّیقیت ہے۔حضرت مریم سلامٌ علیہا کے بارے میں قرآن کہتا ہے: ﴿اُمُّہٗ صِدِّیْقَۃٌ﴾ ''ان (حضرت عیسٰیؑ) کی والدہ (حضرت مریمؑ) صِدّیقہ تھیں''۔

سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا اِس اُمت میں بھی کوئی صدّیقہ ہے؟ دیکھئے عام طور پر تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ لفظ ''صِدّیقہ'' استعمال ہوتا ہے' لیکن درحقیقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا عمر کے اعتبار سے دوسری نسل سے تعلق رکھتی ہیں' اگرچہ آپؓ حضور ﷺ کی زوجۂ محترمہ ہونے کی حیثیت سے اُمّ المومنین ہیں۔ جیسے حضرت علی اور ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم کے مراتب میں فرق وتفاوت ہے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حضرات ابوبکر وعمر وعثمان رضوان اللہ علیہم سے تقابل کرنا درحقیقت قیاس مع الفارق کے مترادف ہے۔ان کی تو نوعیت ہی مختلف ہے۔ حضرات ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم حضور ﷺ کے تقریباً ہم عمر لوگوں میں سے ہیں۔حضرت ابوبکر آپ ﷺ سے دو اڑھائی برس چھوٹے ہیں' حضرت عمر چھ برس اور حضرت عثمان پانچ برس چھوٹے ہیں۔یہ تو آپؐ کے برابر کے ہیں اور آپ ﷺ کے ساتھی اور دست و بازو ہیں۔کسی قبیلے یا قوم کے اندر ایسے لوگ ''مَلَأٌ'' کہلاتے ہیں اور پٹھانوں کے ہاں ''مشران'' کہلاتے ہیں۔جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تو دوسری نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور حضور ﷺ کے مقابلے عمر کا بہت فرق و تفاوت ہے' اگرچہ اپنی شخصیت کے اعتبار سے بہت اعلیٰ مرتبے پر فائز ہیں۔ حضور ﷺ کے بعد صحابہ کرام میں ambivert حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شخصیت ہے۔ تو جامعیت کے اعتبار سے اُن کا مقام اور ہے' لیکن کمیت کے اعتبار سے حضرت علیؓ خلفاء ثلاثہ کے آس پاس بھی نہیں آتے' اگرچہ ترتیب میں چوتھے ہیں۔تو بالکل اسی طرح کا معاملہ حضرت عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا کا ہے۔ان کا مقام بہت بلند ہے' فقہاء صحابہ میں سے ہیں' حضور ﷺ کی محبوب زوجۂ محترمہ ہیں' لیکن صدّیقیتِ کبریٰ کے مقام پر حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا فائز ہیں۔اسی لیے ان کے نام کے ساتھ لفظ ''کبریٰ'' لگا ہوا ہے۔جس طرح حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ

عنہ نے حضورﷺ کے قدموں میں اپنی ساری دولت نچھاور کر دی اسی طرح حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے بھی اپنی پوری دولت حضورﷺ کے قدموں میں ڈال دی کہ جس طرح چاہیں اور جہاں چاہیں استعمال کیجیے۔ حضور اکرمﷺ کی تصدیق میں جیسے حضرت ابوبکرؓ نے ایک لحظہ کا توقف بھی نہیں کیا ایسے ہی حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے بھی لحظہ بھر کے توقف کے بغیر آپؐ کی تصدیق کی۔ بلکہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ حضورﷺ پر پہلے ایمان لانے والے حضرت ابوبکرؓ ہیں یا حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ! میں تو دعوے سے کہتا ہوں کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ ہیں۔ اس لیے کہ غارِ حرا سے اتر کر حضورﷺ پر جو خوف کی کیفیت تھی اور لرزہ طاری تھا' تو یہ پہلا تجربہ آپؐ نے اپنی زوجہ محترمہ کو ہی بتایا ہے۔ کیسے ممکن ہے کہ آپ نے جا کر پہلے اپنے کسی دوست یا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بتایا ہو۔ بلکہ آپؐ زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ کہتے ہوئے حضرت خدیجۃ الکبریٰ k کے پاس تشریف لائے اور انہوں نے تسلی دی کہ نہیں' اللہ آپ کو ضائع نہیں کرے گا۔ تو درحقیقت اُمت کی عورتوں میں سب سے اونچا مقام حضرت خدیجۃ الکبریٰ k کا ہے۔ حضرت ابوبکر صدّیق ؓ کی ہم پلہ شخصیت وہی ہیں۔

سورۃ الحدید کے چوتھے حصے میں جو سلوکِ قرآنی بیان ہوا ہے' اس کی وضاحت کے لیے یہ ڈائیگرام ملاحظہ کیجیے۔ صالحین' صدّیقین' شہداء اور نبوت و رسالت جیسی اصطلاحات پر اگرچہ کافی گفتگو ہو چکی ہے' لیکن میں چاہتا ہوں کہ بات مزید واضح ہو جائے' اس لیے کہ یہ وہ مضامین ہیں کہ لوگوں نے شاذ ہی ان سے بحث کی ہے: (ڈایاگرام اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

اس چارٹ کو سمجھنے کے لیے نیچے سے اوپر چلیے۔ آیت نمبر۱۶ ہے:

﴿ اَلَمۡ یَاۡنِ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ تَخۡشَعَ قُلُوۡبُہُمۡ لِذِکۡرِ اللّٰہِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الۡحَقِّ ۙ

﴿وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ١٦﴾

اس آیت کا حاصل ہے: ''نسلی' روایتی' غافل اور بے عمل مسلمانوں کو تنبیہہ اور ملامت ۔ خاص طور پر سابقہ اُمتِ مسلمہ کے انجام سے سبق حاصل کرنے کی ترغیب''۔

پھر اگر اپنے باطن میں جھانکو اور محسوس کرو کہ حقیقتِ ایمان تو ہمیں حاصل نہیں تو مایوس نہ ہو جاؤ۔ ﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ١٧﴾ گویا اس آیت کا حاصل ہے: ''اصلاحِ حال اور آمادۂ عمل ہونے کی ترغیب اور حوصلہ افزائی''۔ اس میں حوصلہ افزائی بھی ہے' ترغیب بھی ہے' تشویق بھی ہے کہ کمر ہمت کسو' ارادہ کرو!

اس کا جو نتیجہ ہے وہ اب تیسری لائن میں ہے: ''اصلاحِ حال کا ارادہ اور عمل کا عزمِ مصمم''۔ ارادہ کے بعد بریکٹ میں لفظ ''مُرِید'' لکھا ہے۔ اصل میں یہ اَرَادَ' یُرِیْدُ' اِرَادَۃً (باب افعال) سے اسم الفاعل ہے' یعنی ''ارادہ کر لینے والا''۔ گویا کہ ان دونوں آیات (۱۶'۱۷) کا حاصل یہ ہے کہ ایک شخص کے اندر ارادہ اور عمل کا عزمِ مصمم پیدا ہو جائے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ جو حضرات بھی اس حلقۂ درس میں شرکت فرما رہے ہیں اُن کو اللہ تعالیٰ نے اس کیفیت تک پہنچا دیا ہو اور وہ ایک عزمِ مصمم کر لیں کہ دین کے جو بھی تقاضے اور مطالبات ہیں وہ ان کو ادا کریں گے۔

اب اس سے اوپر آیئے! آیت نمبر ۱۸ کے الفاظ ہیں: ﴿اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ١٨﴾ اس آیت کا حاصل ہے: ''کثرتِ صدقہ وخیرات اور انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعے دل سے دنیا اور مال کی محبت کا ازالہ''۔ یہی نجاست ہے' اور اس کو اگر دور نہیں کریں گے تو قربِ الٰہی کی منازل طے نہیں ہو سکیں گی۔ اسی کو میں تعبیر کرتا ہوں کہ یہ بریک ہے' اگر یہ نہیں کھلے گا تو آگے ترقی اور پیش رفت نہیں ہو سکتی۔

جو لوگ اس پر کاربند ہو جائیں وہ گویا زمرۂ ''صالحین'' میں شامل ہو گئے۔ یہ صالحین وہ لفظ ہے کہ جو سورۃ النساء کی آیت ۶۹ میں گویا base line کا کام دیتا ہے:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰۗىِٕكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاۗءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰۗىِٕكَ رَفِيْقًا ۝﴾

یعنی جو شخص اللہ اور رسول کی اطاعت پر کاربند ہو گیا اسے معنوی معیت اور رفاقت حاصل ہو جائے گی ان کی جن پر اللہ کا انعام ہوا ہے' یعنی انبیاء' صدّیقین' شہداء اور صالحین۔ اور کیسے اچھے ہیں یہ رفیق جو کسی کو میسر آ ئیں! تو جو شخص ارادہ کر چکا ہو اور ارادہ کر کے اپنی کشتِ قلب میں انفاق اور صدقہ وخیرات کا ہل چلا لے وہ صالحین میں شامل ہو جائے گا۔ اگر ارادہ کرنے کے باوجود معطل رہ گیا' عملاً کوئی پیش قدمی نہیں کی تو اُس کا وہ مقام نہیں ہے۔ اسی لیے چوتھی لائن میں علیحدہ سے واضح کیا ہے کہ صالحین وہ ہیں کہ جو کثرت صدقہ وخیرات اور انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعے دل سے دنیا اور مال کی محبت کا ازالہ کریں۔

اب اس سے اوپر دو شاخیں بنائی گئی ہیں۔ یہ وہ دو اَقسام ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی عظیم اکثریت کو پیدا کیا ہے۔ تیسری قسم یعنی Ambiverts بہت شاذ ہوتے ہیں۔ لوگ عام طور پر یا تو بیرون بین (Extroverts) ہوتے ہیں یا دروں بین (Introverts)۔ داہنی طرف Introverts ہیں: ''غور وفکر اور سوچ و بچار کے عادی' اور زندہ اخلاقی حس کے حامل لوگ''۔ ان کے اندر سلامتیٔ فکر بھی ہے' سلامتیٔ عقل بھی ہے اور سلامتیٔ فطرت بھی ہے۔ ان کی اخلاقی حس بھی زندہ ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نیکی اور بدی کا امتیاز تو فطرتِ انسانی میں ودیعت کر دیا ہے۔ ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝﴾ تو یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کو مرتبۂ ''صِدّیقیت'' تک رسائی حاصل ہو جائے گی۔ یہ انبیاء سے نیچے' سب سے اونچا مقام ہے جس تک انسان رسائی حاصل کر سکتا ہے۔

دوسری طرف دوسرے قسم کے لوگ ہیں: ''بھاگ دوڑ اور سیر وشکار کے عادی لوگ''۔ یہ Extroverts ہیں۔ انبیاء کرامؑ میں سے آپ حضرت موسیٰ اور حضرت

اسماعیل (علیہما الصلوٰۃ والسلام) کو ذہن میں رکھیے اور صحابۂ کرام میں سے حضرات عمر اور حمزہ (رضی اللہ عنہما) کو سامنے رکھئے۔ ان کا یہی مزاج تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو پہلوان قسم کے آدمی تھے، اور انہیں غور وفکر اور سوچ بچار سے طبعی مناسبت بھی نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آبائی حمیتیں اور آبائی عصبیتیں ان کے دل میں بڑی گہری اتری ہوئی تھیں۔ اسی لیے مسلمانوں سے دشمنی تھی، حضور ﷺ سے بھی سخت ناراضگی تھی، یہاں تک کہ انتہائی فیصلہ کر لیا تھا کہ اب تو میں چراغِ نبوت کو گل کر کے ہی گھر واپس آؤں گا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ حالانکہ قرابت میں حضور ﷺ سے قریب ترین ہیں، نہایت محبت بھی کرتے ہیں، عزیز رکھتے ہیں، محبت ہی کے جوش مارنے کی وجہ سے تو ایمان لائے ہیں، لیکن آنحضور ﷺ کی دعوت کو چھ برس بیت گئے اور انہیں اپنے سیر وشکار سے فرصت ہی نہیں ہے۔ ادھر توجہ ہی نہیں ہے۔ تو یہ ہیں Extroverts کی مثالیں۔

دوسری طرف Introverts کی مثالیں دیکھئے۔ جیسے کہ میں نے عرض کیا، قرآن مجید میں حضرت ابراہیم d کا معاملہ غور وفکر اور سوچ بچار کے حوالے سے ممتاز نظر آتا ہے: ﴿وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ آسمانوں اور زمین پر غور وفکر ہو رہا ہے، ہستیٔ باری تعالیٰ کے بارے میں سوچ بچار ہے۔ اور پھر سلیم الفطرت ہیں۔ اس ضمن میں دوسری جو مثال قرآن مجید میں نمایاں ہے وہ حضرت ادریس علیہ السلام کی ہے۔ جبکہ صحابۂ کرام میں سے حضرت ابوبکر الصدیق اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہما اور خواتین میں سے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، یہ وہ لوگ ہیں جو صدّیقیت کے مزاج کے حامل ہیں۔ چنانچہ مرتبہ ’’صالحیت‘‘ کے بعد جو ارتقاء ہوگا، انسان سلوک کی منازل میں آگے بڑھے گا، ترقی ہوگی تو افتادِ طبع کے اعتبار سے یہ دو لائنیں علیحدہ ہو جائیں گی۔ یہ نسبت واضح ہوگئی اس آیت کی طرف ﴿اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ P﴾

اس کے بعد اگرچہ یہاں لفظ ’’ثُمَّ‘‘ موجود نہیں ہے، لیکن مَیں ’’القرآنُ یفسّر بعضُہ بعضًا‘‘ کے اصول پر سورۃ البلد کے حوالے سے بتا چکا ہوں کہ آیت ۱۸ اور آیت ۱۹ کے درمیان ’’ثُمَّ‘‘ کو محذوف سمجھئے، مقدر مانیے! ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ﴾ یعنی جب یہ کام (صدقہ وخیرات اور انفاق فی سبیل اللہ) کر کے لوگ آگے بڑھیں گے، ان کے دل سے دنیا اور مال کی محبت کا ازالہ ہو جائے گا، بریک کھل جائے گا، ترقی ہوگی، ارتقاء ہوگا، جو اعلیٰ معیارات اور مقامات ہیں، ان تک رسائی ہوگی تو انسان یا صدّیقین کے مقام تک پہنچ سکے گا یا شہداء کے مقام تک۔

اس سے اوپر کا جو معاملہ ہے وہ میں نے مزید واضح کیا ہے کہ نبوت اوپر ہے، رسالت نیچے ہے، کیونکہ میں ان لوگوں سے متفق ہوں جو یہ سمجھتے ہیں کہ نبوت کا رتبہ رسالت سے اونچا ہے، بایں معنی کہ نبوت درحقیقت مقامِ عروج میں اور رسالت مقامِ نزول میں ہے۔ نبوت کا رُخ اللہ کی طرف ہے اور رسالت کا رُخ بندوں کی طرف ہے۔ اس اعتبار سے میں نے نبوت کو رسالت سے اوپر رکھا ہے۔ لیکن اصل میں صدّیقیت کی اصطلاح رسالت ہی کے لفظ سے واضح ہوتی ہے۔ یعنی جیسے ہی رسول کی دعوت کسی صدّیق کا مزاج رکھنے والے شخص کے کان میں پہنچے گی وہ فوراً لبیک کہے گا، اسے کوئی دیر نہیں لگے گی، اس لیے کہ یہ اُس کی سلامتیٔ عقل اور سلامتیٔ فطرت کا تقاضا ہے۔ وہ خود پہلے سے گویا تیار ہے۔ میں تو اِس کی مثال دیا کرتا ہوں جیسے کوئی شخص وضو کر کے گھر میں بیٹھا ہوا اور اذان کی آواز آئے تو یقیناً وہ مسجد کا رُخ کرے گا۔ صدّیقین کی شخصیت میں بالکل اس طرح کی آمادگی پہلے سے موجود ہوتی ہے۔

دوسری قسم کے لوگوں یعنی شہداء کو اگرچہ قبولِ حق میں دیر تو لگ جاتی ہے، جیسے حضرات عمر اور حمزہ رضی اللہ عنہما کو بھی چھ سال لگ گئے، لیکن چونکہ وہ فعال اور طاقتور قسم کے لوگ تھے، ان کی ہیبت تھی، لہٰذا ان سے مسلمانوں کو تقویت حاصل ہوئی۔ حالانکہ اس سے پہلے صدّیقین ہی کی جماعت تھی جو حضور ﷺ پر ایمان لائی، لیکن شہداء اپنی فعالیت کی وجہ سے آگے نکل جاتے ہیں۔ اس لیے کہ اپنی شخصیت کے ایک خاص مزاج کے

اعتبار سے وہ قوی ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عمر اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما کے ایمان لانے کے بعد مسلمان دھڑلے کے ساتھ کھلم کھلا حرم میں نمازیں پڑھنے لگے۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم جب ہجرت کے لیے روانہ ہو رہے تھے تو چھپ کر نکلتے تھے کہ کسی کو خبر نہ ہو' خواہ مخواہ کوئی مزاحم ہوگا یا کسی اور طرح کی مشکل پیش آ جائے گی۔ لیکن حضرت عمرؓ کی شان یہ ہے کہ جب ہجرت کے لیے نکلے تو سب کے سامنے حرم میں آ کر دو رکعت نماز پڑھی اور اعلان کیا کہ میں ہجرت کر کے جا رہا ہوں اور جس کا ارادہ ہو کہ اس کی ماں اسے روئے وہ آ جائے اور میرا راستہ روک لے! یہ الفاظ کہہ کر ڈنکے کی چوٹ ہجرت کے لیے روانہ ہوئے ہیں۔ تو رسالت کا جو اصل منصب ہے یعنی دین کو قائم کرنے کی سعی و جدوجہد' اس میں یہ لوگ زیادہ نمایاں ہو جاتے ہیں اور آگے نکل جاتے ہیں ۔ چنانچہ حضرت حمزہؓ کی شجاعت غزوۂ بدر میں ظاہر ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں سننے میں نہیں آئے گا کہ کسی کے ساتھ اس طرح کا دوبدو مقابلہ ہوا ہو' اگرچہ وہ بات تو آتی ہے کہ آپؓ کے بیٹے عبدالرحمٰنؓ نے اسلام لانے کے بعد جب یہ کہا کہ ابا جان! آپ غزوۂ بدر میں میری زد میں آ گئے تھے' لیکن میں نے آپ کی رعایت کی' تو حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ بیٹے! تم نے یہ اس لیے کیا کہ تم باطل کے لیے جنگ کر رہے تھے' خدا کی قسم! اگر کہیں تم میری زد میں آ گئے ہوتے تو میں تمہیں کبھی نہ چھوڑتا۔ صدّیقیت کا مقام نبوت سے قریب تر ہوتا ہے۔ چنانچہ جو مقام و مرتبہ حضورﷺ کا ہے اس سے بالکل ملحق مقام و مرتبہ حضرت ابوبکر صدّیقؓ کا ہے۔ اس طرح اب سورۃ النساء کی آیت ۶۹ ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝﴾ آپ کے سامنے پورے طور پر واضح ہوگئی۔

البتہ اس ضمن میں دو باتیں ابھی اور سمجھ لیجیے! ایک یہ کہ میں نے dotted line کے ساتھ جو نسبت ظاہر کی ہے وہ ہے ''صِدِّيْقًا نَّبِيًّا'' اور ''رَسُوْلًا نَّبِيًّا''۔ قرآن حکیم میں مختلف رسولوں کے لیے یہ دونوں الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ انبیاء و رُسل کے انتخاب کے لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ (آل عمران) ''اللہ نے (اپنی رسالت کے لیے) پسند فرما لیا' آدمؑ کو اور نوحؑ کو اور آل ابراہیمؑ کو اور آلِ عمران کو' تمام دنیا والوں پر ترجیح دے کر''۔ رسالت اور نبوت کے لیے یہ انتخاب ظاہر ہے کہ انسانوں میں سے ہی ہوا ہے۔ اور انسانوں میں اس نے عام طور پر یہ دو مزاج بنائے ہیں' ایک وہ مزاج جس کی مناسبت صدّیقیت کے ساتھ ہے اور دوسرے وہ مزاج جس کی مناسبت شہادت کے ساتھ ہے۔ تو حضرت ابراہیم اور ادریس (علیہما الصلوٰۃ والسلام) دونوں کے بارے میں قرآن مجید میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝﴾ (مریم:۴۱ و۵۶) اور یہ نسبت مَیں نبوت کی طرف قائم کر رہا ہوں' رسالت کی طرف نہیں۔ رسول کی دعوت کے قبول کرنے میں صدّیقین اور شہداء میں فرق ہوگا۔ داعی کی حیثیت سے تو رسول سامنے آئے گا' لیکن داعی کا معاملہ رسالت کے ساتھ متعلق ہے۔ اور رسول کی دعوت کے ردّ عمل کے اعتبار سے فرق یہ ہوگا کہ صدّیق کو قبول کرنے میں دیر لگے گی ہی نہیں' وہ تو جیسے پہلے ہی سے منتظر تھے۔ جبکہ شہداء کو وقت لگے گا' دیر لگے گی۔ اس لیے کہ ان کی توجہ ہی ادھر نہیں ہے —— لیکن یہ کہ صدّیقیت اور شہادت کی نبوت کے ساتھ نسبت کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے جن انسانوں کو شرفِ نبوت کے لیے چنا ہے تو ظاہر بات ہے یا تو وہ صدّیقی مزاج کے حامل تھے یا شہیدی مزاج کے حامل تھے۔ تو دوسروں کو کہا گیا ﴿رَسُوْلًا نَّبِيًّا﴾ (مریم:۵۱ و۵۴) کیونکہ شہادت کی نسبت رسالت کے ساتھ زیادہ ہے۔ اسی لیے ڈائیگرام میں ''رَسُوْلًا نَّبِيًّا'' والی dotted line رسالت تک پہنچائی گئی ہے۔ اور پھر رسالت سے آگے نبوت کا مرتبہ ہے۔ گویا شہیدی مزاج کے حامل مرتبۂ رسالت سے ہو کر مرتبۂ نبوت پر فائز ہوئے' جبکہ صدّیقین براہِ راست نبوت سے سرفراز کیے گئے۔

ایک بات اور سمجھ لیجیے کہ جو بھی اوپر والے درجے پر فائز ہے اس میں نیچے والے

کے تمام اوصاف بتمام وکمال لازماً موجود ہیں۔ صدّیق کا اپنا مزاج تو وہ ہے جو میں بیان کر چکا ہوں‘ لیکن عزم وارادہ کے اعتبار سے اس کے اندر شہداء والی پوری شخصیت بھی موجود ہے۔ اس کا ظہور حضرت ابوبکرؓ کے دورِ خلافت میں ہوا ہے۔ ورنہ حضورﷺ کی حیاتِ طیبہ تک حضرت ابوبکرؓ کا جو مزاج سامنے تھا اس کے اعتبار سے آپ نہایت رقیق القلب اور نحیف الجثہ انسان تھے۔ وہ اس طرح کے انسان محسوس ہوتے ہی نہیں تھے جیسے بعد میں ظاہر ہوئے۔ جب حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ کے کندھوں پر خلافت کی ذمہ داری کا بوجھ آیا تو حالات نہایت critical اور مخدوش تھے۔ اتنی بڑی بغاوت برپا ہوگئی تھی کہ دارالاسلام دو شہروں تک محدود ہو گیا تھا۔ ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ کی کیفیت تھی۔ متعدد مدعیانِ نبوت کھڑے ہوگئے تھے اور لاکھوں آدمی ان کے ساتھ ہو گئے تھے۔ مسیلمہ کذاب کے ساتھ لاکھوں آدمی تھے۔ جنگ یمامہ میں کئی سو حفاظ شہید ہو گئے تھے۔ تبھی تو حضرت ابوبکر صدّیق h کو تشویش ہوئی کہ اگر اسی طرح حفاظ صحابہ کرام شہید ہوتے رہے تو کہیں قرآن مجید گم نہ ہو جائے‘ لہٰذا اسے کتابی شکل میں مرتب کر لینا چاہیے۔ دوسری طرف مانعین زکوٰۃ کا معاملہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر revolution کے بعد جو ایک counter revolution کا مرحلہ آیا کرتا ہے وہ انقلابِ محمدیؐ کے بعد بھی آیا۔ حضورﷺ کی حیاتِ طیبہ کے آخری دور میں انقلاب کی تکمیل ہوگئی۔ انقلاب کی تکمیل کے مرحلے پر مخالف قوتیں جب دیکھتی ہیں کہ اب ہم بے بس ہو چکے ہیں تو پھر وہ دبک جایا کرتی ہیں اور منتظر رہتی ہیں کہ پھر کوئی موقع آئے گا تو ہم کوئی اقدام کریں گے۔ چنانچہ باطل قوتیں اُس وقت دبک گئیں۔ اس کے بعد جیسے ہی حضورﷺ کا انتقال ہوا تو ان باطل قوتوں نے یک دم سر اُٹھایا۔ اُس وقت مسلمان صدمے اور غم سے نڈھال تھے اور ان کا مورال کچھ نہ کچھ کم ہو گیا تھا۔ اس وقت یکا یک فتنوں نے سر اٹھایا۔ ایک طرف مانعینِ زکوٰۃ کھڑے ہو گئے‘ دوسری طرف مدعیانِ نبوت اٹھ کھڑے ہوئے اور اسلامی ریاست تو یوں سمجھئے تقریباً مکہ اور مدینہ تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اُس وقت حضرت ابوبکر صدّیقؓ نے رسول اللہﷺ کی قائم کردہ اسلامی ریاست کو reclaim کیا ہے اور یہ کام فولادی عزم اور کوہ ہمالیہ جیسی عزیمت کے ساتھ کیا ہے۔ حضرت عمرؓ بھی مشورہ دے رہے ہیں کہ ذرا مصلحت کو پیش نظر رکھیے۔ آپ یہ جو پے بہ پے محاذ کھولتے جا رہے ہیں یہ قرین مصلحت نہیں۔ آپؓ نے جیشِ اُسامہؓ کو بھی نہیں روکا۔ لوگوں نے کہا کہ حضورﷺ کا انتقال ہو گیا ہے‘ اب یہ لشکر نہ بھیجا جائے۔ لیکن آپؓ نے فرمایا: جس لشکر کی تیاری محمد رسول اللہﷺ نے کی ہو مَیں اس کو کیسے روک دوں؟ چنانچہ جیشِ اسامہؓ روانہ کر دیا گیا۔ دوسری طرف جو مدعیانِ نبوت کھڑے ہو گئے ان کا ارتداد تو بالکل الم نشرح تھا‘ لہٰذا ان کے خلاف تو جنگ کرنی ہی تھی‘ اس میں تو کسی مشاورت کی ضرورت ہی نہیں تھی‘ لہٰذا اس کا محاذ بھی کھول دیا گیا۔

اس کے بعد جب مانعین زکوٰۃ کا مسئلہ سامنے آیا کہ نہ تو انہوں نے کسی نئی نبوت کا اقرار کیا اور نہ ارکانِ اسلام کا انکار کر رہے تھے۔ وہ نماز کا انکار بھی نہیں کر رہے تھے اور زکوٰۃ کا بھی انکار نہیں کر رہے تھے‘ بلکہ صرف یہ کہہ رہے تھے کہ ہم اپنی زکوٰۃ حکومت کو نہیں دیں گے‘ ہم اسے اپنے طور پر تقسیم کریں گے جس طرح چاہیں گے۔ حضرت عمرؓ نے مشورہ دیا تھا کہ آپ ان کے معاملے میں کچھ نرمی برتیں‘ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اُس وقت اُن کو بھی ڈانٹ پلائی کہ عمر! تم دورِ جاہلیت میں تو بہت سخت تھے‘ اسلام میں آ کر نرم ہو گئے ہو؟ خدا کی قسم! اگر یہ حضورﷺ کے زمانے میں زکوٰۃ کے اونٹوں کے ساتھ اُن کو باندھنے والی رسیاں بھی دیتے تھے تو اب اگر یہ اونٹ دینے کو تیار ہوں اور رسیاں دینے سے انکار کریں تب بھی مَیں ان سے جنگ کروں گا۔ اَیُبَدَّلُ الدِّیْنُ وَاَنَا حَیٌّ؟ ''کیا دین کے اندر ترمیم ہو جائے گی جبکہ میں ابھی زندہ ہوں؟'' تو یہ عزیمت ہے۔ اور پھر یہ کہ واقعتاً اللہ تعالیٰ نے ان کے اس عزم‘ ولولے اور حوصلے کا نتیجہ بھی ظاہر کر دیا۔ آپؓ کا زمانۂ خلافت پورے اڑھائی برس بھی نہیں‘ بلکہ دو سال چار ماہ ہے۔ اس قلیل عرصے میں ان تمام انقلاب مخالف قوتوں

(counter revolutionary movements) کو ختم کیا اور میدان بالکل صاف کر کے حضرت عمرؓ کے حوالے کیا۔ اب چونکہ اندرونِ عرب تو ہر طرح کے فتنوں کا قلع قمع ہو چکا تھا' لہٰذا دورِ فاروقی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فوجیں مشرق' مغرب اور شمال کی طرف نکلیں اور دس برس کے اندر اندر کرۂ ارضی کا بہت بڑا حصہ پرچم اسلام کے زیرنگیں آ گیا۔ تو اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ جو بھی بالاتر طبقہ ہے اس کے اندر نیچے والے طبقے کے سارے اوصاف موجود ہوتے ہیں' اگرچہ dormant رہتے ہوں۔ وہ ظاہر تب ہی ہوں گے جب ایسا کوئی مرحلہ آئے گا' جب کوئی محاذ درپیش ہو گا۔ تو اِن حقائق کو اگر آپ سامنے رکھیں تو نبوت و رسالت' صدّیقیت' شہادت اور صالحیت کی درجہ بندی سمجھ میں آ سکے گی۔

جہاں تک بعض صوفیاء کے اس قول کا تعلق ہے کہ نسبتِ ولایت افضل ہے نسبتِ نبوت سے' اس کی حقیقت یہ ہے کہ ایک نبی اور رسول یعنی جس شخصیت میں نبوت اور رسالت دونوں نسبتیں جمع ہیں اس کی نسبتِ نبوت نسبتِ رسالت سے افضل ہے۔ اب نسبت نبوت کو اصل مناسبت نسبت ولایت کے ساتھ ہے اور نسبت رسالت کو اصل مناسبت نسبت شہادت کے ساتھ ہے۔ تو نبی کی جو ولایت ہے وہ نبی کی رسالت سے افضل ہے' اس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن یہ تصور کہ کوئی ولی جو غیر نبی ہے وہ کسی نبی سے افضل ہو سکتا ہے' یہ ایک غلط اور باطل تصور ہے۔ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

سورۃ الحدید کی زیرِ مطالعہ آیت نمبر ۱۹ کا کچھ حصہ رہ گیا تھا' اسے ہم مکمل کر لیتے ہیں۔ فرمایا: ﴿وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖۤ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الصِّدِّیۡقُوۡنَ ٭ وَالشُّہَدَآءُ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ؕ﴾ ''عِنۡدَ رَبِّہِمۡ'' یہاں ''اَلشُّہَدَآءُ'' کے بعد آیا ہے۔ یہ صرف ''اَلشُّہَدَآءُ'' کے لیے بھی ہو سکتا ہے اور ''اَلصِّدِّیۡقُوۡنَ وَالشُّہَدَآءُ'' کے لیے بھی۔ ''عِنۡدَ رَبِّہِمۡ'' کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں: ''اللہ کے نزدیک'' یا ''اللہ کے پاس''۔ چنانچہ پہلا ترجمہ ہو گا ''وہ اپنے ربّ کے نزدیک صدّیق اور شہید ہیں''۔ جیسے ہم کہتے ہیں: میرے نزدیک اس کا مقام یہ ہے۔ تو یہ وہ لوگ ہوں گے جو اللہ کے نزدیک مراتب صدّیقیت اور مراتب شہادت پر فائز ہوں گے۔ اس طرح ''عِنۡدَ رَبِّہِمۡ'' کا اطلاق دونوں پر ہو گا۔ لیکن میرے نزدیک دوسری بات زیادہ صحیح ہے کہ ''عِنۡدَ رَبِّہِمۡ'' کا اطلاق صرف ''اَلشُّہَدَآءُ'' پر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ گواہی اصل میں اللہ کے ہاں جا کر دینی ہے' جیسا کہ میں تفصیل سے عرض کر چکا ہوں۔ دنیا میں جب کوئی اللہ کا بندہ دعوت دیتا ہے اور دعوت اس حد تک پہنچا دیتا ہے کہ اتمامِ حجت ہو جائے تو اب وہی ہو گا جو اللہ کی عدالت میں گواہِ استغاثہ کی حیثیت سے کھڑا ہو گا اور سب سے پہلے وہ testify کرے گا کہ پروردگار! تیرا پیغام جو میرے پاس آیا تھا میں نے ان تک پہنچا دیا تھا۔ تو ''اَلشُّہَدَآءُ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ'' کا مفہوم یہ ہو گا کہ وہ عدالتِ خداوندی میں' عدالتِ اُخروی میں' اللہ کے ہاں محاسبۂ اُخروی کے وقت گواہ ہوں گے' اللہ کی طرف سے حجت قائم کرنے والے ہوں گے۔ اسے ہمارے ہاں کی عدالتی زبان میں گواہِ استغاثہ یا سرکاری گواہ (prosecution witness) کہتے ہیں۔ استغاثہ کے وکلاء بھی ہوتے ہیں' انسپکٹرز بھی ہوتے ہیں اور گواہ بھی۔ فوجداری مقدمات میں کوئی ملزم جب عدالت میں پیش ہوتا ہے تو پہلے اس پر فردِ جرم عائد کی جاتی ہے اور یہ چارج شیٹ اسے پڑھ کر سنائی جاتی ہے' اس لیے کہ اس نے ریاست کے قانون کو توڑا ہے۔ تو اس حوالے سے اللہ کے ہاں اِن ''شہداء'' کی حیثیت استغاثہ کے گواہ کی ہو گی۔ انبیاء ورُسل وہاں پر شہادت دینے کے لیے کھڑے ہوں گے۔

اب دیکھئے' صدّیقیت تو شہادت سے بلند تر رتبہ ہے' لہٰذا کیسے ممکن ہے کہ جو صدّیق ہے وہ دعوت نہیں دے گا! چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دعوت پر عشرۂ مبشرہ میں سے چھ حضرات ایمان لائے ہیں۔ تو اوپر والے میں نیچے والے کے سارے اوصاف موجود ہوتے ہیں۔ تو اس اعتبار سے اس آیت کا ایک ایک لفظ اُجاگر ہو کر ہمارے سامنے آ گیا ہے اور ہم نے دیکھا کہ یہاں کوئی لفظ بھی ایسے ہی نہیں آ گیا۔ قرآن حکیم میں برائے بیت یا برائے وزن کوئی شے نہیں ہے۔ ہر شے نہایت معنی خیز ہے اور اپنی جگہ پر ہیرے کی طرح جڑی ہوئی ہے۔ ہر حرف اپنی جگہ پر اِس کے حسنِ

معنوی کے اندر اضافہ کر رہا ہے۔

صدّیقیت اور شہادت کے ضمن میں ایک بات مزید عرض کر رہا ہوں کہ اگرچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ صدّیقین میں سے ہیں اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ شہداء میں سے ہیں' لیکن جب ہم مراتب شمار کرتے ہیں تو حضرت ابوبکرؓ کے بعد عمرؓ ہیں اور پھر عثمانؓ ہیں۔ اس طرح ذہنوں میں ایک اشکال پیدا ہو سکتا ہے' تو اس کو بھی سمجھ لیجیے کہ اپنی جگہ پر تو صدّیقیت بلند تر مقام ہے مرتبہ شہادت سے' لیکن کمیت (quantity) کا مسئلہ اور ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ سونا چاندی کی نسبت زیادہ قیمتی دھات ہے' لیکن فرض کیجیے سونا چند تولے ہے اور چاندی منوں کے حساب سے رکھی ہوئی ہے تو ظاہر بات ہے منوں چاندی قیمت کے اعتبار سے چند تولے سونے سے بڑھ جائے گی' اگرچہ اپنی جگہ پر یہی کہا جائے گا کہ سونا' چاندی سے قیمتی ہے۔ یہ تمثیل بھی اس حدیث پر مبنی ہے کہ حضورﷺ نے خود فرمایا ہے کہ: ((اَلنَّاسُ مَعَادِنٌ)) یعنی ''انسانوں کا معاملہ بھی معدنیات کی طرح ہے''۔ کوئی معدنیات زیادہ قیمتی اور کوئی کم قیمتی ہوتی ہیں۔ ایک روایت میں آگے یہ الفاظ بھی آئے ہیں: ((کَمَعَادِنِ الذَّھَبِ وَالْفِضَّۃِ)) ''جیسے سونے اور چاندی کی کانیں ہوتی ہیں''۔ سونا' چاندی' تانبا اور لوہا سب معدنیات ہی ہیں' لیکن ان کی اپنی اپنی حیثیت ہے۔ فرمایا: ((خِیَارُھُمْ فِی الْجَاھِلِیَّۃِ خِیَارُھُمْ فِی الْاِسْلَامِ اِذَا فَقُھُوْا)) (متفق علیہ) ''ان میں سے جو لوگ (اسلام سے قبل) جاہلیت میں بہتر تھے وہی پھر اسلام لا کر بھی بہتر ہوئے' جب انہوں نے دین کی سمجھ حاصل کر لی''۔

یوں سمجھئے کہ سونا جب آپ زمین سے نکالتے ہیں تو یہ کچ دھات (ore) کی صورت میں ہوتا ہے' اس میں کچھ کثافتیں ملی ہوئی ہوتی ہیں۔ اسے صاف کرتے ہیں تو وہ سونا بن جاتا ہے۔ اسی طرح چاندی کی ore ہے' اس کے اندر بھی impurities ہیں' صاف کریں گے تو وہ چاندی بنے گی۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ چاندی کی کچ دھات کو صاف کریں تو وہ سونا بن جائے۔ چاندی کی ore سے تو چاندی ہی وجود میں آئے گی۔ اسے آپ جتنا زیادہ صاف کریں گے اسی قدر خالص چاندی آپ کو مل جائے گی۔ اسی طرح سونے کی ore ہے تو خوب صاف کرنے سے آپ کو بہت عمدہ زرِ خالص عیار مل جائے گا۔ لیکن جب مقدار کا پہلو آ جائے گا تو چاندی کی زیادہ مقدار سونے کی قلیل مقدار سے زیادہ قیمتی ثابت ہو سکتی ہے۔ یہی معاملہ صدّیقیت اور شہادت کا ہے۔ حضرت عمر فاروق ؓ اپنی جگہ پر مزاجاً شہید تھے' لیکن پھر اس کے اندر انہوں نے جو مقام حاصل کیا ہے اس quantitative عنصر کے اعتبار سے ان کا رتبہ بحیثیت مجموعی صحابہؓ کی جماعت کے اندر تمام صدّیقین سے بڑھ گیا' سوائے صدّیق اکبر ؓ کے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں حضرت ابوبکر صدّیق ؓ کے افضل ترین ہونے میں کوئی شک نہیں' افضلُ البشرِ بعدَ الانبیاء بالتحقیق ابوبکرٍ الصِّدّیق' دوسرے نمبر پر حضرت عمر فاروق ؓ' تیسرے نمبر پر حضرت عثمان ؓ اور چوتھے نمبر پر حضرت علی ؓ ہیں۔ اگرچہ جہاں تک مزاج کا تعلق ہے حضرت علیؓ مزاجاً حضورﷺ کے مزاج سے قریب ترین ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ambiverts بہت شاذ ہوتے ہیں۔ حضرت علیؓ میں آپ دیکھئے ایک طرف ادب ہے' فصاحت و بلاغت ہے' چوٹی کے شاعر ہیں اور آپؓ نے عربی گرامر کے اصول و قواعد معین کیے ہیں۔ ''نہج البلاغۃ'' میں آپؓ کے خطبات دیکھئے کہ فصاحت و بلاغت کا کیا عالم ہے! اگرچہ ہم سمجھتے ہیں کہ اس میں بہت سی چیزیں جھوٹی بھی شامل کر دی گئی ہیں' لیکن حضرت علیؓ کی فصاحت و بلاغت اور علم سے کون انکار کر سکتا ہے؟ آپؓ کا شمار چوٹی کے فقہاء صحابہؓ میں ہوتا ہے۔ دوسری طرف آپؓ مردِ میدان ہیں' تلوار کے دھنی ہیں۔ غزوۂ احزاب میں جب عمرو بن عبدوَدّ نے آگے بڑھ کر چیلنج کیا تو وہاں کسی کو اُس کے مقابل جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ یہ ۱۰۰ آدمیوں کے برابر قوت رکھنے والا شخص ہے۔ حالانکہ وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا' لیکن اتنا جری اور قوی ہیکل شخص تھا کہ اس کی شجاعت اور شہ زوری کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے حضرت علیؓ میدان میں آئے تو کہنے لگا اگر کوئی آخری خواہش ہے تو بیان کرو! حضرت علیؓ نے پہلے یہ

خواہش ظاہر کی کہ مسلمان ہو جاؤ‘ جب اس نے اسے ردّ کر دیا تو دوسری خواہش یہ بیان کی کہ جنگ کے میدان سے واپس چلے جاؤ اور جب اس نے اسے بھی ردّ کر دیا تو کہا کہ میری آخری خواہش یہ ہے کہ یا تو تم میرے ہاتھوں جہنم پہنچو یا تم مجھے جنت میں پہنچا دو! اس پر وہ ہنسا کہ میں نے آج تک اپنی پوری زندگی میں کسی شخص کو نہیں دیکھا جو مجھے مقابلے کی دعوت دے رہا ہو۔ پھر وہ مشتعل ہو کر گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔ حضرت علیؓ نے دست بدست جنگ میں اسے جہنم رسید کر دیا۔ پھر حضرت علیؓ فاتح خیبر ہیں۔ خیبر کا قلعہ کسی کے ہاتھوں فتح نہیں ہو رہا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اعلان فرمایا: میں کل جھنڈا ایک ایسے آدمی کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت کرتا ہے اور جس سے اللہ اور رسولؐ محبت کرتے ہیں۔ صبح آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جھنڈا عطا فرمایا اور آپؓ کے ہاتھوں خیبر فتح ہوا۔ تو یہ جو توازن اور combination ہے کہ ایک طرف شجاعت و بہادری اور دوسری طرف فصاحت و بلاغت‘ ادبیت‘ شاعری‘ اس اعتبار سے حضرت علیؓ صحابہ کرامؓ میں چوٹی کے آدمی ہیں۔ چنانچہ میرے نزدیک صحابہ کرام میں جامعیت کبریٰ حضرت علیؓ کو حاصل ہے‘ اس میں کوئی شک نہیں ہے۔

لیکن جب ہم صحابہ کرامؓ کے اندر درجہ بندی کریں گے‘ تو جیسا کہ میں نے اس سے پہلے ایک موقع پر عرض کیا تھا‘ حضرت علیؓ کا شمار صف دوم میں ہو گا۔ اس لیے کہ حضرات ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم جیسے کبار صحابہ تو لگ بھگ رسول اللہ ﷺ کے ہم عمر قسم کے لوگ تھے‘ آپؐ کے اعوان و انصار تھے‘ جبکہ حضرت علیؓ تو گویا حضور ﷺ کی گود میں پروان چڑھے ہیں‘ وہ آپ ﷺ کے گھر میں پلے بڑھے ہیں۔ چنانچہ یہ حقیقت اپنی جگہ پر واضح ہے کہ تربیتِ محمدیؐ کا شاہکار تو یقیناً حضرت علیؓ ہیں‘ اس لیے کہ جس قدر صحبت کا فیض اٹھانے اور حضور ﷺ کی تعلیم و تربیت سے حصہ حاصل کرنے کا موقع حضرت علیؓ کو ملا کسی اور کے لیے اس کا امکان ہی نہیں ہے۔ لیکن وہ جو حضور ﷺ کے ساتھی تھے‘ جو اعوان و انصار اور دست و بازو تھے‘ جو آپؐ کے ہم عمر اور آس پاس تھے ان کی صف ہی علیحدہ ہے‘ حضرت علیؓ اس میں جگہ نہیں پاتے۔ اس اعتبار سے جو لوگ ان کے درمیان تقابل کرنے کی کوشش کرتے ہیں میرے نزدیک وہ قیاس مع الفارق کے مرتکب ہوتے ہیں۔ دو چیزوں میں تقابل اور موازنہ وہاں کیا جاتا ہے جہاں نوعیت ایک ہو۔ اگر نوعیت مختلف ہو تو اُن میں موازنہ کیا ہو گا؟ البتہ مزاج کے اعتبار سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے قریب ترین ہیں۔

دنیا کی کامل ترین متوازن شخصیت (بالفاظ دیگر ambivert) تو صرف حضور ﷺ کی ہے کہ ایک طرف قوائے ذہنی و فکری بھی انتہا پر ہیں اور دوسری طرف قوائے عملی بھی انتہا پر ہیں۔ ان دونوں کا امتزاج اگر بتمام و کمال ہوا ہے تو وہ خود محمد عربی ﷺ ہیں۔ ڈاکٹر مائیکل ہارٹ نے اپنی کتاب ’’The 100‘‘ میں اس کے ہم وزن بات لکھی ہے۔ دیکھئے‘ اس شخص نے جب یہ کتاب مرتب کرنے کا فیصلہ کیا تو گویا یہ فیصلہ کیا کہ میں نسل انسانی کے پہلے سو (۱۰۰) عظیم ترین انسانوں کا انتخاب کروں گا جنہوں نے تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑا اور اس کے رُخ کو معین کرنے میں مؤثر کردار ادا کیا‘ پھر میں ان میں درجہ بندی کروں گا کہ اِن سو میں بلند ترین مقام پر کون ہے جس نے سب سے زیادہ فیصلہ کن انداز میں تاریخ کے دھارے پر اپنا اثر ڈالا ہے اور اس کے رُخ کو موڑا ہے۔ پھر اس اعتبار سے دوسرے اور تیسرے نمبر پر کون آئے گا! ظاہر ہے کہ اس کے لیے اس نے تاریخ انسانی کا گہرا مطالعہ کیا ہو گا اور خوب سوچ بچار کیا ہو گا۔ اس کے بعد وہ کتاب مرتب کرنے بیٹھا ہے تو نمبر ایک پر لایا ہے محمد رسول اللہ ﷺ کو۔ ڈاکٹر مائیکل ہارٹ آج تک بھی عیسائی ہے۔ نہ تو ابھی اس کے مرنے کی خبر آئی ہے نہ اسلام لانے کی خبر آئی ہے۔ اس کی یہ کتاب دنیا میں بہت عام ہوئی ہے‘ لیکن اشاعت کے بعد وہ بہت جلد نایاب ہو گئی تھی اور عام خیال یہ تھا کہ شاید کسی سازش کے تحت اسے غائب کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ اس نے اس کتاب میں حضرت مسیحؑ کو نمبر تین پر رکھا اور حضور ﷺ کو نمبر ایک پر لایا‘ اور یہ بات عیسائی دنیا کے لیے قابل قبول اور قابل برداشت نہیں تھی۔ اس نے لکھا ہے:

"My choice of Muhammad to lead the list of the world's most influential persons may surprise some readers and may be questioned by others, but he was the only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels."

ڈاکٹر مائیکل ہارٹ کے نزدیک انسانی زندگی کے دو علیحدہ علیحدہ میدان ہیں۔ ایک ہے مذہب‘ اخلاق اور روحانیت کا میدان‘ جبکہ ایک ہے تمدن‘ تہذیب‘ سیاست اور معاشرت کا میدان‘ اور ان دونوں میدانوں میں انتہائی کامیاب (Supremely successful) انسان ایک ہی ہے اور وہ ہیں محمدﷺ۔ وہی بات میں کہہ رہا ہوں۔ یہ جو introverts اور extroverts کے درمیان ایک ایسی جامع شخصیت جو سرفہرست ہے وہ نبی اکرمﷺ ہیں‘ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم میں پھر اس اعتبار سے حضرت علیؓ کا مزاج آپؐ سے بہت قریب تر ہے۔

صدّیقین اور شہداء کے ذکر کے بعد فرمایا: ﴿لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ﴾ ”ان کے لیے ان کا اجر اور اُن کا نور محفوظ ہے“۔ اس سورۂ مبارکہ میں لفظ نور بہت کثرت کے ساتھ بار بار آ رہا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ فرمایا کہ قرآن مجید انسانوں کو اندھیروں سے نکال کر نور میں لاتا ہے۔ یہ آیاتِ بینات پر مشتمل ہے۔ پھر یہ کہ نورِ ایمان قیامت کے دن ظاہر ہوگا اور منافقین اس سے محروم اور تہی دست ہوں گے۔ اہل ایمان کا نور اُن کے سامنے اور اُن کے داہنی طرف دوڑتا ہوگا۔ میرے نزدیک اس کی سادہ ترین توجیہہ یہ ہے کہ جو دل کا نور ہوگا اس کا ظہور سامنے کی طرف ہو رہا ہوگا اور اعمالِ صالحہ کا نور دائیں طرف ہوگا۔ اس لیے کہ اعمالِ صالحہ کا کاسِب دایاں ہاتھ ہے۔ لہٰذا انسان کسی کو کچھ دیتا ہے تو داہنے ہاتھ سے دیتا ہے۔ سارے اچھے کام ہم داہنے ہاتھ سے کرتے ہیں۔ تو اعمال کا نور داہنی طرف اور ایمان کا نور سامنے کی طرف ہوگا۔ تو وہاں بھی نور کا تذکرہ آیا۔ یہاں بھی فرمایا: ﴿لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ﴾ یہ لام لامِ تملیک بھی ہے اور لامِ استحقاق بھی۔ میں نے ترجمہ میں لفظ ”محفوظ“ کا اضافہ کیا ہے ”ان کے لیے ان کا اجر اور ان کا نور محفوظ ہے“۔ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں اجرِ عظیم بھی ہے اور ان کے لیے ان کا نور بھی محفوظ ہے۔

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ﴾ ”اور وہ لوگ کہ جو کفر کریں اور ہماری آیات کی تکذیب کریں وہی دوزخ والے ہیں“۔ میں ان دونوں الفاظ (کفر اور تکذیب) کی یہاں وضاحت کرتا چلوں کہ یہ جو الفاظ آئے ہیں یہ ایسے ہی نہیں آئے جیسے ہم صرف اضافے کے لیے الفاظ لاتے ہیں‘ جیسے گورا چٹا‘ بلکہ ان کی معنویت ہے۔ کفر کا حقیقی اور لغوی مفہوم ہے چھپا دینا۔ اسی سے لفظ ”کفارہ“ ہے۔ آپ سے کوئی گناہ‘ کوئی غلطی ہوگئی تو اب اس کا کفارہ ہوگا کہ جو اُس کے اثر کو زائل کر دے گا۔ آپ کفارہ ادا کر دیں گے تو وہ گناہ گویا آپ کے نامۂ اعمال سے حذف کر دیا جائے گا‘ یا دھو دیا جائے گا‘ چھپا دیا جائے گا۔ تو اس کفر کے لفظ کو اچھی طرح سمجھ لیجیے اور یہ لفظ شکر کے مقابلے میں کیوں آتا ہے؟ سلیم الفطرت انسان کے ساتھ جب بھی کوئی احسان کرتا ہے‘ حسن سلوک کرتا ہے‘ اس کی کوئی خدمت کرتا ہے‘ اسے کوئی قیمتی شے دیتا ہے تو اس کے قلب کی گہرائیوں میں احسان مندی کے جذبات اُبھرتے ہیں جو زبان پر آ کر شکریے کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ لیکن ایک بدطینت ناشکرے انسان کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ محسن ومنعم کا شکر ادا کرے‘ وہ ان جذباتِ تشکر کو دباتا ہے۔ یہی معاملہ ایمان اور کفر کا ہے۔ اس لیے کہ ایمان تو درحقیقت اس روحِ ربانی کے اندر موجود ہے جو ہمارے وجود میں پھونکی گئی ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ﴾ تو درحقیقت ”نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ“ کے مصداق نورِ فطرت اور نورِ وحی کے جمع ہونے سے ایمان وجود میں آتا ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی فطرت مسخ ہو چکی ہوتی ہے‘ فطرت کے سوتے خشک ہو چکے ہوتے ہیں‘ لیکن جس شخص کے اندر ذرا سی بھی فطرت کی سلامتی باقی ہے اس کے سامنے جیسے ہی نبی کی دعوت آتی ہے تو اس کے اندر سے اس کی تصدیق ابھرتی ہے کہ ہاں یہ بات صحیح ہے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ ''ہی'' میرے دل میں ہے!

لیکن فرض کیجیے کہ کوئی تعصب اور عصبیت ہے' کوئی ضد اور تکبر ہے' کوئی حسد ہے' تو فطرت کی اس آواز کو دبایا جائے گا۔ یہود کے علماء نے حضورﷺ کا جو انکار کیا تو اس کی وجہ قرآن نے یہ بیان کی: ﴿حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ﴾ کہ یہ اپنے اندر کے حسد کی وجہ سے یہ سب کچھ کر رہے ہیں' ورنہ یہ کہ ﴿يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ﴾ ''یہ تو محمد (ﷺ) کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں''۔ تو اگر پہچان بھی لیا' دل نے گواہی بھی دے دی' لیکن اس کے باوجود کوئی انکار کر رہا ہے' تو درحقیقت یہ دو مرحلے ہیں۔ ایک اپنے اندر کی تصدیق کو دبانا' بجائے اس کے کہ اسے ظاہر ہونے دیں' اور دوسرے زبان سے تکذیب کرنا' جھٹلانا۔ یہ گویا کہ دو مظاہر (phenomenons) ہیں کہ ان دونوں کو ملا کر بات مکمل ہوتی ہے۔ باطن میں سے اُبھرنے والی تصدیق کو دبا دینا کفر ہے' جس کے لیے یہاں الفاظ آئے ہیں: ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ اور پھر نبیؐ کی دعوت کو جھٹلانا کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں غلط کہہ رہے ہیں' یہ تکذیب ہے اور یہ گویا جرم بالائے جرم ہے' ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ کا مصداق ہے۔ تو فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ﴾ وہ لوگ کہ جو کفر کرتے ہیں' اندر کی حقیقتوں کو' اپنے باطن اور روح کی گواہیوں کو اور شہادتوں کو دباتے اور چھپاتے ہیں اور جب ہماری آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو اُن کی تکذیب کرتے ہیں' انہیں جھٹلاتے ہیں۔ ﴿اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ﴾ ''یہی تو جہنم والے ہیں''۔ یہ جہنم میں داخل ہو کر رہیں گے۔

مضامین کے اعتبار سے ہم نے سورۃ الحدید کی آیات کو سات حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ آیت ۱۹ پر اِس کا چوتھا حصہ ختم ہو رہا ہے۔ یہ حصہ اپنے مضامین کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ میں نے اِس کی وضاحت کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ بعض مفسرین نے ان آیات میں بہت سے اشکال پیدا کر دیے ہیں' چنانچہ آپ مختلف تفاسیر دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے مفسرین کس طرح مختلف بحثوں میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں۔ یہ صرف دو چیزوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ ایک تو یہ کہ آیت ۱۸ اور ۱۹ کے درمیان جو ربط ہے وہ لفظی طور پر موجود نہیں ہے' لہٰذا ''اَلْقُرْاٰنُ يُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا'' کے مصداق یہاں سورۃ البلد سے استشہاد کر کے ''ثُمَّ'' محذوف ماننا پڑتا ہے۔ دوسرے یہ کہ لفظ شہید کا ایک ہی تصور ذہنوں میں بیٹھا ہوا ہے اور وہ یہ کہ جو بھی اللہ کی راہ میں قتل ہو جائے وہ شہید ہے۔ حالانکہ میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ لفظ قرآن میں اس معنی میں نہیں آتا۔ صرف ایک مقام سورۂ آل عمران کا ہے جہاں یہ معنی مراد لیے جا سکتے ہیں۔ وہاں پر بھی دوسرا مفہوم مراد ہو سکتا ہے' لیکن مقتول فی سبیل اللہ بھی مراد لیا جا سکتا ہے۔ البتہ حدیث میں یہ لفظ اس معنی میں آیا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کچھ تصورات کا غلبہ اس طرح کا ہو جاتا ہے کہ اصل حقیقت اس کے پیچھے محجوب ہو جاتی ہے اور اس کی طرف توجہ ہی نہیں ہوتی۔

بابِ ششم

مشتمل بر

سورۃ الحدید کی آیات ۲۰ تا ۲۴

حیاتِ دُنیوی کے ناگزیر مراحل

اور

حیاتِ دُنیوی اور حیاتِ اُخروی کا تقابل

☆

مسابقت الی الجنّۃ کی ترغیب

اعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرَّجیم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا لَعِبٌ وَّلَہۡوٌ وَّزِیۡنَۃٌ وَّتَفَاخُرٌۢ
بَیۡنَکُمۡ وَتَکَاثُرٌ فِی الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَوۡلَادِ ؕ کَمَثَلِ غَیۡثٍ اَعۡجَبَ
الۡکُفَّارَ نَبَاتُہٗ ثُمَّ یَہِیۡجُ فَتَرٰىہُ مُصۡفَرًّا ثُمَّ یَکُوۡنُ حُطَامًا ؕ وَفِی
الۡاٰخِرَۃِ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ ۙ وَّمَغۡفِرَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرِضۡوَانٌ ؕ وَمَا
الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الۡغُرُوۡرِ T سَابِقُوۡۤا اِلٰی مَغۡفِرَۃٍ مِّنۡ
رَّبِّکُمۡ وَجَنَّۃٍ عَرۡضُہَا کَعَرۡضِ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ ۙ اُعِدَّتۡ
لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ ؕ ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ
یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰہُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ Y مَاۤ اَصَابَ مِنۡ مُّصِیۡبَۃٍ فِی
الۡاَرۡضِ وَلَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡرَاَہَا ؕ
اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرٌ ۚ لِّکَیۡلَا تَاۡسَوۡا عَلٰی مَا فَاتَکُمۡ وَلَا
تَفۡرَحُوۡا بِمَاۤ اٰتٰىکُمۡ ؕ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخۡتَالٍ فَخُوۡرِ Ω
الَّذِیۡنَ یَبۡخَلُوۡنَ وَیَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبُخۡلِ ؕ وَمَنۡ یَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰہَ
ہُوَ الۡغَنِیُّ الۡحَمِیۡدُ Ξ﴾

سورۃ الحدید کا پانچواں حصہ ان پانچ آیات پر مشتمل ہے۔ پہلے ہم ان آیات مبارکہ کا ایک رواں ترجمہ کرتے ہیں:

''خوب جان لو کہ یہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل اور دل لگی اور ظاہری ٹیپ ٹاپ اور تمہارا آپس میں ایک دوسرے پر فخر جتانا اور مال و اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بارش ہوگئی تو اس سے پیدا ہونے والی نباتات نے کاشت کاروں کو خوش کر دیا۔ پھر وہی کھیتی پک جاتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہوگئی' پھر وہ بھس بن کر رہ جاتی ہے۔ اس کے برعکس آخرت وہ جگہ ہے جہاں سخت عذاب ہے اور اللہ کی مغفرت اور اس کی خوشنودی ہے۔ اور دنیا کی زندگی تو محض دھوکے کا سامان ہے۔ دوڑو اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے رب کی مغفرت اور اُس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان و زمین جیسی ہے' جو تیار رکھی گئی ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ اور اللہ کے رسولوں پر ایمان لائے۔ یہ اللہ کا فضل ہے' جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے' اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے جو زمین میں یا تمہارے اپنے نفس پر نازل ہوتی ہو اور ہم نے اس کو پیدا کرنے سے پہلے ایک کتاب (یعنی نوشتۂ تقدیر) میں لکھ نہ رکھا ہو۔ ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان کام ہے۔ (یہ سب کچھ اس لیے ہے) تاکہ جو کچھ بھی تمہارے ہاتھ سے جاتا رہے اس پر دل شکستہ نہ ہو اور جو کچھ اللہ تمہیں عطا فرمائے اس پر پھول نہ جاؤ۔ اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور فخر جتاتے ہیں۔ جو خود بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بخل کرنے پر اکساتے ہیں۔ اور جو کوئی روگردانی کرتا ہے تو (وہ جان لے کہ) اللہ بے نیاز اور ستودہ صفات ہے''۔

دنیا کی زندگی کس اعتبار سے کھیل تماشا ہے؟

اس حصے کی سب سے پہلی آیت بھی میرے نزدیک قرآن کریم کی عظیم ترین آیات میں سے ہے۔ میرے مشاہدے کی حد تک اس آیت کی بھی اصل حقیقت تک بہت کم لوگوں کی رسائی ہو سکی ہے۔ اس لیے کہ یہاں پانچ الفاظ جس حسنِ ترتیب کے ساتھ آئے ہیں اس میں ایک بہت بڑی حکمت مضمر ہے جس کی طرف توجہ نہیں کی گئی ہے۔ یہ مضمون کہ دنیا کی زندگی محض کھیل تماشا ہے اور دھوکے کی ٹٹی ہے' یہ اس اعتبار سے ہے کہ اگر دنیا خود مطلوب و مقصود بن جائے اور آخرت سے غافل کر دے۔ چنانچہ آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: ﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ٢٠﴾ ''دنیا کی زندگی دھوکے کے سامان کے سوا کچھ نہیں''۔ کوئی شخص اگر غریب الوطنی کی کیفیت یعنی حالت مسافرت میں ہو اور اپنا اصل گھر' اصل وطن اور اصل منزل بھول جائے تو معلوم ہوا کہ وہ بہت ہی بدنصیب شخص ہے۔ تو دنیا اگر اس طریقے سے کسی انسان کو اپنے اندر جذب کر لے' متوجہ کر لے کہ اس کی اصل زندگی پس پردہ چلی جائے تو اس اعتبار سے دنیا کی زندگی سراسر دھوکے کا سامان ہے۔ اس مضمون کو سورۃ العنکبوت میں یوں بیان کیا گیا ہے:

﴿وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۭ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ٦٤﴾

''یہ دنیا کی زندگی تو کھیل کود اور تماشے کے سوا کچھ نہیں' اصل زندگی تو آخرت کے گھر کی زندگی ہے' کاش کہ انہیں معلوم ہوتا''

تو اگر حیاتِ دُنیوی انسان کو آخرت سے غافل کر دے تو اس سے بڑا دھوکے کا سامان کوئی نہیں۔ اس معنی میں بہت سی جگہوں پر قرآن مجید میں یہ مضمون آیا ہے' بلکہ ''لَهْوٌ وَّلَعِبٌ'' اور ''لَعِبٌ وَّلَهْوٌ'' دونوں ترکیبوں کے ساتھ آیا ہے' لیکن جس شان سے یہاں سورۃ الحدید میں آیا ہے اور پھر اس پر جو اضافہ ہے' میں پھر عرض کر رہا ہوں کہ یہ قلت تدبر ہی ہے کہ اس پر لوگوں نے غور ہی نہیں کیا کہ یہ الفاظ کس ربط کے ساتھ آ رہے ہیں۔ فرمایا: ﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ﴾ ان الفاظ کی ترجمانی یوں ہوگی کہ ''جان لو کہ یہ دنیا کی زندگی تو بس یہی کچھ ہے کہ کھیل ہے' کچھ لذت حاصل کرنا ہے' کچھ زینت اور بناؤ

سنگھار ہے‘ کچھ آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرنا ہے اور کچھ مال اور اولاد کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش ہے‘‘۔ یہ پانچ الفاظ جو یہاں آئے ہیں ان کو اسی ترتیب سے رکھ کر یہ مضمون بیان کیا جاسکتا ہے۔لیکن ان کی جو اصل عظمت ہے وہ اس حوالے سے ہے کہ یہ اصل میں حیاتِ انسانی کے پانچ ادوار ہیں جو اِس ترتیب سے آئے ہیں۔ ہمارے اردو یا عربی کے محاورے میں عام طور پر ’’لہوولعب‘‘ کا لفظ آتا ہے‘ لیکن یہاں پر ’’لَعِبٌ وَّلَهْوٌ‘‘ کی ترکیب آئی ہے‘ تو یہ ویسے ہی نہیں ہے بلکہ بڑی حکمت کی حامل ہے!

انسانی زندگی کے پانچ ادوار —— آئینۂ قرآنی میں

انسانی زندگی کے پانچ ادوار ہیں۔ پہلا دور وہ ہے جبکہ زندگی صرف کھیل سے عبارت ہے۔ بچپن اور لڑکپن میں کوئی فکر‘ تشویش اور اندیشہ نہیں‘ اپنے کھانے پینے کی بھی فکر نہیں‘ وہ والدین کے ذمہ ہے‘ بھوک لگے گی تو ماں کھلائے گی‘ پلائے گی۔ بچے کے لیے زندگی صرف کھیل ہے۔ اِلاّ یہ کہ تکلیف ہوگی تو وہ رو لے گا‘ کوئی احتیاج ہوگی تو مُنہ بسورے گا اور والدین کو اپنی طرف متوجہ کرے گا۔ باقی اس کو کسی اور شے کی کوئی فکر نہیں۔ یہ کھیل ابھی خالص معصومانہ کھیل ہوتا ہے‘ اس میں کوئی تلذّذ کا عنصر نہیں ہوتا۔ بچے کی سوچ اور سارے کے سارے فکر کا مرکز کھیل (لعب) ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے: ﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ......﴾

اس کے بعد ایک سٹیج آتی ہے جسے ’’teen ager stage‘‘ کہا جاتا ہے۔ یہ انسانی زندگی کا نہایت خطرناک دور ہوتا ہے۔ اب یہاں کھیل صرف کھیل نہیں رہ جاتا‘ اس میں کچھ نہ کچھ تلذّذ (sensual gratification) شامل ہو جاتا ہے۔ اس عمر میں آدمی بہت سی غلط قسم کی آوارگیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ دوسرا مرحلہ ’’لَهْو‘‘ ہے جو ’’لَعِب‘‘ کے بعد ہے۔

تیسری سٹیج ہے ’’زِيْنَةٌ‘‘ یعنی بناؤ سنگھار۔ اٹھارہ سے بیس برس کے نوجوانوں اور خاص طور پر لڑکیوں کے ذہن پر جو چیز سب سے زیادہ سوار ہوتی ہے وہ فیشن ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ لباس اور وضع قطع بالکل فیشن کے مطابق ہوں۔ اگر تنگ موری والی پینٹ کا رواج ہے تو کوئی نوجوان چوڑی موری والی پینٹ پہننے کو ہرگز تیار نہیں ہوگا اور اس کے برعکس چوڑے قسم کے پائنچوں والی پتلون کا رواج ہے تو وہ دوسری قسم کی پتلون نہیں پہنے گا۔ گویا کہ ان کے سارے سوچ وفکر‘ احساسات اور نفسیات کے اندر سب سے نمایاں شے یہی بناؤ سنگھار اور زینت ہوتی ہے۔

اس کے بعد چوتھا دور آتا ہے ’’تَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ‘‘ کا۔ یہ دور دراصل ۲۵ سال کی عمر سے لے کر ۳۵ یا ۴۰ سال کی عمر تک کا دور ہے۔ اس میں اصل شے تفاخر ہے کہ انسان فخر میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانا چاہتا ہے۔ فخر مختلف چیزوں پر ہوتا ہے۔ فخر علم پر بھی ہوسکتا ہے‘ اپنے زہد وعبادت گزاری پر بھی ہوسکتا ہے اور مال و دولت پر بھی ہوسکتا ہے۔ جیسے پٹھانوں کے ہاں یہ بات مشہور ہے کہ اگر مدمقابل کے گھر پر نئے ماڈل کی کار آ گئی ہے تو پٹھان چاہے اپنی زمین گروی رکھے یا کچھ اور کرے بہرحال اسی ماڈل یا اس سے بہتر قسم کی کار جب تک اس کے دروازے پر نہیں آئے گی اسے چین نہیں آئے گا۔ اسی طرح اپنی نسل اور عصبیت پر بھی فخر ہوسکتا ہے۔ یعنی اپنی قبائلی برتری کا احساس ہو رہا ہے۔ یہ ’’تَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ‘‘ کا دور ہے۔

چالیس برس کے بعد جب عمر ڈھلنی شروع ہوتی ہے تو ’’تَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ‘‘ والا دور شروع ہو جاتا ہے۔ اب انسان کو کثرت کی فکر ہو جاتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ مال جمع ہو جائے‘ بلکہ میں یہ الفاظ استعمال کیا کرتا ہوں کہ ’’تفاخر‘‘ کے دور میں تو آدمی مونچھ اونچی رکھتا ہے‘ چاہے کچھ بھی ہو جائے وہ مونچھ نیچی نہیں ہونے دیتا‘ لیکن ’’تکاثر‘‘ کے دور میں آدمی سوچتا ہے کہ مونچھ چاہے مونڈ بھی دی جائے لیکن پیسہ ملے۔ اس کے پیش نظر اصل شے پیسہ اور دولت ہوتی ہے کہ یہ کسی طرح اس کے پاس آ جائے‘ چاہے اسے کچھ بھی کرنا پڑے۔ آدمی اس دور میں گویا بڑا حقیقت پسند (realistic) ہو جاتا ہے کہ اب بناؤ سنگھار اور تفاخر جیسی چیزوں پر کیوں خواہ مخواہ اپنی دولت ضائع کی جائے۔ بس پیسہ سنبھالو اور دولت سینت سینت کر رکھو!

یہاں قرآن مجید میں کثرت کی خواہش میں اولاد کا ذکر بھی موجود ہے۔ آج میڈیا کے گمراہ کن پروپیگنڈے کے زیر اثر کثرتِ اولاد کو باعثِ عار سمجھا جانے لگا ہے' حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ کثرتِ اولاد ہمیشہ فخر کی علامت رہی ہے۔ خاص طور پر جس کے جوان بیٹے ہوں اس کو یقیناً ایک تقویت حاصل ہوتی ہے۔ قبائلی زندگی میں تو دراصل انسان کی ذاتی عزت و وجاہت اسی بنیاد پر تھی۔ آج بھی دیہاتی زندگی میں یہ عنصر موجود ہے۔ میرے ایک کلاس فیلو ڈاکٹر سلیم صاحب' جو ایک ڈاکے میں قتل کر دیے گئے تھے' مثال دیا کرتے تھے کہ باجوہ فیملی کے ایک شخص کے' جو فیصل آباد کے قریب کسی گاؤں کا رہنے والا تھا' گیارہ بیٹے تھے جو سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو گئے۔ کوئی کہیں پر ڈی سی لگ گیا' کوئی کسی اور اعلیٰ عہدے پر فائز ہو گیا' جبکہ گاؤں میں کوئی بھی اس کے پاس نہیں تھا۔ وہاں پر تو اس کا مقابلہ وہاں کے لوگوں کے ساتھ ہوتا تھا اور وہاں اس کے پاس کوئی بھی بیٹا نہیں تھا جو اُس کا دست و بازو بنتا اور اس کی طرف سے مدافعت کرتا۔ تو وہ کہا کرتا تھا کہ کوئی میرے گیارہ پڑھے ہوئے لے لے اور مجھے ایک اَن پڑھ دے دے۔ اس لیے کہ یہاں پر تو جس کے پاس لاٹھی ہے اس کی عزت ہے' گاؤں میں تو سر اٹھا کر وہی چل سکتا ہے جس کے جوان بیٹے اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلیں اور میرے بیٹے تو پڑھ لکھ کر سب کے سب چلے گئے' لہٰذا میرے لیے عزت و وجاہت کی کوئی بنیاد موجود نہیں(۱)۔ یہاں خاص طور پر نوٹ کر لیجیے کہ قرآن مجید خاص قبائلی پس منظر میں نازل ہو رہا تھا اور اس کے اوّلین مخاطب وہی تھے جن کا سارا نظام قبائلی تھا۔ آج کی دنیا میں تو ضبطِ تولید اور فیملی پلاننگ کا معاملہ ہے' لیکن فطرت سے قریب تر جو معاشرہ ہوتا تھا' اور اب بھی جو ہو گا وہاں کثرت کی محبت میں مال کے ساتھ اولاد بھی لازمی طور پر شامل ہے۔ چنانچہ ہمارے دیہاتوں کے اندر اب بھی ''تَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ'' دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔

درحقیقت ان پانچ الفاظ کے مابین جو ربط ہے وہ بڑا اہم اور حکمت پر مبنی ہے۔

اصل بات جو بتائی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ یہ زندگی تو لامحالہ ان ادوار میں سے ہو کر گزرے گی۔ بچپن بھی آئے گا' نوجوانی کا دور بھی آئے گا' جوانی اور بڑی قوت والی زندگی کا دور بھی آئے گا۔ پھر ادھیڑ عمر کے مرحلے کو بھی انسان پہنچے گا اور اسے بڑھاپا بھی آ کر رہے گا۔ ان مراحل میں سے کسی کو بھی انسان روک نہیں سکتا۔ یہ تو گویا وقت کی رفتار ہے' جس کا روکنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ اب آخرت سے اس کا تقابل کیا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿وَفِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانٌ ؕ﴾ ''اور آخرت میں یا تو سخت عذاب ہے اور یا پھر اللہ کی مغفرت اور خوشنودی ہے''۔ آخرت کی زندگی میں ابدی طور پر نوعِ انسانی کے دو حصے ہو جائیں گے' یا اللہ کی طرف سے رضوان اور مغفرت ہو گی یا شدید عذاب ہو گا۔ ﴿وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۲۰﴾ ''اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کے سامان کے سوا کچھ بھی نہیں''۔ یہ دنیا کی زندگی کہیں تمہیں اپنے اندر گم نہ کر دے۔ ایسا نہ ہو کہ تم دنیا کو ہی مطلوب و مقصود سمجھ بیٹھو۔ جیسے اقبال نے کہا ہے ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مؤمن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق!

دُنیوی زندگی بھرپور طریقے سے گزارنی ہے لیکن ع ''بازار سے گزرا ہوں' خریدار نہیں ہوں!'' کے مصداق اس کو مطلوب و مقصود نہیں سمجھنا۔ ایک حدیث نبویؐ ہے: ((کُنْ فِی الدُّنْیَا کَاَنَّکَ غَرِیْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِیْلٍ))(۱) ''دنیا میں اس انداز سے رہو گویا کہ اجنبی (غریب الوطن) ہو یا راہ چلتے مسافر''۔ یہ بات سامنے رہے کہ یہ تمہارا گھر اور منزل نہیں ہے' یہاں تمہیں ہمیشہ نہیں رہنا' تم راہ چلتے مسافر ہو۔ ایک دفعہ حضور اکرم ﷺ سخت قسم کی چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے جس سے آپؐ کی پیٹھ مبارک پر نشان پڑ گئے تھے۔ کسی صحابیؓ نے عرض کیا کہ حضور (ﷺ)! آپ کے لیے آرام دہ بستر کا انتظام نہ کر لیا جائے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا: ((مَالِیْ وَمَا لِلدُّنْیَا' مَا اَنَا فِی الدُّنْیَا اِلَّا

كَرَاكِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَكَهَا))[1] ''مجھے اس دنیا سے کیا سروکار! میں تو اس دنیا میں بس اس طرح ہوں جیسے کوئی سوار (گھوڑ سوار یا اونٹنی پرسوار) کسی درخت کے سائے میں رُکتا ہے اور پھر تھوڑی دیر کے آرام کے بعد اسے چھوڑ دیتا ہے (اور اپنی اصل منزل کی طرف روانہ ہو جاتا ہے)''۔ وہ درخت اس کا گھر' وطن اور منزل نہیں ہے' وہ اسے چھوڑ کر اپنا راستہ لیتا ہے۔ چنانچہ اس دنیا کو بس اتنی سی دیر کے لیے قیام گاہ سمجھو' اس سے زیادہ نہیں۔

ایک بات اور نوٹ کیجیے کہ یہاں جو پانچویں چیز ''تَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ'' بیان کی گئی ہے' اس کی وضاحت یا تکمیل سورۃ التکاثر میں بایں الفاظ ہو رہی ہے: ﴿اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ A حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ B﴾ ''تمہیں کثرت کی محبت نے غفلت میں ڈالے رکھا یہاں تک کہ تم قبروں تک جا پہنچے''۔ یہ ایک عظیم حقیقت ہے کہ انسان کے پاس چاہے دولت کے انبار ہوں اور اتنی دولت ہو کہ کئی نسلوں کے بارے میں اطمینان ہو کہ وہ آرام سے بیٹھ کر اسے کھا سکتی ہیں' لیکن پھر بھی دولت کی بہتات کی طلب ختم نہیں ہوتی۔ صاف نظر آ رہا ہوتا ہے کہ ایک شخص قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے' لیکن دولت کی حرص ختم نہیں ہوتی۔ تو یہی وہ کیفیت ہے جسے تکاثر سے موسوم کیا گیا ہے۔

نباتاتی سائیکل اور اس کی حیاتِ انسانی سے مماثلت

حیاتِ انسانی کے متذکرہ بالا پانچ ادوار کے بعد ایک بڑی پیاری تمثیل آ رہی ہے۔ فرمایا: ﴿كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ط﴾ ''اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بارش ہوئی تو اس سے پیدا ہونے والی نباتات کو دیکھ کر کاشت کار خوش ہو گئے' پھر وہی کھیتی پک جاتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہو گئی' پھر وہ بھس بن کر رہ جاتی ہے''۔ جس طرح انسانی زندگی کا سائیکل ہے کہ بچپن ہے' پھر نوجوانی ہے' پھر پوری طاقت اور شدت کو پہنچنا ہے' اس کے بعد ادھیڑ عمر اور پھر بڑھاپا ہے' اسی طرح ایک نباتاتی سائیکل چل رہا ہے۔ ﴿كَمَثَلِ غَيْثٍ﴾ ''جیسے مثال ہے بارش کی''۔ ﴿اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ﴾ ''کاشت کاروں کو اس کی نباتات بھلی لگیں''۔ ''کفر'' کے لغوی معنی ہیں دبا دینا' چھپا دینا اور مفسرین کا تقریباً اجماع ہے کہ یہاں ''کفار'' سے مراد وہ اصطلاحی کافر نہیں ہیں جو اللہ یا اس کے رسولؐ یا آخرت یا قرآن کا انکار کریں' بلکہ یہاں کفار سے مراد کاشت کار ہیں۔ اس لیے کہ کاشت کار بھی زمین میں بیج کو دبا تا ہے کہ پھر وہاں سے کھیتی ابھرے گی اور لہلہائے گی۔ سورۃ الفتح کے اخیر میں کاشت کار کے لیے ''زُرّاع'' کا لفظ آیا ہے ﴿يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ﴾ جب بارش ہوتی ہے تو کھیتی اپنی سوئی نکالتی ہے' چھوٹی چھوٹی پتیاں نمودار ہوتی ہیں تو کاشتکار کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔

﴿ثُمَّ يَهِيْجُ﴾ ''پھر وہ کھیتی اپنی پوری قوت پر آتی ہے''۔ هَاجَ' يَهِيْجُ کسی چیز کے بھڑ کنے' برانگیختہ ہونے اور جوش مارنے کے لیے آتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے ''هَاجَ الدَّمُ'' (خون نے جوش مارا) اور ''هَاجَ الْفَحْلُ'' (نر اونٹ جوش میں آیا' بپھر گیا)۔ اسی سے باب تفعیل میں هَيَّجَ' يُهَيِّجُ' تَهْيِيْجًا آتا ہے' جس کا مطلب ہے کسی شے کو جوش دلانا۔ اور ''ہیجان'' کا لفظ تو اردو میں بھی مستعمل ہے۔ تو فرمایا جا رہا ہے کہ بارش ہوئی تھی تو اب بے آب و گیاہ مٹی میں سبزہ نمودار ہو گیا ہے۔ پھر وہ فصل لہلہاتی ہے' پوری قوت کو آتی ہے' جوش مارتی ہے۔ آگے فرمایا: ﴿فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا﴾ ''پھر تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد پڑ گئی''۔ کچھ عرصے کے بعد اب وہ فصل یا گھاس زرد پڑ جائے گی۔ بالفرض گیہوں کی فصل ہے تو شروع میں تو بڑا ہریالی کا منظر نظر آتا ہے' لیکن جب فصل پکنے پر آتی ہے تو وہ زرد پڑ جاتی ہے۔ ﴿ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ط﴾ ''پھر وہ بھس بن کر رہ جاتی ہے''۔ اب اگر فصل ہو تب بھی وہ کٹنے کے بعد بھس بن جاتی ہے اور اگر چراگاہ ہو تب بھی اس کا یہی حال ہوتا ہے۔ چراگاہیں بھی بڑے بڑے رقبوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ پورے وسطی ایشیا کے جو ہموار علاقے ہیں ان کے بڑے بڑے رقبے چراگاہوں پر مشتمل ہیں۔ یہ سطح مرتفع کی ڈھلوانیں ہوتی ہیں جن پر سب سے زیادہ قوی لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ منگولز بھی سطح مرتفع کے رہنے والے تھے۔ اسی طرح ہندوستان کے اندر جو مرہٹے

پائے جاتے ہیں وہ بھی سطح مرتفع دکن کے لوگ ہیں۔ ان کے ہاں یہی ہوتا تھا کہ بارش کے بعد سبزہ اُگ آتا تو اب ان کے جانور وہاں چرتے پھررہے ہوتے اور یہ خود گھوڑوں پر سوار ہو کر پھر رہے ہوتے۔ یہی قبائل تھے کہ جب گھوڑوں پر سوار ہو کر نکلتے تھے تو پھر دنیا میں کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا' وہ اٹیلا ہو یا چنگیز ہو۔ چنگیز کہاں سے چل کر کہاں پہنچا ہے! یہ تمام تاریخی حقائق ایچ جی ویلز نے بڑی خوبصورتی سے بیان کیے ہیں۔

بہر حال یہاں پر یہ دیکھئے کہ اس کے بعد وہ سبزہ بھی کچھ عرصہ کے بعد دھوپ کی وجہ سے جل جائے گا' زرد ہو جائے گا' پھر وہ بھرا بھرا سا ہو کر پاؤں تلے روندا جائے گا اور کچھ عرصہ کے بعد مٹی ہو کر مٹی میں مل جائے گا' اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہوگا۔ گویا وہ سبزہ' ہریالی اور تروتازگی ختم ہوئی' اور معلوم ہوا کہ وہی سبزہ اب خاک بن کر اڑ رہا ہے۔ اب وہاں پھر وہی ویرانی ہے اور ریگزار کا ایک منظر ہے۔ چونکہ قرآن مجید کے اوّلین مخاطبین عرب تھے لہٰذا یہ عرب کا پورا کا پورا پس منظر واضح ہو گیا۔ تو جیسے اس دنیا میں چند مہینوں کا نباتاتی سائیکل ہے کہ باقاعدہ بیج ڈالا' فصل تیار ہوئی' اب کٹنے کے بعد اُس کے تنکے ہوا میں اڑتے پھر رہے ہیں' بعینہٖ انسانی زندگی کا ایک سائیکل ہے۔ جس گھر میں بھی کوئی نئی ولادت ہوتی ہے' بچہ پیدا ہوتا ہے تو خوشی کے شادیانے بجائے جاتے ہیں۔ پھر وہ بچہ بڑا ہوتا ہے' پھر اس میں طاقت آتی ہے' وہ جوانی کو پہنچتا ہے' اب اس کی امنگیں ہیں' اس کے ولولے ہیں۔ اس میں تفاخر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کی ایک ڈھلوان آتی ہے۔ اب چہرے پر بھی زردی آتی ہے' چہرے پر جھریاں پڑ رہی ہیں' بال اب سیاہ نہیں رہے بلکہ سفید ہو رہے ہیں۔ آخر کار بڑھاپا آتا ہے' پھر موت آتی ہے اور وہ قبر میں اتار دیا جاتا ہے اور کچھ عرصہ کے بعد مٹی ہو کر مٹی میں مل جاتا ہے۔

نباتاتی سائیکل (Botanical Cycle) اور انسانی زندگی کا سائیکل (Human life Cycle) دونوں میں بڑی گہری مناسبت ہے' اور اس آیت کریمہ کا جو اصل معنوی حسن ہے وہ اسی میں مضمر ہے۔ یہ انسانی زندگی کے مختلف مراحل ہیں جن سے ہر کسی کو گزرنا ہے۔ یہ ہر ایک کے ساتھ ہونا ہے' بادشاہ کے ساتھ بھی ہونا ہے اور فقیر کے ساتھ بھی۔ محلوں میں رہنے والوں کے ساتھ بھی ہونا ہے اور جھونپڑیوں والوں کے ساتھ بھی۔ فقیروں اور گداگروں کی زندگی بھی بالآخر ختم ہوگی' وہ بھی مٹی میں مل کر مٹی ہوں گے اور بادشاہوں اور محلات میں رہنے والوں کی زندگی بھی ختم ہوگی اور یہ بھی مٹی میں مل کر مٹی ہو جائیں گے۔

لیکن آگے فرمایا جا رہا ہے: ﴿وَفِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ؕ﴾ ''اور آخرت میں دردناک عذاب ہے اور (یا پھر) اللہ کی رحمت اور رضامندی ہے''۔ آخرت میں دوام اور مستقل زندگی ہے۔ وہاں یا تو عذاب ہے بہت سخت اور یا پھر دوسری شکل ہے کہ اللہ کی طرف سے مغفرت اور رضا ہے۔ ﴿وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۲۰﴾﴾ ''اور دنیا کی زندگی سوائے دھوکے کے سامان کے کچھ نہیں ہے''۔ البتہ یہ حقیقت بھی آپ کے سامنے رہے کہ دنیا اس اعتبار سے تو دھوکے کا سامان ہے اگر یہ آپ کو آخرت سے غافل کر دے' لیکن اگر خوش قسمتی سے آخرت آپ کی منزل و مقصود کے طور پر مستحضر رہے تو دنیا کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے' اس لیے کہ اسی سے آخرت بنانی ہے۔ حضورﷺ نے فرمایا: ((اَلدُّنْیَا مَزْرَعَةُ الْآخِرَةِ)) ''دنیا آخرت کی کھیتی ہے''۔ یہاں بوؤ گے تو وہاں کاٹو گے۔ یہاں اگر بویا ہی کچھ نہیں تو وہاں کاٹو گے کیا! فصل کہاں سے ملے گی؟ اس اعتبار سے زندگی بہت قیمتی شے ہے۔ یہ liability نہیں ہے' بہت بڑا اثاثہ ہے' لیکن اس حوالے سے کہ اگر آخرت سامنے رہے اور مقصود و مطلوب وہی ہو۔ اور اگر اس دنیا نے انسان کو غافل کر دیا' اپنے اندر گم کر لیا تو پھر یہ دھوکے کی ٹٹی کے سوا کچھ نہیں۔ مؤمنوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ رہتے تو اس دُنیا میں ہیں' لیکن دنیا کے باسی نہیں ہیں' دنیا کے طالب نہیں ہیں' دنیا ان کے علم کا مبلغ نہیں ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ہماری منزل تو آخرت ہے' ہم وہاں جا رہے ہیں۔ یہ تو ایک عارضی سفر ہے' عارضی قیام گاہ ہے۔ اگر یہ کیفیت ہے تو دنیا کی زندگی کا ایک ایک لمحہ بہت قیمتی ہے' اس سے اگر صحیح استفادہ کیا جائے تو اسے ''امر'' بنایا جا سکتا ہے۔

مسابقت الی الجنّة کی دعوت

اب اگر یہ حقیقت واضح ہوگئی تو فرمایا: ﴿سَابِقُوۡۤا اِلٰی مَغۡفِرَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَ جَنَّۃٍ عَرۡضُہَا کَعَرۡضِ السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ ۙ﴾ ''ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے ربّ کی مغفرت اور اس کی جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین جیسی ہے''۔ ''سَابِقُوْا'' باب مفاعلہ سے ہے جس کا مطلب ہے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرنا۔ یہ لفظ اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ تم دنیا کے طالب بن جاتے ہو تو دنیا میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہو۔ ﴿تَفَاخُرٌۢ بَیۡنَکُمۡ وَ تَکَاثُرٌ فِی الۡاَمۡوَالِ وَ الۡاَوۡلَادِ ؕ﴾ والا نقشہ ہوتا ہے۔ اب اگر آخرت منزلِ مقصود بن گئی تو اس کے لیے بھی دوڑ لگاؤ۔ اس کے لیے بھی ایک دوسرے سے آگے نکلو۔ یہ نہ ہو کہ دنیا کے لیے تو تمہارے اندر جوش وخروش اور حرکت ہے، مگر آخرت کہنے کی حد تک تو مطلوب ومقصود ہے، لیکن اس کی طرف سے بڑی قناعت ہے، اس کے لیے کوئی بھاگ دوڑ اور ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش نہیں ہے۔ مسابقت کا جذبہ فطرتِ انسانی کے اندر موجود ہے۔ ایڈلر نے کہا ہے کہ ایک دوسرے پر غالب آنے کی خواہش (The urge to dominate) ایک فطری جذبہ ہے۔ انسان کے اندر مسابقت کا جذبہ موجود ہے۔ اب ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ آپ اس کے میدانِ کار کو بدل دیجیے۔ مسابقت مال ودولت میں نہ کیجیے، بلکہ خیرات میں کیجیے۔ سورۃ البقرۃ میں بھی یہ مضمون آیا ہے: ﴿وَ لِکُلٍّ وِّجۡہَۃٌ ہُوَ مُوَلِّیۡہَا فَاسۡتَبِقُوا الۡخَیۡرٰتِ ؕ﴾ ''ہر ایک شخص کا کوئی نہ کوئی ہدف مقرر ہے جس کی طرف وہ پیش قدمی کر رہا ہے، تو (اے مسلمانو!) تم نیکیوں کے لیے مسابقت کرو!'' تمہاری مسابقت اور استباق کا مرکز خیرات وحسنات، نیکیاں، بھلائیاں اور انصاف ہو۔ تم جہاد فی سبیل اللہ میں آگے سے آگے بڑھ کر سرفروشی کرو، ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرو۔ تو دین کے معاملے میں یہ مسابقت ناپسندیدہ شے نہیں ہے، بلکہ قابل تعریف ہے۔

اس مسابقت کی مثالیں ہمیں صحابہ کرامؓ میں ملتی ہیں۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر جب حضورﷺ نے فرمایا کہ دین کے لیے بڑا کڑا وقت آ گیا ہے، اب جو کچھ بھی لا سکتے ہو لاؤ، پیسے اور مال کی اشد ضرورت ہے، اس لیے کہ اسلحہ فراہم کرنا ہے، سواریوں اور زادِ راہ کا بندوبست کرنا ہے، تو اتفاقاً اُس وقت میرے پاس بہت دولت تھی۔ [''اتفاقاً'' کا لفظ میں اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ مہاجرین سب کے سب تاجر تھے اور تاجر کے پاس کبھی کبھار ہی نقد رقم موجود ہوتی ہے، ورنہ تو سارا مال تجارت میں ہی invest رہتا ہے۔] حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے سوچا کہ اس موقع پر تو میں حضرت ابوبکرؓ سے بازی لے ہی جاؤں گا۔ میں نے اپنے سارے اثاثے کے دو حصے کیے اور ایک حصہ لا کر حضورﷺ کے قدموں میں حاضر کر دیا۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ جو کچھ لائے تو حضورﷺ نے پوچھا کہ گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا ہے؟ عرض کیا کچھ نہیں چھوڑا، جو کچھ تھا لے آیا ہوں۔ ع ''صدّیقؓ کے لیے ہے خدا کا رسولؐ بس!'' تو حضرت عمرؓ فرماتے ہیں اُس روز میں نے جان لیا کہ ابوبکر صدیقؓ سے آگے بڑھنا ممکن نہیں ہے۔ نوٹ کر لیجیے یہاں پر کمیت (Quantity) کا اعتبار نہیں ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے گھر کا کُل کا کُل مال لے آئے اور حضرت عمرؓ اپنے سارے مال کا نصف لے آئے۔ یہاں یہ تفصیل زیر بحث نہیں کہ کمیت کے اعتبار سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا مال کتنا تھا اور حضرت عمرؓ کا مال کتنا تھا۔ لیکن کیفیت کے اعتبار سے حضرت صدیق اکبرؓ حضرت عمرؓ سے آگے بڑھ گئے، اس لیے کہ نصف تو بہرحال نصف ہوتا ہے، وہ کُل کے برابر تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بہرحال اس تفصیل کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ میں بھی مسابقت کا جذبہ تھا جو اس واقعہ سے ظاہر ہو رہا ہے، لیکن وہ مسابقت فی الخیرات تھی۔ لہٰذا نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اس ضمن میں نہایت سنہرا اصول یہ ہے کہ: ''دنیا کے معاملے میں اس کو دیکھا کرو جو تم سے پیچھے ہو، اور دین کے معاملے میں اس پر نگاہ رکھو جو تم سے آگے ہو''۔ اس لیے کہ دین میں اپنے سے آگے والے کو دیکھنے سے دل میں عمل کرنے اور آگے بڑھنے کا

جذبہ ابھرے گا کہ یہ آدمی اگر اتنا کچھ کر رہا ہے تو میں بھی کر سکتا ہوں' وہ بھی تو میری طرح کا انسان ہے۔ اور جو دین میں خود سے پیچھے ہے اس کو دیکھنے سے آدمی سمجھتا ہے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں بہت ہے' اس لیے کہ اس نے تو یہ بھی نہیں کیا' تو اس سے دین میں ترقی رک جائے گی۔ اس کے برعکس دنیا داری میں آگے والے کو دیکھنے سے جذبہ اُبھرے گا کہ آپ دنیا کمانے کے لیے مزید محنت کریں اور پیچھے والے کو دیکھنے سے قناعت پیدا ہوگی کہ آخر اس کا بھی تو ان آسائشات کے بغیر گزارا ہو رہا ہے' آخر وہ بھی تو اسی دنیا میں رہ رہا ہے' تو اتنی محنت کر کے یہ سب کچھ حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تو دنیا کے لیے قناعت چاہئے۔ جیسا کہ مرزا عبدالقادر بیدل کا بڑا پیارا شعر ہے ؎

حرص قانع نیست بیدلؔ ورنہ درکارِ حیات
آنچہ ما درکار داریم اکثرش درکار نیست!

یعنی اے بیدلؔ! یہ تو محض ہماری حرص ہے کہ ہمارے پاس یہ بھی ہو اور وہ بھی ہو' یہ بھی ضروری ہے اور وہ بھی ضروری ہے' ورنہ واقعہ یہ ہے کہ ہم جن چیزوں کو زندگی گزارنے کے لیے لازمی سمجھتے ہیں ان میں اکثریت ایسی چیزوں کی ہے کہ جو حقیقت میں درکار نہیں ہوتیں۔ تو دنیا میں اس کو دیکھو جو تم سے پیچھے ہے' تاکہ جو بھی تمہیں حاصل ہے اس پر قناعت پیدا ہو اور اللہ کے شکر کا جذبہ ابھرے۔ اور دین میں اس کو دیکھو جو تم سے آگے ہے' تاکہ تمہارے اندر بھی آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا ہو۔[1] تو یہاں فرمایا جا رہا ہے ''اس جنت کے حصول کے لیے دوڑ لگاؤ جس کا پھیلاؤ' جس کی پہنائی آسمان اور زمین جتنی ہے''۔ یہی مضمون سورۂ آل عمران میں ان الفاظ میں آیا ہے: ﴿وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ﴾ (آیت ۱۳۳) ''دوڑو اپنے ربّ کی مغفرت اور اس جنت کی طرف جس کا پھیلاؤ آسمانوں اور زمین کے برابر ہے''۔

ان دونوں آیات میں لفظ ''عرض'' آیا ہے' اسے اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ اردو زبان میں ہم عرض' طول کے مقابلے میں استعمال کرتے ہیں اور عرض کم ہوتا ہے اور طول زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن عربی زبان میں ''عرض'' کسی شے کی مجرد وسعت کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ایک مقام پر الفاظ آئے ہیں: ﴿ذُوْ دُعَاءٍ عَرِیْضٍ﴾ ''لمبی لمبی دعائیں کرنے والا''۔ (حٰمٓ السجدۃ:۵۱) یعنی جب انسان کو کوئی تکلیف آتی ہے تو بڑی لمبی چوڑی دعائیں مانگنا شروع کر دیتا ہے اور جب ہماری طرف سے نعمت مل جاتی ہے تو ہمیں بھول جاتا ہے' اسے یہ یاد ہی نہیں رہتا کہ کبھی وہ اپنے پروردگار کو پکارتا بھی تھا' کبھی اس سے دعائیں بھی کرتا تھا۔ تو آدمی جب احتیاج میں ہوتا ہے تو اللہ کو پکارتا ہے۔ تو یہاں عرض سے پھیلاؤ مراد ہے کہ تم جنت کا تصور کر ہی نہیں سکتے۔

قرآن مجید سائنس اور فلسفے کی اصطلاحات استعمال نہیں کرتا' بلکہ عام انسانی ذہن کی سطح کے برابر آ کر بات کرتا ہے۔ چنانچہ یہاں قرآن نے کائنات کی وسعت کے لیے بھی آسمان اور زمین کے الفاظ استعمال کیے ہیں' اس لیے کہ کائنات کے بارے میں ہمارا کل تصور یہی ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ جنت کتنی بڑی ہوگی تم اس کا تصور نہیں کر سکتے' تمہارا تو اپنا ذہن بھی بہت مختصر ہے۔ آج کے ترقی یافتہ اور سائنسی دور کے انسان کو بھی ابھی کچھ پتا نہیں کہ یہ کائنات کتنی طویل وعریض ہے' کہاں سے شروع ہو رہی ہے اور کہاں ختم ہو رہی ہے۔ ٹیلی سکوپ جتنی بڑی ہوتی جا رہی ہے کائنات بھی اتنی ہی مزید پھیلتی نظر آ رہی ہے۔ بہرحال کسی ٹیلی سکوپ نے آج تک یہ نہیں بتایا کہ اس جگہ پر کائنات ختم ہوتی ہے اور وہاں تک ہماری رسائی ہوگئی ہے۔ تو اس اعتبار سے قرآن مجید وہ الفاظ استعمال کرتا ہے جسے عرب کا عام بدو بھی سمجھ لے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿عَرْضُھَا کَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۙ﴾ کہ اس جنت کی پہنائی اور وسعت تم کیا سمجھو گے؟ بس یوں سمجھو آسمانوں اور زمین جتنی۔

دخولِ جنت کے لیے کیسا ایمان درکار ہے؟

آگے فرمایا: ﴿اُعِدَّتْ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ ۭ﴾ ''یہ تیار کی گئی ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اللہ پر اور ان کے رسولوں پر''۔ اَعَدَّ (باب افعال)

کسی شے کو اہتمام کے ساتھ تیار کرنے کو کہا جاتا ہے۔ یعنی یہ جنت فراہم کی گئی ہے‘ تیار کی گئی ہے‘ سنواری گئی ہے‘ پورے طریقے سے اس کو بنایا گیا ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر۔ اب یہاں نوٹ کر لیجیے کہ سورۃ الحدید کی اس آیت میں بھی اور انیسویں آیت میں بھی ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت کے آگے کسی شے کا اضافہ نہیں کیا گیا۔ انیسویں آیت میں سلوکِ قرآنی اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا ہے۔ فرمایا: ﴿وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖۤ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الصِّدِّیۡقُوۡنَ﴾ ’’اور جو لوگ ایمان لائے اللہ اور اس کے رسولوں پر‘ وہی صدیقین ہیں‘‘۔ اس میں نہ تو انفاق کا تذکرہ ہے‘ نہ قتال کا اور نہ ہی اعمالِ صالحہ کا۔ لیکن مراد یہ ہے کہ جب واقعتاً حقیقی معنی میں ایمان موجود ہوگا تو یہ اعمال بھی لازماً موجود ہوں گے۔ یہ گویا کہ از خود وہاں پر مندرَج ہیں‘ understood ہیں۔ اس ایمان کے ساتھ انفاق بھی ہوگا‘ جہاد بھی ہوگا‘ قتال بھی ہوگا‘ اعمالِ صالحہ بھی ہوں گے‘ نماز‘ روزہ‘ حج اور زکوٰۃ یہ سب کچھ ہوں گے۔ لہٰذا یہاں پر یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ مجرد ایمان کی بات ہو رہی ہے۔ تو یہاں مراد یہ ہے کہ یہ جنت تیار کی گئی ہے‘ اس کو آراستہ و پیراستہ کیا گیا ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر حقیقتاً ایمان رکھنے والے ہوں گے۔

محض اعمال کی بنیاد پر جنت میں داخلہ ممکن نہیں

آگے ارشاد ہے: ﴿ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ﴾ ’’یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس کو چاہے گا دے گا‘‘۔ ’’فضل‘‘ سے مراد ہے اللہ کی طرف سے بغیر استحقاق کے دی جانے والی شے۔ اس کے بالمقابل اجرت اور اجر کے الفاظ عام استعمال ہوتے ہیں جو باہم مترادفات ہیں اور ان کا مطلب ہے بدلہ‘ جو کسی محنت اور مزدوری کا نتیجہ ہوتا ہے۔ لیکن قرآن مجید میں جہاں بھی جنت کا تذکرہ آیا ہے وہاں ’’فضل‘‘ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ گویا قرآن مجید کا تصور یہی ہے کہ انسان مجرد اپنے عمل کے ذریعے سے جنت کا مستحق نہیں بن سکتا‘ جب تک کہ فضل خداوندی اس کی دستگیری نہ کرے۔ اس بارے میں ایک بڑی پیاری حدیث ہے:

عَنۡ اَبِیۡ ہُرَیۡرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُ قَالَ قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ: ((لَنۡ یُّدۡخِلَ اَحَدًا مِّنۡکُمۡ عَمَلُہُ الۡجَنَّۃَ)) قَالُوۡا : وَلَا اَنۡتَ یَا رَسُوۡلَ اللّٰہِ؟ قَالَ : ((وَلَا اَنَا اِلَّا اَنۡ یَتَغَمَّدَنِیَ اللّٰہُ مِنۡہُ بِفَضۡلٍ وَرَحۡمَۃٍ)) (۱)

حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’تم میں سے کسی کا عمل بھی اسے جنت میں داخل نہیں کر سکے گا‘‘۔ صحابہ کرام ؓ نے عرض کیا: کیا آپ کو بھی نہیں یا رسول اللہ ﷺ ؟ آپؐ نے فرمایا: ’’ہاں مجھے بھی نہیں‘ اِلّا یہ کہ مجھے اللہ اپنے فضل اور رحمت سے ڈھانپ لے‘‘۔

اللہ مجھے اپنے فضل اور رحمت سے ڈھانپ لے گا تو جنت میں میرا داخلہ ہوگا۔ یہ ایک اضافی بات ہے جو حضور ﷺ نے اپنے بارے میں بھی فرما دی‘ لیکن دراصل بات یہ سمجھانی مقصود ہے کہ کبھی بھی جنت کو اپنا استحقاق نہ سمجھئے‘ اپنی امکانی حد تک کام کر کے پھر بھی فضل خداوندی کا ہی سہارا لیجیے۔ قرآن مجید میں اہل جنت کا ترانہ نقل ہوا ہے‘ جب وہ جنت میں داخل ہوں گے تو کہیں گے: ﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ ہَدٰٮنَا لِہٰذَا وَمَا کُنَّا لِنَہۡتَدِیَ لَوۡ لَاۤ اَنۡ ہَدٰٮنَا اللّٰہُ﴾ (الاعراف:۴۳) ’’اُس اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں یہاں تک پہنچا دیا ہے‘ اور ہم یہاں نہ پہنچ پاتے اگر اللہ ہی ہمیں نہ پہنچاتا‘‘۔ تو لفظ ’’فضل‘‘ کے حوالے سے اس بات کو نوٹ کر لینا چاہیے۔ آگے فرمایا: ﴿وَاللّٰہُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ﴾ ’’اللہ بہت بڑے فضل کا مالک ہے‘‘۔

ہر مصیبت اللہ کی جانب سے ہے

اب اگلی آیات میں جو مضمون آ رہا ہے یہ اس سے پہلے سورۃ التغابن میں بڑی وضاحت سے آ چکا ہے۔ یہاں اگرچہ لفظاً زیادہ تفصیل ہے‘ لیکن وہاں کم الفاظ میں معناً یہ بات آ چکی ہے۔ اس دنیا کی زندگی میں انسان مختلف حوادث اور آفاتِ ارضی و سماوی سے بہت متاثر ہوتا ہے‘ جو بسا اوقات بڑے پیمانے پر آ جاتی ہیں۔ کبھی زلزلہ آ جاتا ہے تو ہزاروں انسان اس میں ختم ہو جاتے ہیں‘ مکانات دھنس جاتے ہیں‘ یا سیلاب آتا ہے تو بڑے پیمانے پر لوگ ڈوب جاتے ہیں‘ ان کے گھر ختم ہو جاتے ہیں اور بڑے بڑے

رقبے پر کھڑی فصلیں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں' یا انسان کے اپنے اندر بیٹھے بٹھائے اچانک کوئی بیماری جنم لے لیتی ہے جبکہ اسے اس کا کوئی خیال بھی نہیں ہوتا۔ اچانک معلوم ہوتا ہے کہ کینسر ہے یا معلوم ہوتا ہے کہ دل کی شریانیں اتنے فیصد blocked ہیں۔ بعض اوقات انسان بیٹھے بٹھائے کسی مقدمے میں پھنس جاتا ہے۔ اب ان چیزوں کی وجہ سے پریشانی ہوتی ہے۔ تو فرمایا جا رہا ہے: ﴿مَآ اَصَابَ مِنۡ مُّصِیۡبَۃٍ فِی الۡاَرۡضِ وَلَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡرَاَہَا ؕ﴾ ''نہیں نازل ہوتی کوئی نازل ہونے والی زمین میں اور نہ تمہارے اپنے نفسوں میں مگر یہ کہ وہ ایک کتاب میں درج ہے اس سے پہلے کہ ہم اسے ظاہر کریں''۔ یہاں پر لفظ ''مُصِیۡبَۃ'' کی لغوی تشریح سمجھ لیجیے! اَصَابَ' یُصِیۡبُ (آ پڑنا' نازل ہونا) سے اسم الفاعل مُصِیۡب ہے اور اس کی مؤنث مُصِیۡبَۃ ہے' جس کے معنی ہیں نازل ہونے والی شے' آ پڑنے والی شے۔ یعنی جو بھی کوئی کیفیت آپ پر یا مجھ پر وارد ہوتی ہے' چاہے وہ اچھی ہو چاہے بری ہو' چاہے تکلیف دہ ہو' چاہے مسرت بخش ہو' اُس پر اس لفظ کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ گویا جہاں تک اس لفظ کا لغوی تعلق ہے تمام حوادث' واقعات' کیفیات جو ہم پر وارد ہوتی ہیں' وہ سب کی سب اس میں شامل ہو جائیں گی' لیکن عام طور پر یہ لفظ تکلیف دہ' ناگوار اور ناپسندیدہ چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

اس آیت میں ﴿فِی الۡاَرۡضِ وَلَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ﴾ کے الفاظ لا کر مصائب کی بھی تقسیم کر دی گئی ہے۔ مصیبتیں دو قسم کی ہیں۔ یا تو سماوی یا آفاقی مصیبتیں ہیں جو زمین پر بڑے پیمانے پر نازل ہوتی ہیں یا انسان کی اپنی جانوں میں کوئی مصیبت آن پڑتی ہے' مثلاً کوئی بیماری یا کوئی اور عارضہ لاحق ہو گیا ہے' آدمی کا کوئی عضو کٹ گیا ہے یا کوئی اور حادثہ پیش آ گیا ہے۔ تو فرمایا: ﴿اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡرَاَہَا ؕ﴾ ''مگر وہ ایک کتاب میں درج ہے اس سے پہلے کہ ہم اسے ظاہر کریں'' اس کو وجود میں لائیں' اس کو خلعتِ وجود سے سرفراز کریں۔

تخلیق اور ظہورِ تخلیق کا فرق

اس سورۂ مبارکہ کے پہلے حصے میں فلسفۂ وجود سے متعلق کافی بحث ہو چکی ہے' البتہ اس آیت میں وارد لفظ ''نَّبۡرَاَ'' کے حوالے سے بات سمجھ لینی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا ایک اسم گرامی ''البارئ'' ہے' جیسے کہ سورۃ الحشر کی آخری آیت میں اسماءِ حسنیٰ بیان ہوئے: ﴿ہُوَ اللّٰہُ الۡخَالِقُ الۡبَارِئُ الۡمُصَوِّرُ لَہُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی ﴾ ''باریٔ'' کے مفہوم کو سمجھنے سے پہلے لفظ ''خالق'' کو سمجھ لینا چاہیے۔ عام طور پر جب لفظ ''خالق'' کے ساتھ لفظ ''باریٔ'' آتا ہے تو اکثر لوگوں نے اس کا یہ نقشہ پیش کیا ہے کہ خلق کہتے ہیں ذہنی طور پر کسی شے کی منصوبہ بندی اور نقشہ بندی کرنے کو اور برأ کا مطلب ہے اُس شے کو ایک ظاہری شکل عطا کر دینا۔ ہماری انسانی تخلیق میں بھی ایسے ہی ہوتا ہے۔ کوئی مصور پہلے اپنے ذہن میں ایک خاکہ بناتا ہے' پھر اسے صفحۂ قرطاس یا کینوس پر لاتا ہے۔ کوئی موجد ہے تو اس کے ذہن میں بھی پہلے اس ایجاد کا تصور آتا ہے' پھر عملاً یہ شے معرضِ وجود میں آتی ہے۔ باریٔ کے لفظ میں اصولی طور پر یہ بات موجود ہے۔ بَرَءَ ' یَبۡرَءُ کا لغوی معنی ہے کسی شے سے علیحدہ ہو جانا۔ اسی سے براءت اور تبرّأ وغیرہ الفاظ بنے ہیں جن کا یہی مطلب ہے کہ علیحدہ ہو جانا۔ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کے بارے میں بھی فلاسفہ نے یہی دو مراحل بیان کیے ہیں کہ ایک ہے کسی شے کا وجودِ علمی جو اللہ کی ہستی اور اس کے علم میں تھا' وہ شے ہمیشہ سے اللہ کے علم میں تھی' بس اس کا خارجی وجود نہیں تھا۔ اب وہ خارجی طور پر وجود میں آتی ہے تو یہ ہے بَرَءَ ' یَبۡرَءُ اور اس کے حوالے سے اللہ تعالیٰ اَلۡبَارِئُ ہے۔ جو بھی حوادث اس کائنات میں آنے والے ہیں علم خداوندی میں تو پہلے سے موجود ہیں۔ وہ ''عَالِمُ مَا کَانَ وَمَا یَکُوۡنُ'' ہے۔ جو ہوا ہے اور جو ہونا ہے سب اس کے علم میں ہے۔ تو جہاں تک کسی شے کے وجودِ علمی کا تعلق ہے تو ہر شے ہمیشہ سے اللہ کے علم میں ہے۔ جیسے اللہ کی ذات قدیم ہے ایسے ہی اس کی صفات اور اس کا علم بھی قدیم ہے۔ ہر شے کا ایک وجودِ علمی اللہ کی ذات کے ساتھ پہلے سے قائم تھا۔ اس کو کہا گیا: ﴿اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ ﴾ کتاب سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کا علم۔ تو اللہ کے علم میں

وہ شے پہلے سے موجود تھی۔ آگے الفاظ آ رہے ہیں: ﴿ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ﴾ ''اس سے پہلے کہ ہم اسے ظاہر کر دیں''۔ اب گویا کہ وہ شے وجودِ علمی سے وجودِ خارجی میں منتقل ہو رہی ہے۔

علامہ اقبال کا ایک بہت اونچا شعر ہے' البتہ اس پر بہت زیادہ قیاس نہ کیجیے گا۔ فرمایا:

بضمیرت آرمیدم تو بہ جوشِ خود نمائی
بہ کنارہ برفگندی دُرِ آبدارِ خود را!

یعنی اے اللہ! میں تو تیرے وجود کے اندر بڑے آرام سے تھا۔ یعنی علامہ اقبال جو ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے یا اس سے بھی نو مہینے پہلے ان کی والدہ محترمہ کے رحم کے اندر ان کا جو استقرارِ حمل ہوا اس سے لاکھوں کروڑوں سال پہلے بھی تو ان کا وجود اللہ کے علم میں تھا' تو اس اعتبار سے وہ کہہ رہے ہیں کہ میں تیرے وجود کے اندر یعنی تیرے علم میں بڑے آرام میں تھا۔ مجھے تو کوئی چنتا' کوئی تشویش' کوئی فکر نہیں تھی' تو نے خود ہی اپنی خلاّقی کے ظہور کے لیے مجھے اپنے وجود سے باہر کیا۔

یہاں علامہ اقبال بڑی پیاری تمثیل لائے ہیں کہ سیپی کے اندر موتی پروان چڑھ رہا ہوتا ہے' جب موتی بن جاتا ہے تو سیپی از خود کھلتی ہے اور موتی کو باہر پھینک دیتی ہے۔ گویا کہ اس کے وجود میں جو قیمتی شے پروان چڑھ رہی تھی وہ تو ظہور چاہتی ہے' اگر سیپی کے اندر ہی وہ موتی گم رہے تو ظاہر بات ہے اس کا حسن کس نے دیکھا۔ جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا! اس سیپی کے اندر اعلیٰ سے اعلیٰ اور قیمتی سے قیمتی موتی پڑا ہوا ہے تو اسے کس نے دیکھا! کون اس کے حسن کی تعریف کرے گا؟ تو سیپی خود کھلتی ہے اور اس میں سے وہ موتی باہر نکلتا ہے جس کو پھر ہمارے غوّاص (غوطہ خور) سمندر کی تہہ سے نکال لاتے ہیں۔ تو اقبال اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہیں کہ تو نے خود ہی سیپی کی طرح مجھے اپنے وجود سے باہر کیا' یعنی مجھے یہ مادی وجود عطا کیا جو اس وقت میں علامہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ولد شیخ نور محمد کے نام سے دنیا میں ہوں۔ اصل میں اقبال یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی خلاقی کے ظہور کے لیے اس کائنات کو پیدا کیا۔ تو اس پورے فلسفے کو سمجھ لینے سے لفظ بَرَءَ کے حوالے سے یہ پوری حقیقت واضح ہو جائے گی۔ بدقسمتی سے ان چیزوں پر غور کا حق ادا نہیں کیا گیا۔

﴿اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ ﴾ ''یہ چیز اللہ کے لیے بڑی آسان ہے''۔ یہ تمہیں تو بڑی مشکل بات معلوم ہوگی کہ یہ ساری چیزیں ہی کسی کے علم میں موجود ہوں' لیکن یہ اللہ کی بات ہو رہی ہے۔ تم جس طرح اللہ کے وجود اور ذات کو نہیں سمجھ سکتے اسی طرح اس کی صفات کی کیفیت اور کمیّت کو بھی نہیں جان سکتے۔ واقعہ یہ ہے کہ صفاتِ باری تعالیٰ کی کیفیت اور کمیت دونوں ہمارے احاطۂ ذہنی سے خارج ہیں۔

ہر حال میں مطلوب طرزِ عمل — تسلیم ورضا

آگے فرمایا: ﴿ لِکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ ﴾ ''تاکہ تم افسوس نہ کرو اس پر جو تمہارے ہاتھ سے جاتا رہے''۔ اللہ کی طرف سے جو حوادث سامنے آتے ہیں وہ امتحان کے لیے ہیں۔ تکلیف آ جائے تو صبر کرو' اللہ کچھ دے دے تو اس کا شکر کرو۔ فوت ہو جانا اردو میں بھی مستعمل ہے۔ یہاں فوت ہونا اس معنی میں ہے کہ کوئی موقع تھا جو ہاتھ سے نکل گیا' کوئی اور شے تھی جو آپ کے ہاتھ سے جاتی رہی' آپ کا کوئی عزیز فوت ہو گیا' آپ کا کوئی بچہ آپ کے سامنے دم توڑ رہا ہے اور آپ بہرحال اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ سورۃ الواقعۃ میں ارشاد ہوا: ﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْکُمْ وَلٰکِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ﴾ ''اور ہم تمہاری نسبت اس (فوت ہونے والے) کے زیادہ قریب ہوتے ہیں مگر تم دیکھ نہیں پاتے''۔ تمہاری نگاہوں کے سامنے سے ہم تمہارے محبوبوں کو لے جاتے ہیں اور تم کچھ نہیں کر سکتے' بس دیکھ رہے ہوتے ہو۔ تو کوئی شخص یا چیز فوت ہو جائے تو اس پر بھی افسوس نہ کیا کرو۔ اس لیے کہ وہ شے گئی کہاں ہے؟ اسی کائنات میں ہے۔ بس اس کی حالت تبدیل ہوئی ہے اور اللہ نے تمہارے امتحان کے لیے ایک صورت پیدا کر دی ہے۔ ساتھ ہی فرمایا: ﴿وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰکُمْ ﴾ ''اور جو کچھ اللہ دے دے اس پر اترایا مت کرو''۔ اس لیے کہ یہ بھی امتحان کے لیے ہی ہے' یہ بھی

بغرضِ آزمائش ہے۔ اگر اس نے تمہیں دولت دی ہے تو اس کا حساب بھی تو تمہیں دینا ہوگا۔ جس کے پاس دولت زیادہ ہے اس کا حساب بھی بہت بھاری ہو جائے گا۔ جیسے دولت مندوں کو انکم ٹیکس کی زیادہ فکر ہوتی ہے' جو شخص hand to mouth ہے اس سے انکم ٹیکس کے کسی افسر کو کیا سروکار! تو وہاں جب حساب دینا ہوگا تو پتہ چلے گا کہ ایک ایک پیسے کا حساب دینا ہے۔ اسی لیے بیلنس شیٹ جب بنتی ہے تو سرمائے کو liabilities کے کھاتے میں ڈالتے ہیں کہ تمہیں اس کا حساب دینا ہے کہ اسے کن کن مدّات میں خرچ کیا اور اس کے ذریعے کمایا کیا؟ اس حوالے سے ایک بہت پیاری حدیث ہے جس میں پانچ سوالوں کا تذکرہ ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

((لَا تَزُوْلُ قَدَمُ ابْنِ آدَمَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ مِنْ عِنْدِ رَبِّہٖ حَتّٰی یُسْاَلَ عَنْ خَمْسٍ: عَنْ عُمُرِہٖ فِیْمَ اَفْنَاہُ وَعَنْ شَبَابِہٖ فِیْمَ اَبْلَاہُ وَمَالِہٖ مِنْ اَیْنَ اکْتَسَبَہٗ وَفِیْمَ اَنْفَقَہٗ وَمَا عَمِلَ فِیْمَا عَلِمَ؟))[1]

''ابنِ آدم کے قدم قیامت کے روز اپنے ربّ کے حضور ہرگز نہیں ہل سکیں گے جب تک اس سے پانچ چیزوں کے بارے میں پوچھ نہ لیا جائے: اس کی عمر کے بارے میں کہ کن کاموں میں کھپائی' اور (خاص طور پر) اس کی جوانی کے بارے میں کہ کن کاموں میں گلائی اور اس کے مال کے بارے میں کہ کہاں سے کمایا اور کن جگہوں پر خرچ کیا' اور یہ کہ علم کے مطابق کتنا عمل کیا۔''

تو معلوم ہوا کہ جو چیز اللہ دے دے اس پر اِتراؤ مت! اور جو اللہ چھین لے اس پر غم و افسوس نہ کرو! مؤمن کی کیفیت تو وہ ہونی چاہیے جیسے سورۃ التغابن میں بیان کیا گیا ہے: ﴿مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ ط وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰہِ یَھْدِ قَلْبَہٗ ط﴾ ''نہیں آن پڑتی کوئی مصیبت مگر اللہ کے حکم سے' اور جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے اللہ اس کے دل کو ہدایت دے دیتا ہے۔'' یعنی تسلیم و رضا کی ہدایت کہ اللہ کی مرضی یہی تھی' اللہ کا فیصلہ یہی تھا۔ مؤمن مطمئن رہتا ہے کہ اسی میں میرے لیے خیر ہوگا' چاہے وہ خیر مجھے نظر آئے یا نہ آئے!

زیرِ نظر آیات میں بتایا جا رہا ہے کہ تکالیف و مصائب انسانی زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ انسان اگر کسی جدوجہد میں حصہ لیے بغیر Passive زندگی بسر کر رہا ہو تب بھی ان سے سابقہ پیش آ سکتا ہے۔ آدمی کو ہارٹ اٹیک ہو سکتا ہے' کینسر ہو سکتا ہے' کوئی اور مصیبت آ سکتی ہے' کوئی حادثہ ہو سکتا ہے' اور اس طرح اس کی جان جا سکتی ہے۔ یہ جان تو ہر حال میں جانی ہی ہے اور مصیبتوں سے بچنے کی یہاں پر کسی کے پاس کوئی ضمانت نہیں ہے' تو کیوں نہ انسان کسی اعلیٰ تر نصب العین کے لیے اپنی زندگی actively کھپائے اور اس کے لیے فی الواقع خطرات کا رسک لے۔ تو یہ تین آیتیں (۲۲ تا ۲۴) مضمون کے اعتبار سے ماقبل دو آیتوں کے ساتھ بھی ملتی ہیں اور اپنے بعد آنے والی آیت ۲۵ کے ساتھ بھی مربوط ہیں۔

اس حوالے سے ان آیات پر دوبارہ غور کر لیجیے' اگرچہ ہم ان کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ فرمایا: ﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ﴾ ''نہیں پڑتی کوئی پڑنے والی (کوئی مصیبت' کوئی بھی ناگوار یا تکلیف دہ صورت حال)' نہ زمین میں (کسی بڑے پیمانے پر) نہ ذاتی اعتبار سے تمہاری جانوں میں' ﴿اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَھَا ط﴾ ''مگر یہ کہ وہ ایک کتاب میں درج ہے اس سے پہلے کہ ہم اسے ظاہر کریں''۔ کتاب سے مراد اللہ کا علم قدیم ہے۔ اللہ کے علم میں پہلے سے معین ہے کہ یہ ہونا ہے۔ اس کے حوالے سے میں عرض کر چکا ہوں کہ اللہ کے علم قدیم میں ہر شے پہلے سے موجود تھی' یہ وجودِ علمی ہے۔ جب وہ شے ظاہر ہوتی ہے' خارج میں آ جاتی ہے تو وہ گویا اس کا وجود ہے جس کو ہم مادی یا عملی وجود کہتے ہیں: ﴿اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ ﴾ ''یقیناً اللہ کے لیے تو یہ بات بڑی آسان ہے''۔

اب اس کا نتیجہ کیا نکلنا چاہیے؟ ﴿لِّکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ﴾ ''تاکہ تم افسوس نہ کرو اس پر جو تمہارے ہاتھ سے جاتا رہے''۔ ''لَا تَاْسَوْا'' أَسِیَ یَأْسَی (افسوس کرنا' غمگین ہونا) سے فعل نہی ہے۔ سورۃ التغابن کے درس میں میں نے بڑی وضاحت کے ساتھ عرض کیا ہے کہ ایک تو طبعی اثر ہوتا ہے۔ کسی چیونٹی کے کاٹنے پر آپ

کے ہاتھ میں جنبش ہوئی اور آپ نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا کہ یہ کیا ہوا' یہ reflex action ہے۔ اس درجے میں انسان پر کسی شے کا کوئی فوری ردِعمل طاری ہو جائے تو یہ بات تسلیم و رضا کے منافی نہیں ہے۔ جیسے کہ آنحضورﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیمؓ جب عالم نزع میں تھے تو آپؐ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس پر بعض صحابہ کرامؓ نے سوال بھی کیا کہ حضور آپ کی آنکھوں میں آنسو؟ آپؐ نے فرمایا: یہ تو اللہ تعالیٰ کی اُس رحمت کا ظہور ہے جو اُس نے انسان کے دل میں رکھی ہوئی ہے' لیکن ہم کہیں گے وہی کچھ جو اللہ کو پسند ہے' ہم اس کی رضا پر راضی ہیں۔ یہ تسلیم و رضا کا مقام ہے' یعنی راضی برضائے رب رہنا۔ کوئی شکوہ اور شکایت کا کلمہ زبان پر نہ آئے۔

رضائے حق پہ راضی رہ' یہ حرفِ آرزو کیسا؟
خدا مالک' خدا خالق' خدا کا حکم' تو کیسا!!

علامہ اقبال اس مقامِ رضا کے بارے میں کہتے ہیں۔

بروں کشید ز پیچاکِ ہست و بود مرا
چہ عقدہ ہا کہ مقامِ رضا کشود مرا!

اللہ کی رضا پر راضی رہنے کا معاملہ درحقیقت ایمان کے ثمرات میں سے چوٹی کا ثمرہ ہے۔ اگر کوئی تکلیف آئی ہے تو اس کا طبعی اثر تو یقیناً ہو گا' لیکن اس سے زیادہ آپ کے اعصاب پر اور آپ کے احساسات پر اس کی چھاپ نہ پڑنے پائے۔ آپ کا طرزِ عمل یہ ہو کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اس سے یقیناً اللہ کو کوئی نہ کوئی خیر ہی منظور ہو گا۔ ہم short sighted ہیں' ہم نہیں دیکھ سکتے۔ دعائے استخارہ میں رسول اللہﷺ نے ہمیں یہ الفاظ سکھائے ہیں: فَاِنَّکَ تَعْلَمُ وَلَا اَعْلَمُ ''یقیناً تو جانتا ہے اور میں نہیں جانتا' وَتَقْدِرُ وَلَا اَقْدِرُ ''تجھے ہر شے کی قدرت حاصل ہے' مجھے قدرت حاصل نہیں ہے''۔ جو بھی تیرا فیصلہ ہے میں اس پر راضی ہوں ع ''ہر کہ ساقیٔ ما ریخت عین الطاف است!'' جو بھی کچھ میرے ساقی نے میرے پیالے میں ڈال دیا ہے وہ عین اس کا لطف وکرم ہے۔ اس کو انسان صبر و شکر کے ساتھ قبول کرے۔

نزولِ مصیبت کے وقت ﴿لِکَیۡلَا تَاۡسَوۡا عَلٰی مَا فَاتَکُمۡ﴾ ''جو چیز ہاتھ سے جاتی رہے اس پر افسوس نہ کیا کرو'' کی تلقین کے ساتھ ہی یہ ہدایت بھی دے دی گئی: ﴿وَلَا تَفۡرَحُوۡا بِمَاۤ اٰتٰىکُمۡ﴾ ''اور جو کچھ اللہ تمہیں عطا فرمائے اس پر پھول نہ جایا کرو''۔ ''فرح'' کہتے ہیں خوشی سے پھولے نہ سمانا۔ ایک ہے طبعی خوشی ہونا۔ کوئی ایسی بات ہوئی ہے جو آپ کے جی کو پسند ہے' اس پر فوری طور پر ایک خوشی کا اظہار ہو جانا' یہ بھی تسلیم و رضا کے منافی نہیں ہو گا۔ لیکن اس سے انسان اس حد تک تاثر لے لے کہ خوشی سے پھولا نہ سمائے اور اس پر اتراتا پھرے تو یہ معاملہ درحقیقت فرح ہے' جس سے روکا گیا ہے۔ ''فرح'' کے لفظ کے اندر ہی یہ چیز موجود ہے جیسے کوئی چیز پھٹ رہی ہو ''فَرج'' کہتے ہیں سوراخ' رخنے یا خلاء کو' یعنی کوئی ٹوٹ پھوٹ ہو۔ اسی طرح ''فرق'' کاٹنے والی اور علیحدہ کر دینے والی شے کو کہا جاتا ہے۔ عربی میں جو مادّے لفظی طور پر بہت قریب ہوں وہ مفہوم کے اعتبار سے بھی قریب ہوتے ہیں۔ تو فرح کہتے ہیں خوشی سے آپے میں نہ رہنا' پھولے نہ سمانا۔

اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ کردار

﴿وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخۡتَالٍ فَخُوۡرِۣ﴾ ''اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ اکڑنے والوں کو اور شیخی خوروں کو پسند نہیں کرتا''۔ ''لَا یُحِبُّ'' اگرچہ نرم الفاظ ہیں لیکن اصل میں مراد یہ ہے کہ ایسے لوگ اللہ کو بہت ناپسند ہیں۔ یہ قرآن کا اپنا ایک اسلوب ہے کہ کسی شے کی نفی بسا اوقات سادہ انداز میں ہوتی ہے اور بسا اوقات اس کے اندر ایک زور (emphasis) ہوتا ہے۔ مُختال کا لفظ خَیل سے بنا ہے' جس کا مطلب ہے اعلیٰ نسل کا گھوڑا۔ گھوڑے کی چال کے اندر ایک تمکنت ہوتی ہے۔ جتنی اعلیٰ نسل کا گھوڑا ہو گا اس کی چال میں تمکنت اتنی زیادہ ہو گی۔ تو ''اِختَیال'' کا لفظ وہاں سے لیا گیا ہے۔ آدمی کی چال ڈھال سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ اپنے آپ کو کچھ سمجھتا ہے' یہ کسی زعم میں ہے' اونچی ہواؤں میں ہے' اس کو کوئی غرور ہے۔ تو یہ اختیال ہے۔ اور فخر وہی

لفظ ہے جو ہم پہلے پڑھ چکے ہیں کہ ''تَفَاخُرٌ بَیْنَکُمْ'' ۔ یہ فخر کرنا نسل پر ہے' حسب و نسب پر ہے' مال پر ہے' علم پر ہے' زہد وتقویٰ پر ہے۔ پھر اس کو بیان کرتے رہنا' اس کا اظہار کرنا' اللہ کو یہ چیزیں بالکل پسند نہیں ہیں۔

﴿الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَیَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ط﴾ ''جو خود بھی بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی بخل کا مشورہ دیتے ہیں'' ۔ یہ آیت دراصل اس طرزِ عمل اور اس ذہنیت کا منطقی نتیجہ بیان کر رہی ہے۔ اگر دنیا میں انسان کو نعمتیں ملی ہیں تو ان پر فرح' پھر اختیال اور اس کے بعد فخر' یہ تینوں چیزیں درحقیقت اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ انسان کی نظروں میں اصل قدر و قیمت اس دنیا کے مال واسباب کی ہے۔ تب ہی تو وہ اس پر فخر کر رہا ہے۔ سورۃ الھمزہ میں ایک برے کردار کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے: ﴿الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۙ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ۚ﴾ ''جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھا۔ وہ یہ گمان کرتا ہے کہ اس کا مال اسے دوام عطا کردے''۔ مال و دولت پر جو یہ دار ومدار اور انحصار ہے تو ظاہر بات ہے کہ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ میرا سرمایۂ افتخار میری دولت ہے تو وہ اس دولت کو سنبھال کر رکھے گا' خرچ نہیں کرے گا۔ اس لیے کہ اسی سے تو وہ لوگوں کے اوپر رعب جھاڑ رہا ہے' اسی سے تو اس کی عزت ہے۔ ہمارے اس معاشرے میں خاص طور پر یہ لعنت انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ امیر غریب کا فرق تو پہلے بھی ہوتا تھا۔ دولت مند بھی تھے اور غریب بھی ہوتے تھے' لیکن عزت کی بنیاد دولت نہیں بلکہ کردار تھا۔ مسلمان معاشرے کے اندر وہ کیفیت ہوتی تھی کہ ایک فقیر اور درویش جو کہیں بیٹھا ہوتا تھا لوگوں کا رجوع اس کی طرف ہوتا تھا۔ اسی طرح علماء کی طرف رجوع ہوتا تھا۔ ہارون الرشید کی محبوب ملکہ زبیدہ نے حج کے موقع پر ایک بہت بڑی دینی شخصیت (جو غالباً اہل بیت میں سے تھے) کی طرف لوگوں کا التفات دیکھ کر ہارون الرشید سے کہا تھا کہ اصل حکومت تو ان کی ہے جو دلوں پر حکومت کر رہے ہیں' تمہاری حکومت تو محض لوگوں کے جسموں پر ہے۔

یہ اَقدار (values) جس معاشرے کے اندر موجود ہوں تو چاہے وہاں کچھ اونچ نیچ بھی ہو' اخلاق کا دیوالہ اس طرح سے نہیں نکلتا جیسے کہ ہمارے معاشرے میں نکل گیا ہے۔ ہمارے ہاں یہ جانتے ہوئے بھی کہ فلاں کے پاس حرام کی دولت ہے' ہیروئن کی کمائی ہے' رشوت کا پیسہ ہے یا سود خوری کا معاملہ ہے' جس کے پاس دولت ہے اس کے لیے عزت ہے۔ اس کے سامنے لوگ جھکے جارہے ہیں' بچھے جارہے ہیں اور اچھے اچھے لوگوں کا طرزِ عمل یہی ہے تو اس سے درحقیقت معلوم ہوا کہ ہمارے ہاں اخلاق کا دیوالہ نکل گیا' اقدار (values) کا بیڑا غرق ہو گیا۔ تو یہاں ﴿الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ﴾ کے الفاظ میں دراصل یہ بات بیان ہو رہی ہے کہ چونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ عزت کی بنیاد پیسہ ہے لہٰذا وہ بخل کرتے ہیں اور پیسے کو سینت سینت کر رکھتے ہیں۔ وہ اگر پیسہ خرچ کریں گے تو گویا اپنی عزت اور فخر کی بنیاد کو ڈھائیں گے۔

اس کے ساتھ ہی دوسری بات یہ کہ ﴿وَیَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ﴾ ''اور وہ دوسروں کو بھی بخل کرنے پر اکساتے ہیں''۔ جو شخص خود بخل کرے گا وہ دوسروں کو بھی بخل کا مشورہ دے گا۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ایک تو بہرحال لوگوں کی نگاہ میں وہ اپنا بھی تو کوئی بھرم قائم رکھنا چاہتا ہے اور اپنے طرزِ عمل کے لیے Justification چاہتا ہے۔ ''امر'' کا لفظ یہاں حکم کے معنی میں نہیں' بلکہ مشورہ کے معنی میں آیا ہے۔ دوسروں کو بخل کا مشورہ دینے کا انداز یہ ہوتا ہے کہ بھائی کچھ عقل کے ناخن لو' کچھ سوچو' تم نے تو اپنے دونوں ہاتھ کھلے رکھے ہوئے ہیں' تمہارے ہاتھ میں تو معلوم ہوتا ہے کوئی سوراخ ہے کہ کوئی شے تمہارے پاس رکتی ہی نہیں ہے۔ تمہیں چاہیے کہ کچھ آگے کی فکر کرو' بچوں کی فکر کرو' بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرنے ہیں' بچوں کے لیے جائیداد بنانی ہے۔ تو بڑے ہی ناصحانہ اور خیر خواہانہ انداز میں بخل کا مشورہ دیا جاتا ہے تاکہ ہمارا بخل بھی ڈھکا چھپا رہے۔

بخل اور نفاق میں مشابہت کا ایک پہلو

یہ بالکل وہی نفسیاتی بات ہے جو میں حقیقت نفاق کے ضمن میں بارہا بیان کر چکا ہوں کہ نفاق جب اپنی تیسری منزل کو پہنچتا ہے تو پھر ان مؤمنین صادقین سے بغض

اور دشمنی ہو جاتی ہے جو دیوانہ وار جان و مال کھپا رہے ہوتے ہیں۔ منافقین یہ سوچتے ہیں کہ ان کے اس دیوانہ وار اپنی جان و مال کی بازی لگانے سے ہماری بزدلی اور ہمارا بخل نمایاں ہو رہا ہے۔ اگر پکار آتی اور سب بیٹھے رہتے، کوئی بھی جنبش نہ کرتا تو سب برابر تھے۔ سیرتِ طیبہ میں ایک موقع پر ایسا بھی ہوا ہے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب حضورﷺ نے فرمایا کہ اب صلح ہو گئی ہے، اس کی شرائط طے ہو گئی ہیں، اب اٹھو اور یہیں پر قربانیاں دے دو اور احرام کھول دو تو صحابہ کرامؓ میں سے کوئی ایک بھی نہیں اٹھا۔ یہ تاریخ کا ایک عجیب واقعہ ہے اور میرے لیے تو تاحال ایک عقدہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی بھی صراحت نہیں ہے کہ وہ بھی اٹھے ہوں۔ کوئی بھی اپنی جگہ سے نہیں اٹھا تو آپؐ دل گرفتہ اور رنجیدہ ہو کر اپنے خیمے میں چلے گئے۔ وہاں حضرت اُمّ سلمہ k ساتھ تھیں جو بہت مدبر خاتون تھیں۔ حضورﷺ نے ان سے جا کر کہا کہ میں نے مسلمانوں سے تین دفعہ کہا ہے کہ اب اٹھو، احرام کھول دو اور قربانی دے دو، لیکن کوئی نہیں اٹھ رہا۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ آپؐ انہیں کچھ نہ کہئے، بس آپ قربانی دے دیجیے اور اپنا احرام کھول دیجیے۔ جب آپؐ نے باہر آ کر یہ کام کیا تو سب کھڑے ہو گئے اور آپﷺ کی اتباع میں قربانی کے جانور ذبح کرنے لگے اور احرام کھولنے لگے۔ میری تاویل یہ ہے کہ وہ کچھ حالت منتظرہ میں تھے کہ شاید ابھی کوئی نئی صورت پیدا ہو جائے، شاید اللہ ابھی ہمارا امتحان ہی لے رہا ہو! اس لیے ایک عجیب سی حالت منتظرہ طاری ہو گئی تھی کہ کوئی بھی نہیں اٹھا۔ لیکن اِس وقت یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ جب کوئی نہیں اٹھا تو سب برابر ہو گئے۔ اگر کچھ لوگ اٹھ جاتے اور کچھ بیٹھے رہ جاتے تو جو اٹھ گئے ہوتے اُن کا ایک مرتبہ واضح ہو جاتا کہ یہ نبیﷺ کی پکار پر فوراً لبیک کہنے والے ہیں اور جو بیٹھے رہ گئے وہ گویا کہ تربّص و انتظار میں ہیں۔

منافقین کو یہی غصہ آتا تھا کہ جب اللہ کی راہ میں نکلنے کا حکم آتا ہے، ﴿اِنۡفِرُوۡا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا﴾ کی پکار آتی ہے تو یہ بےخوف و خطر نکل پڑتے ہیں۔ یہ کچھ سوچتے ہی نہیں، اپنا نفع و نقصان دیکھتے ہی نہیں، کوئی اندیشے، کوئی خطرات ان کے پاؤں کی بیڑی نہیں بنتے۔ موسم کو نہیں دیکھ رہے کہ شدید ترین گرمی کا موسم ہے۔ یہ نہیں دیکھ رہے کہ شیر کے منہ میں جا رہے ہیں، سلطنت روما کے ساتھ ٹکر لے رہے ہیں ع ''بازی بازی با ریش بابا ہم بازی!'' غزوۂ تبوک سے پہلے جو بھی جنگیں ہوئی تھیں وہ اندرونِ ملک عرب ہوئی تھیں، لیکن اب سلطنت روما کے ساتھ ٹکراؤ تھا جس کی لاکھوں کی Standing Armies تھیں۔ اور غزوۂ موتہ کے اندر بھی یہی ہوا کہ تین ہزار گئے تھے جن کا ایک لاکھ سے ٹکراؤ ہو گیا جبکہ ایک لاکھ فوج مزید موجود تھی۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ دو لاکھ کے ساتھ ٹکراؤ ہوا تھا۔ بہرحال غزوۂ تبوک کے موقع پر جب نفیر عام آئی تو جن میں ایمان صادق تھا وہ نکل کھڑے ہوئے اور منافقین کا نفاق ظاہر ہو گیا۔ تو دراصل یہ حقیقت ہے کہ جو شخص خود بخل کرتا ہے وہ دوسروں کو بھی بخل کا مشورہ دے گا۔ جو خود آگے نہیں بڑھنا چاہتا وہ دوسروں کو بھی نہ صرف آگے بڑھنے کا مشورہ نہیں دے گا بلکہ انہیں آگے بڑھنے سے روکے گا۔ سورۃ الاحزاب میں جنگ کے کام میں رکاوٹیں ڈالنے والے منافقین (اَلۡمُعَوِّقِیۡنَ) کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ ﴿هَلُمَّ اِلَیۡنَا﴾ ''آؤ ہمارے پاس!'' بس یہیں پر بیٹھے رہو! کہاں جا رہے ہو؟ کیوں خطرات مول لیتے ہو؟ تو یہ ہے وہ بات کہ وہ خود بھی بخل سے کام لیتے ہیں اور لوگوں کو بھی بخل ہی کا مشورہ دیتے ہیں۔

اللہ غنی اور حمید ہے

﴿وَمَنۡ یَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡغَنِیُّ الۡحَمِیۡدُ﴾ ''اور جو کوئی پیٹھ دکھائے گا (روگردانی کرے گا، یہ سب کچھ سن کر بھی نہ انفاق پر آمادہ ہو گا نہ جہاد کے لیے تیار ہو گا) تو (وہ سن رکھے کہ) اللہ بے نیاز اور ستودہ صفات ہے''۔ وہ غنی ہے، اسے کسی کی احتیاج نہیں ہے، کوئی یہ نہ سمجھے کہ وہ شریک نہیں ہو گا تو یہ کام نہیں ہو گا۔ اسے کسی کی حمد و ثنا کی بھی کوئی احتیاج نہیں ہے، وہ اپنی ذات میں خود محمود ہے۔ اللہ تو غنی اور حمید ہے۔

اگر تم نہیں آؤ گے تو اللہ کسی اور قوم کو لے آئے گا۔ ﴿اِنۡ تَتَوَلَّوۡا یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ ثُمَّ لَا یَکُوۡنُوۡۤا اَمۡثَالَکُمۡ ﴿۳۸﴾﴾ اس آیت پر سورۂ محمدؐ ختم ہوتی ہے۔ ”اگر تم روگردانی کرو گے‘ پیٹھ دکھاؤ گے تو اللہ تمہیں ہٹا کر کسی اور قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے“۔ اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں کمی نہیں ہے۔

تو یہاں وہ پانچ آیات مکمل ہو گئیں جن کو میں نے قبل ازیں ایک حصہ قرار دیا تھا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تیسرے رکوع کی پہلی دو آیات (۲۰‘۲۱) کو ایک مستقل حصہ مانا جائے‘ جن میں حیاتِ دنیوی کے ناگزیر مراحل‘ حیاتِ دنیوی کی اصل حقیقت‘ انسانی زندگی کے سائیکل کی نباتاتی سائیکل سے مشابہت و مماثلت اور آخرت کی اصل اہمیت بیان کرنے کے بعد مسابقت الی الجنت کی دعوت دی گئی۔ وہ اپنی جگہ ایک مکمل مضمون تھا۔ اس کے بعد ان تین آیات میں یہ مضمون آ گیا کہ دنیوی مصائب و مشکلات اور تکالیف سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب!
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے!

اس منتخب نصاب کے حصہ پنجم میں سورۂ آل عمران کی آیات کے درس میں یہ بحث آ چکی ہے کہ یہ مشکلات و مصائب اور آزمائشیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس لیے آتی ہیں کہ ایک تو تمہارے اندر اگر کہیں کوئی کھوٹ ہے تو وہ ڈھل جائے‘ تم پاک و صاف ہو جاؤ اور اللہ تعالیٰ تمہیں پورے طریقے سے زرِ خالص بنا دے۔ ﴿وَلِیُمَحِّصَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا﴾ (آل عمران:۱۴۱) ”اور تاکہ اللہ اہل ایمان کو بالکل پاک و صاف کر دے“۔ پھر یہ کہ تمہارے جوہر اسی سے نمایاں ہوں گے۔ معلوم ہو جائے گا کہ Who is Who? کس کے اندر کتنا جذبہ اور شوق جہاد تھا‘ کس کے اندر کتنا جذبۂ انفاق تھا! اس کے بغیر کیسے معلوم ہوتا کہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ اور حضرت عمر فاروق ؓ کا مقام کیا ہے۔ انہی آزمائشوں سے ان کے جوہر کھلے ہیں‘ نکھرے ہیں‘ نمایاں ہوئے ہیں۔

باب ہفتم

مشتمل بر

سورۃ الحدید کی آیت ۲۵

قرآن حکیم کی عظیم ترین ”انقلابی“ آیت

اِرسالِ رُسل اور اِنزالِ کتاب و میزان کی غرض و غایت:

قیامِ عدل و قِسط

☆

اور اس کے لیے ضرورت پڑنے پر

لوہے کی طاقت یعنی اسلحہ کے استعمال کے ذریعے

اللہ اور اُس کے رسولوں کی نصرت!

اعوذ باللہ من الشّیطٰن الرَّجیم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ وَ اَنۡزَلۡنَا مَعَہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡمِیۡزَانَ لِیَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ ۚ وَ اَنۡزَلۡنَا الۡحَدِیۡدَ فِیۡہِ بَاۡسٌ شَدِیۡدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ لِیَعۡلَمَ اللّٰہُ مَنۡ یَّنۡصُرُہٗ وَ رُسُلَہٗ بِالۡغَیۡبِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیۡزٌ ﴿۲۵﴾

اب اس سورۂ مبارکہ کی آیت ۲۵ زیر مطالعہ آئے گی جسے میں ایک مستقل حصہ قرار دے رہا ہوں اور یہ درحقیقت اس پوری سورۂ مبارکہ کا نقطۂ عروج ہے۔ انقلاب جس شے کا نام ہے اس کی connotation کو آپ اچھی طرح سمجھ لیجیے! انقلاب کہتے ہیں کسی اجتماعی نظام کو بدل دینا۔ ظاہر بات ہے کہ جو رائج الوقت Politico-Socio-Economic System ہے اس کو تلپٹ کریں گے' اس کا تختہ الٹیں گے تو کوئی اور نظام آئے گا۔ اس کے بغیر کسی دوسرے نظام کے لیے Existing System جگہ چھوڑنے کو تیار نہیں ہو گا۔ انقلابی عمل میں وعظ' نصیحت' تلقین' تعلیم' تبلیغ' یہ سب اپنی جگہ پر بہت ضروری ہیں' اس کا نقطۂ آغاز یہی ہے' لیکن اس کے بعد ایک مرحلہ آتا ہے جہاں طاقت استعمال کرنی پڑتی ہے۔ اس لیے کہ تلقین و تعلیم' وعظ و نصیحت اور دعوت و تبلیغ کے نتیجے میں تمام طبقات سے نیک سرشت لوگ تو بلاشبہ کھنچ آئیں گے' جیسے کہ مقناطیس لوہ چون کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے' اور برادہ باقی رہ جائے گا۔ لیکن یہ ''برادہ'' وہ لوگ ہیں جن کے رائج الوقت نظام کے ساتھ مفادات وابستہ ہیں۔ ہمارے معاشرے میں جاگیردار کا ایک اپنا مقام ہے' وہ پورے علاقے کا مالک اور بادشاہ سمجھا جاتا ہے اور وہاں پر بسنے والے باقی لوگ اس کے کمّی کاری ہیں' وہ اس کی رعیت شمار ہوتے ہیں۔ چنانچہ جاگیردار کبھی بھی اس کو برداشت نہیں کر سکتے کہ جاگیردارانہ نظام ختم ہو جائے۔ اس کے لیے ظاہر بات ہے کہ بالآخر طاقت کا استعمال ناگزیر ہے۔ دراصل یہ بات کہتے ہوئے انسان جھجکتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ قتل و خون ریزی اور غارت گری کوئی اچھی بات نہیں ہے' طاقت اور اسلحہ کا استعمال کوئی مستحسن کام نہیں ہے' بس ٹھنڈی ٹھنڈی بات ہو جائے' اور بڑی ہی آسانی کے ساتھ صرف دعوت و تبلیغ سے کوئی انقلاب آ جائے تو بہت اچھا ہے۔ لیکن قرآن مجید نے اس آیت مبارکہ میں اس تلخ حقیقت کو بالکل عریاں انداز میں بیان کر دیا ہے' تاکہ کوئی اشتباہ نہ رہ جائے' بات بالکل واضح ہو جائے۔ پورا انقلابی عمل آپ کو اس ایک آیت کے اندر مل جائے گا۔

سورۃ الصّف کے مضامین کا اجمالی تجزیہ

اس آیہ مبارکہ کے ایک ایک لفظ پر غور کرنے سے قبل یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ سورۃ الصّف کی چودہ آیات درحقیقت اس ایک آیت کی شرح اور تفصیل پر مشتمل ہیں۔ سورۃ الصّف چونکہ ہم پڑھ چکے ہیں لہٰذا اس کے مضامین کو ذہن میں تازہ کیجیے۔ اس کے شروع میں ڈانٹ ڈپٹ آئی ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ B كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ X اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ Δ﴾

''اے اہل ایمان! تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ طرزِ عمل سخت ناپسندیدہ (اور اللہ کے غضب کو بھڑکانے والا) ہے کہ تم وہ بات کہو جو کرتے نہیں۔ اللہ کو تو محبوب ہیں وہ بندے جو اس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر جنگ کرتے ہیں گویا وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔''

اس سورت کا آغاز ہی قتال سے ہوا ہے۔ پھر چند آیات میں اہل کتاب کا تذکرہ آیا ہے۔ یہ گویا سورۂ حدید کے ان الفاظِ مبارکہ کی شرح ہوئی: ﴿وَلَا یَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَیْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ چنانچہ وہاں وضاحت آ گئی کہ انہوں نے حضرت موسٰیؑ کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا تھا، حضرت عیسیٰ d کے ساتھ انہوں نے کیا کیا، اور جب محمد رسول اللہ ﷺ نے انہیں اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے کس طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا۔ اس کے بعد آیت آ گئی:

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ I﴾

''وہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ اور دین حق دے کر تاکہ غالب کرے اسے کل کے کل دین پر۔ (پورے نظام زندگی پر یا تمام ادیان پر) چاہے یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار اور ناپسند ہو''۔

ان کی ناگواری کے علی الرغم یہ کرنا ہے! لیکن کریں گے کیسے؟ اہل ایمان میدان میں آئیں گے اور اُنہیں اپنی جانوں کا نذرانہ دینا ہوگا۔ فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ط ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ K﴾

''اے اہل ایمان! کیا میں ایسی تجارت کی طرف تمہاری رہنمائی کروں جو تمہیں دردناک عذاب سے بچا لے؟'' پختہ ایمان رکھو اللہ پر اور اس کے رسول پر، اور جہاد کرو اس کی راہ میں اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم جانتے ہو''۔

اگلی دو آیات میں پھر اس بہتری کی وضاحت کی گئی۔ ایک تو اللہ کے جو اخروی وعدے ہیں وہ بیان کر دیئے گئے:

﴿یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَیُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ط ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۸﴾

''وہ تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور تمہیں ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے دامن میں ندیاں رواں ہوں گی، اور ابدی قیام کی جنتوں میں تمہیں بہترین گھر عطا فرمائے گا۔ یہ ہے بڑی کامیابی''۔

اصل کامیابی تو یقیناً وہی ہے، اس لیے کہ مقصودِ اصلی تو آخرت ہے، اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے، البتہ ایک اضافی وعدہ یہ بھی ہے:

﴿وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا ط نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ ط وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ M﴾

''اور وہ دوسری چیز جو تمہیں محبوب ہے (وہ بھی تمہیں دے گا) اللہ کی طرف سے نصرت اور قریب ہی میں حاصل ہو جانے والی فتح۔ اے نبیؐ! اہل ایمان کو بشارت دے دیجئے!''

آخری آیت میں اللہ کی نصرت کی پکار ان الفاظ میں آئی:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ

لِلۡحَوَارِیّٖنَ مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ قَالَ الۡحَوَارِیُّوۡنَ نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰہِ ؕ﴾

''اے اہلِ ایمان! اللہ کے مددگار بنو' جیسا کہ عیسٰی ابن مریم (علیہما السلام) نے حواریوں سے خطاب کر کے کہا تھا کہ کون ہے میرا مددگار اللہ کی راہ میں؟ (جواب میں) حواریوں نے کہا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار!''

رسولوں کے ساتھ بھیجی گئی تین چیزیں

اب ہم اس آیہ مبارکہ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ فرمایا: ﴿لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ وَ اَنۡزَلۡنَا مَعَہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡمِیۡزَانَ﴾ ''ہم نے ہی بھیجا اپنے رسولوں کو بیّنات کے ساتھ اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی''۔ سورۃ الصّف کی آیت ۹ ﴿ہُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡہُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ﴾ اور سورۃ الحدید کی زیرِ مطالعہ آیت میں اسلوب کا یہ فرق ہے کہ وہاں واحد کے صیغے میں' تعین کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا مقصد بیان ہو رہا ہے' جبکہ یہاں اللہ تعالیٰ کا عمومی قانون اجتماعی طور پر تمام رسولوں کے بارے میں بیان ہو رہا ہے۔ یہاں ایک رسول کی بات نہیں ہو رہی ہے' بلکہ یہ ایک قاعدہ کلیہ اور قانون ہے۔ ﴿لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا﴾ ''ہم ہی نے بھیجا اپنے رسولوں کو''۔

اب یہاں تین چیزیں بیان کی گئی ہیں جو رسولوں کے ساتھ بھیجی گئیں: ﴿بِالۡبَیِّنٰتِ وَ اَنۡزَلۡنَا مَعَہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡمِیۡزَانَ﴾ یعنی ہم نے اپنے رسولوں کو یہ تین چیزیں دے کر بھیجا: (۱) بیّنات (۲) کتاب' اور (۳) میزان۔ ان میں سب سے پہلی چیز ''بیّنات'' ہے۔ یہ لفظ اس سورۂ مبارکہ کے دوسرے حصے میں بھی آ چکا ہے۔ ﴿ہُوَ الَّذِیۡ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبۡدِہٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ﴾ (آیت ۹) ''وہی ہے جو اپنے بندے پر آیات بیّنات نازل کر رہا ہے''۔ اس کی میں وضاحت کر چکا ہوں کہ بیّن کہتے ہیں اُس شے کو جو ازخود ظاہر ہو' خود نمایاں ہو' جس کو کسی اور دلیل کی حاجت نہ ہو' جس کی وضاحت کی کوئی ضرورت نہ ہو۔ ع ''آفتاب آمد دلیلِ آفتاب!'' یہ لفظ عام طور پر رسولوں کے تذکرے میں معجزات کے لیے آتا ہے۔ کسی رسول کو جو معجزہ دیا جاتا تھا وہ گویا بالکل واضح کر دیتا تھا کہ یہ بات کسی انسانی صلاحیت اور طاقت سے وجود میں نہیں آ سکتی' یقیناً یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ جیسے کہ قومِ ثمود کو ان کے مطالبے پر ایک معجزہ دیا گیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ اے صالح! ہم تم پر ایمان لے آئیں گے اگر تم سامنے کی چٹان سے ایک گابھن اونٹنی برآمد کرا لو۔ انہوں نے اللہ سے دعا کی کہ یہ ماننے کو تیار ہیں' لہٰذا انہیں یہ معجزہ دکھا دیا جائے۔ اس پر چٹان شق ہوئی اور گابھن اونٹنی برآمد ہو گئی' جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی اونٹنی (نَاقَةُ اللّٰه) قرار دیا' لیکن اس ناہنجار قوم نے پھر بھی نہیں مانا۔ چنانچہ وہ قوم ہلاک کر دی گئی' برباد کر دی گئی۔ معجزے کے آنے کے بعد بھی اگر قوم ایمان نہ لائے تو پھر اس کی ہلاکت ایک طے شدہ امر ہے۔

''میزان'' کا قرآنی تصور

''بیّنات'' کے ذکر کے ساتھ ہی فرمایا کہ ہم نے اپنے رسولوں کے ساتھ دو چیزیں مزید اُتاریں ـــــ ﴿وَ اَنۡزَلۡنَا مَعَہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡمِیۡزَانَ﴾ ''اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب بھی اتاری اور میزان بھی''۔ کتاب کا لفظ تو عام فہم ہے' بالکل واضح ہے' سب سمجھ جائیں گے' جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات دی گئی۔ لیکن یہاں میزان سے مراد کیا ہے؟ میزان ''وزن'' سے اسم آلہ ہے۔ اصل میں یہ ''مِفعال'' کے وزن پر ''مِوۡزان'' ہے۔ ''وٗ'' یہاں پر ''ی'' کی شکل اختیار کر گیا اور ''میزان'' ہو گیا۔ وزن کرنے کا آلہ یعنی ترازو کو میزان کہا جاتا ہے۔ لیکن توازن کئی قسم کا ہے۔ یہاں کس قسم کا توازن مراد ہے جسے قائم کرنے کے لیے میزان اتاری گئی ہے؟ سورۂ رحمٰن کے درس کے دوران میں نے بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا تھا کہ اس کائنات کے اندر ایک آفاقی توازن ہے۔ تمام اجرامِ فلکی کے درمیان ایک بیلنس قائم ہے جس کا ذکر وہاں بایں الفاظ کیا گیا: ﴿وَ السَّمَآءَ رَفَعَہَا وَ وَضَعَ الۡمِیۡزَانَ ۙ اَلَّا تَطۡغَوۡا فِی الۡمِیۡزَانِ﴾ ''آسمان کو اس نے بلند کیا اور میزان قائم کر دی۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ تم میزان میں خلل نہ ڈالو''۔ درحقیقت یہاں مراد وہ بیلنس ہے جو تمام اجرامِ فلکی کے درمیان ہے۔ یہ تمام ستارے اور سیارے جو فضا کے اندر گردش میں ہیں ان کے مابین کشش ان کے

باہمی فاصلوں کی نسبت سے ہے۔ چنانچہ یہ ایک دوسرے کو اپنی طرف اس انداز سے کھینچتے ہیں کہ ہر کُرہ اپنی جگہ پر قائم ہے۔[۱]

اسی طرح انسان کو زندگی گزارنے کا جو نظام اللہ عطا فرماتا ہے وہ نظام ایک میزان ہے، جس میں حقوق وفرائض کا توازن ہوتا ہے کہ فلاں کا یہ حق ہے اور یہ اس کا فرض یا اس کی ذمہ داری ہے۔ حقوق وفرائض کے بارے میں ایک عمومی اصول یہ ہے کہ جہاں زیادہ ذمہ داری ہوگی وہاں اختیار بھی زیادہ ہوگا۔ چنانچہ حقوق اور فرائض میں اگر توازن ہوگا تو وہ معاشرہ صحیح رہے گا، اور اگر اس کے اندر عدم توازن راہ پا گیا تو اسی کا نام ظلم، عدوان، زیادتی اور ناانصافی ہے۔ تو درحقیقت اللہ تعالیٰ نے جو شریعتیں نازل فرمائیں ان سب کا مقصد یہ ہے کہ انسانی معاشرے میں حقوق وفرائض کا توازن قائم رہے۔ مثلاً تین چیزوں کے اندر توازن کا معاملہ ایسا ہے کہ انسان کے لیے اس کا حصول آسان نہیں ہے۔

ان میں قدیم ترین مسئلہ یہ ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان توازن کیا ہو۔ ظاہر بات ہے دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں، عورت مرد کی محتاج ہے اور مرد عورت کا محتاج ہے، لیکن ان کے مابین حقوق وفرائض کا توازن نہیں ہو پاتا۔ یا تو عورت کو ملکیت بنا لیا جاتا ہے، جوتی کی نوک سمجھا جاتا ہے، اسے یہ حیثیت دی جاتی ہے کہ نہ تو اس کے کوئی حقوق ہیں اور نہ ہی اس کا کوئی مقام ومرتبہ ہے —— اور یا پھر عورت مرد کے بالکل شانہ بشانہ ہو کر اپنی حدود سے تجاوز کر جاتی ہے، بلکہ قلوپطرہ کی صورت اختیار کر کے پورے پورے ملکوں کی قسمت کی نیّا ڈبو دیتی ہے۔ چنانچہ ان کے مابین توازن کی ضرورت ہے۔ عورت بھی یقیناً انسان ہے، اس کے حقوق بھی ہیں، اس کے احساسات بھی ہیں۔ اس کا اپنا ایک مقام ہے، معاشرے کے اندر اس کی ایک حیثیت ہے۔ وہ ماں، بہن، بیٹی اور بیوی ہے، اس کی عزت بھی ہونی چاہیے، لیکن اسے اس طرح کی آزادی نہیں دی جاسکتی کہ خاندانی نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے۔ بلکہ حقوق وفرائض میں توازن پر مبنی ایسا معاشرتی نظام ہونا چاہیے کہ فیملی ایک منظّم، مستحکم اور integrated ادارہ ہو، اس کے اندر نظم وضبط ہو۔ اس لیے کہ پورے معاشرے کے امن وسکون کا انحصار اسی ادارے پر ہے۔ معاشرہ خاندانوں کے مجموعے کا نام ہے۔ دس ہزار، بیس ہزار، دس لاکھ یا بیس لاکھ خاندان ہیں جن کا نام معاشرہ ہے۔ معاشرے کی اس عمارت کے اندر اگر ہر اینٹ مستحکم نہیں ہے، اگر ہر خاندان کا ادارہ منظّم نہیں ہے تو معاشرے میں انتشار اور chaos ہوگا۔

لیکن یہ سب کیسے ہو؟ یہ کون طے کرے کہ عورت کے حقوق کیا ہیں اور فرائض کیا ہیں؟ اسی طرح مرد کے حقوق کیا ہیں اور فرائض کیا ہیں؟ یہ آسان کام نہیں ہے۔ اس عقدے کا حل کرنا آسان نہیں۔ اگر مرد نظام بنائے گا تو ظاہر بات ہے کہ وہ عورتوں کے حقوق کو سامنے نہیں رکھ سکتا۔ اس کی تو اپنی نفسیات ہے۔ اسے صرف اپنے احساسات معلوم ہیں، لہٰذا وہ لازمی طور پر اپنا پلڑا بھاری رکھے گا اور اگر عورت کو موقع مل جائے تو ظاہر بات ہے اس کو صرف اپنے احساسات کا پتہ ہے، وہ مرد کی حیثیت سے سوچ ہی نہیں سکتی، وہ اس کی کیفیات کو محسوس کر ہی نہیں سکتی۔ لہٰذا وہ اپنا نظام بنائے گی۔ چنانچہ انسان محتاج ہے کہ وہ ایک متوازن نظام کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے جو سب کا خالق ہے۔

دوسرا پیچیدہ مسئلہ یہ ہے کہ انفرادیت اور اجتماعیت میں کیا توازن ہو؟ دنیا میں کہیں تو ملوکیت اور آمریت کے زیر اثر totalitarian society قائم ہو جاتی ہے۔ کوئی آمر مطلق اقتدار پر مسلط ہے اور لوگوں کو کوئی حقوق حاصل نہیں۔ نہ وہ اظہارِ خیال کر سکتے ہیں، نہ جماعت بنا سکتے ہیں۔ اس طرح کی آمریت اور ملوکیت میں فرد کچلا جاتا ہے۔ اس کے برعکس معاملہ یہ ہوتا ہے کہ مکمل انفرادی آزادی ہوتی ہے جو آج مغرب میں ہے کہ جو چاہے کرو، چاہے ننگے ہو کر بازاروں میں نکل آؤ۔ دو مرد باہم شادی کرنا چاہیں تو انہیں اس کی آزادی ہے۔ ہم جنسیت (Homo sexuality) کے حق میں دلائل کے انبار لگائے جا رہے ہیں اور لمبے چوڑے قوانین وضع کیے جا رہے ہیں۔ یہ دوسری انتہا ہے کہ فرد کو ہر طرح کی آزادی حاصل ہے اور آپ کو اس کی

آزادی میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں۔ وہ جس طرح سے چاہتا ہے اپنی جنسی خواہش پوری کرے‘ آپ اسے روک نہیں سکتے۔ جب ایک مرد اور ایک عورت اپنی آزاد مرضی سے زنا کریں تو یہ جرم ہے ہی نہیں‘ البتہ اگر بالجبر زنا (rape) ہوا ہو تو وہ جرم ہے۔ ہر مرد وزن اپنے جسم کا مالک ہے‘ اسے اس پر پورا اختیار ہونا چاہیے‘ زیادہ سے زیادہ شوہر یہ کہہ سکتا ہے کہ میرے حق پر دست درازی ہوگئی ہے۔ وہ جا کر سول کورٹ میں کیس کرے۔ اگر کسی کی بیوی اپنی مرضی سے کسی دوسرے شخص کے ساتھ تعلقات قائم کر لیتی ہے تو اس معاملے میں کوئی کریمنل کیس نہیں بنے گا۔ اب یہ آزادی کی انتہا ہے‘ جسے مادر پدر آزادی کہا جاتا ہے۔ مغربی معاشرہ اس انتہا کو نکل گیا ہے۔ اب فرد اور اجتماعیت میں کیا توازن ہو؟ یہ دوسرا نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے۔

انسانی معاشرے کا تیسرا پیچیدہ مسئلہ جو حال ہی میں پیدا ہوا ہے وہ مزدور اور سرمائے کے درمیان توازن کا ہے۔ یہ مسئلہ دراصل صنعتی انقلاب کے بعد پیدا ہوا ہے‘ اس سے پہلے یہ مسئلہ نہیں تھا۔ ایسے بڑے بڑے کارخانوں کا کوئی تصور ہی نہیں تھا کہ جن میں بیس بیس‘ تیس تیس ہزار آدمی کام کر رہے ہوں۔ لہٰذا بڑا سادہ سا مبادلہ ہوتا تھا۔ جس نے کھیت میں کام کیا‘ ہل چلایا اور گندم اگائی‘ وہ گندم کی کچھ مقدار لے کر اُس جولاہے کے پاس چلا جاتا جو کرگھے یا کھڈی پر بیٹھا کھدر بن رہا ہوتا اور گندم کے عوض اس سے کھدر لے لیتا۔ اس طرح دونوں کی ضرورت پوری ہو جاتی۔ یہ مبادلہ (بارٹر سسٹم) پر مبنی سادہ ترین معیشت تھی۔ لیکن اس کے بعد پھر سرمایہ وجود میں آیا۔ اب سونے کو کرنسی کا درجہ حاصل ہو گیا اور یہ طے کیا گیا کہ ایک تولہ سونا برابر ہے اتنے من گندم کے۔ چنانچہ جس نے اپنے پاس سونا جمع کر لیا اس کے پاس طاقت ہے‘ وہ جب چاہے گا مارکیٹ کو destabilize کر دے گا۔ وہ جب چاہے گا گیہوں کی بہت بڑی مقدار خرید لے گا اور قیمت بڑھا دے گا اور جب چاہے گا اسے منڈی میں لے آئے گا۔ پھر ذخیرہ اندوزی اور دولت کا ارتکاز اسی سے شروع ہوا۔ کوئی شخص اپنے پاس کتنی گندم جمع کر سکتا تھا اور اسے کتنی دیر رکھ سکتا تھا؟ لیکن سونا تو آپ جتنا چاہیں اور جب تک چاہیں رکھ سکتے ہیں۔ سونا خراب نہیں ہوتا‘ اس کا کچھ بگڑتا نہیں۔ ایچ جی ویلز نے بڑی خوبصورت بات لکھی ہے کہ انسان کو اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ کرنسی کی ایجاد سے وہ کتنی بڑی لعنت کا طوق اپنی گردن میں ڈال رہا ہے۔ اس کے بعد پیپر کرنسی آئی تو اس سے مزید کئی لعنتوں کے دروازے کھلتے چلے گئے۔ اس پیپر کرنسی کی بدولت آج پوری نوعِ انسانی کی معیشت کا حال شیش محل کی مانند ہے ۔

لو سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا!

پھر یہ کہ بڑے بڑے کارخانے ہیں‘ جن کے مالک سرمایہ دار ہیں۔ یہاں مزدور اور سرمایہ دار کے درمیان ایک کشمکش چل رہی ہے۔ کارل مارکس کا سارا فلسفہ لیبر کی سرپلس ویلیو پر چلا ہے‘ جس کی بنیاد پر اتنا بڑا انقلاب آیا اور خون خرابہ ہوا۔ وہ سارا مسئلہ یہ ہے کہ مزدور اپنے حقوق کا اور سرمایہ دار اپنے سرمائے کا تحفظ چاہتا ہے۔ سرمایہ دار کارخانہ بند کر کے مزدور کو بے روزگار کر سکتا ہے۔ مزدور غریب کو معلوم ہے کہ اگر چار دن مجھے مزدوری نہیں ملی تو میرے گھر کے اندر فاقہ آ جائے گا‘ میرے بچے کے پینے کے لیے دودھ کہاں سے آئے گا؟ لہٰذا وہ کارخانے کے مالک کے رحم و کرم پر ہے کہ وہ اُسے جو اُجرت دے گا اس پر وہ کام کرنے پر مجبور ہے۔ یہ استحصال کی بدترین شکل ہے جو سرمایہ داری کی صورت میں مسلط ہے۔

تو یہ ہیں اصل میں تین مسائل جن میں حقوق و فرائض کے مابین توازن پر مبنی نظام سوائے اللہ کے کوئی نہیں دے سکتا۔ یہ حقیقت ہے جس کو اگر لوگ سمجھ لیں تو شریعت کی عظمت اور اہمیت سامنے آئے گی۔ اسی لیے شریعت کو میزان کہا گیا۔ یہاں میزان سے ترازو مراد نہیں ہے کہ اللہ نے آسمان سے ترازو اتاری‘ بلکہ یہ کہ اُس نے کتاب اتاری۔ اور کتاب کے ساتھ شریعت کا جو نظام اتارا ہے وہ حقوق و فرائض کا ایک متوازن‘ balanced‘ منصفانہ اور عدل و قسط پر مبنی نظام ہے جو اُس نے عطا کیا ہے۔

ارسالِ رُسل کی غرض وغایت

اب اس آیت کو پڑھئے : ﴿ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ ﴾ ''ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو بینات کے ساتھ''۔ یعنی معجزات اور براہین کے ساتھ۔ ﴿وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ﴾ ''اور ان کے ساتھ کتاب بھی اتاری اور میزان (شریعت) بھی''۔ ﴿ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ ''تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں''۔ یہ ہے اصل میں اس آیت کی جان جو اِن الفاظ میں ہے۔ ہم نے یہ سب کچھ کس لیے اتارا؟ رسول کس لیے بھیجے؟ کتاب کس لیے نازل کی؟ میزان کس لیے اتاری؟ تاکہ میزان نصب ہو! —— اس لیے نہیں کہ کتاب کی تلاوت کرتے رہو اور ثواب لیتے رہو۔ یہ کتاب اس لیے آئی تھی کہ اسے قائم کرو۔ یہ میزان اس لیے دی گئی تھی کہ میزان نصب ہو۔ جیسے کہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے بیعت خلافت کے موقع پر فرمایا تھا: ''لوگو! تم میں سے جو قوی ہے میرے نزدیک وہ ضعیف ہوگا جب تک کہ اس سے حق وصول نہ کرلوں اور جو ضعیف ہے وہ قوی رہے گا جب تک کہ اسے اس کا حق دلا نہ دوں''۔ یہ ہے اصل میں وہ نظامِ عدل وقسط جسے قائم کرنے کے لیے حضور ﷺ مبعوث ہوئے۔ چنانچہ آپ ﷺ سے فرمایا گیا: اے نبی کہہ دیجیے! ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ﴾ (الشوریٰ:۱۵) 'مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے مابین عدل قائم کروں!'' —— دیکھو! مجھے تم واعظ نہ سمجھنا جو ٹھنڈا ٹھنڈا وعظ کہتا ہے' میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے۔ ایک گاؤں میں وعظ سنایا تو کچھ ہار گلے میں ڈلوائے' کچھ حلوے مانڈے کھائے اور اگلے گاؤں چلا گیا' پھر وہاں وعظ کیا۔ میں وہ نہیں ہوں (معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ!) مجھے تو بھیجا گیا ہے اس لیے کہ میں عدل قائم کروں!

عدل کا مطلب کیا ہے؟ جو اپنے حق سے زائد لے رہا ہے اُس شیر کے منہ سے نوالہ نکالیں گے تو عدل ہوگا نا! اور کیا وہ اس کو پسند کرے گا؟ وہ تو مزاحمت کرے گا۔ چنانچہ عدل کو قائم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اسے عدالت والا عدل نہ سمجھئے۔ عدالت والا عدل تو یہ ہے کہ آپ کے ہاں جو بھی قانون رائج ہے اس کے تحت عدالت نے فیصلہ دے دینا ہے' اگرچہ وہ قانون ہی نامنصفانہ ہو۔ اگر اس نظام کی بنیاد ہی استحصال پر قائم ہے تو عدالت سے عدل کی کیا توقع ہو سکتی ہے؟ آپ نے تو چور کو سزا دے دی' کیونکہ آپ کے سول کوڈ میں لکھا ہوا ہے کہ جو چوری کرے گا اس کو یہ سزا ملے گی۔ لیکن آپ نے یہ نہیں دیکھا کہ جس نے چوری کی ہے اس کا تعلق اُس طبقے سے تھا جس کا مسلسل استحصال ہو رہا ہے اور اس نے جا کر کسی جاگیردار کے گھر کے اندر نقب لگائی ہے تو جاگیردار کے پاس جو دولت ہے وہ جائز طریقے سے آئی تھی یا ناجائز ذرائع سے؟ عدالت ان امور سے بحث نہیں کر سکتی۔ عدالت تو صرف ملکی نظام کے تحت رائج قانون کے تحت فیصلہ کرے گی کہ اس نے چوری کی ہے اور اس کی چوری کی سزا اسے مل رہی ہے —— جبکہ اصل شے نظام ہے۔ رسولوں کی بعثت عادلانہ ومنصفانہ نظام (Politico-Socio-Economic System) قائم کرنے کے لیے ہوئی ہے۔ اسی کے بارے میں یہاں الفاظ آئے ہیں: ﴿لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ ''تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں''۔

اس نظامِ عدل وقسط کا قیام اللہ تعالیٰ کے ہاں کس قدر اہمیت رکھتا ہے اور اس پر قرآن حکیم میں کس قدر زور (emphasis) ہے اس کو سمجھانے کے لیے میں قرآن حکیم سے چند حوالے پیش کر رہا ہوں۔

ہمارے دین میں سب سے بنیادی حوالہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات ہیں۔ اس کے ضمن میں سورۂ آل عمران میں ارشاد ہوا: ﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا ۢ بِالْقِسْطِ ؕ﴾ (آیت ۱۸) ''اللہ نے خود اس بات کی شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں' اور (یہی شہادت) فرشتوں اور سب اہل علم نے بھی دی ہے۔ وہ انصاف کا قائم کرنے والا ہے''۔ یہاں اللہ کی یہ شان اور یہ صفت بیان ہوئی ہے کہ وہ عدل وقسط قائم کرنے والا ہے۔ اُس نے روزِ جزا کا معاملہ رکھا ہی اس لیے ہے کہ عدل وقسط قائم ہو۔

دوسرا اہم معاملہ رسالت کا ہے۔ رسالت کی شان یہ بیان ہوئی ہے کہ ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ﴾ اور یہ Generalised Statement ہے' تمام رسولوں کے بھیجنے کا مقصد یہی تھا۔ تمام کتابوں اور تمام شریعتوں کے نزول کا مقصد یہی تھا: ﴿لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ ''تا کہ لوگ عدل وقسط پر قائم ہوں''۔ نبی آخر الزمان حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے فرمایا گیا کہ اے نبیؐ! آپ ڈنکے کی چوٹ کہہ دیجیے کہ ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ﴾ ''میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تمہارے مابین عدل قائم کروں''۔

اس کے بعد اُمت کا معاملہ آتا ہے۔ اُمت کے لیے جو بات سورۃ النساء اور سورۃ المائدۃ میں کہی گئی ہے وہ ایک ہی ہے' صرف ترتیب بدل گئی ہے۔ سورۃ النساء میں ارشاد ہوا: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ﴾ (آیت ۱۳۵) ''اے ایمان کے دعوے دارو! (پوری قوت کے ساتھ) عدل وانصاف کو قائم کرنے والے اور اللہ کے حق میں گواہی دینے والے بن جاؤ! چاہے یہ بات تمہارے اپنے خلاف یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں کے خلاف جا رہی ہو''—— تمہیں عدل وانصاف کی بات کہنی ہے' یہ نہیں دیکھنا ہے کہ اس سے میری اپنی ذات کو یا میرے ماں باپ کو یا میرے خاندان اور رشتہ داروں کو نقصان پہنچ جائے گا۔ جو بات عدل کی ہے وہ ڈنکے کی چوٹ کرو۔

یہی بات ذرا ترتیب بدل کر سورۃ المائدۃ کے اندر آتی ہے: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی﴾ (آیت ۸) ''اے اہل ایمان! اللہ کی خاطر عدل وانصاف کی گواہی دینے والے بن کر کھڑے ہو جاؤ! اور دیکھنا کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم عدل سے انحراف کرو۔ عدل کرو' یہ پرہیزگاری سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے''۔ مقدم الذکر آیت میں فرمایا گیا ہے کہ حق کی بات کہو چاہے وہ تمہاری اپنی ذات' تمہارے والدین یا تمہارے اپنے کنبے قبیلے کے خلاف جا رہی ہو۔

دوسری آیت میں وہی بات برعکس طور پر کہی کہ کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم عدل سے انحراف کرو۔ عدل سے کام لو' یہی تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔ یہ ہے عدل وقسط کی اہمیت جو قرآن حکیم میں بیان ہوئی ہے۔ اور مطلوب یہ ہے کہ یہ عدل وقسط اجتماعی نظام کی شکل میں ہو۔

سورۃ الحدید اور سورۃ الصّف کی دو آیات کا تقابلی مطالعہ

میں چاہتا ہوں کہ آگے بڑھنے سے پہلے زیر درس آیہ مبارکہ کے اس حصے کا سورۃ الصّف کی آیت ۹ سے ایک تقابلی مطالعہ کر لیا جائے۔

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ وَلَوْ کَرِهَ الْمُشْرِکُوْنَ ۝﴾

سورۃ الصّف کی یہ آیت اس سورت کی مرکزی آیت اور اس کا عمود ہے۔ قرآن مجید میں یہ مضمون تین مرتبہ بالکل انہی الفاظ میں آیا ہے' سوائے اس کے کہ ایک مقام پر صرف آخری حصہ ذرا مختلف ہے۔ ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ﴾ یہ الفاظ قرآن حکیم میں تین دفعہ آئے ہیں۔ سورۃ التوبہ کی آیت ۳۳' سورۃ الفتح کی آیت ۲۸ اور سورۃ الصّف کی آیت ۹ انہی الفاظ پر مشتمل ہے۔ سورۃ التوبہ اور سورۃ الصّف میں آیت کے اختتام پر ﴿وَلَوْ کَرِهَ الْمُشْرِکُوْنَ﴾ کے الفاظ ہیں' جبکہ سورۃ الفتح میں ﴿وَکَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا﴾ کے الفاظ پر آیت ختم ہوتی ہے۔ تقابلی مطالعہ اس اعتبار سے کرنا ہے کہ سوۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں تمام رسولوں کے ساتھ تین چیزوں کا ذکر کیا گیا: ﴿اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ﴾ اور اس سے پہلے ﴿بِالْبَیِّنٰتِ﴾ جبکہ حضور ﷺ کے بیان میں صرف دو چیزوں کا ذکر ہوا: ﴿اَلْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ﴾. اس لیے کہ حضور ﷺ کا اصل معجزہ قرآن حکیم ہے۔

الهدیٰ سے مراد قرآن ہے۔ یہ هُدًی لِّلنَّاسِ ہے' هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ہے' الْهُدٰی (The Guidance) ہے' جس میں ہدایتِ خداوندی مکمل ہو چکی' اپنے اتمام کو پہنچ چکی' درجۂ تکمیل کو پہنچ چکی —— اور حضور ﷺ کا معجزہ بھی یہی ہے۔ حضور ﷺ کا معجزہ

یدِ بیضا نہیں ہے، عصائے موسیٰؑ کی شکل میں نہیں ہے، چٹان سے کسی اونٹنی کے برآمد ہو جانے کی صورت میں نہیں ہے، بلکہ حضورﷺ کا معجزہ قرآن ہے۔ ﴿یٰسٓ ۝ وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ ۝ اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۝﴾ ''قرآن حکیم کی قسم ہے (یہ حکمت بھرا قرآن گواہ ہے اس پر کہ) آپؐ یقیناً اللہ کے رسول ہیں''۔ ﴿قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ ۝﴾ ''قرآن مجید کی قسم ہے۔'' یہ باعظمت قرآن گواہ ہے آپؐ کی رسالت پر۔ ﴿صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ ۝﴾ ''قسم ہے نصیحت بھرے قرآن کی''۔ یہ قرآن جو ذکر والا ہے، نصیحت والا ہے، یہی آپؐ کی رسالت کا ثبوت ہے۔ تو یہ جان لیجیے کہ قرآن حکیم صرف کتاب نہیں ہے، بلکہ یہ معجزہ + کتاب = الہدیٰ ہے۔ اور وہ جو میزانِ شریعت چلی آ رہی تھی وہ اپنی تکمیل کو پہنچ گئی ہے دینِ حق کی شکل میں۔

میری کتاب ''نبی اکرمﷺ کا مقصدِ بعثت'' تین مقالات پر مشتمل ہے، درمیانی مقالہ کا موضوع یہی ہے کہ حضورﷺ کا مقصدِ بعثت کیا ہے؟ اور اس میں تفصیل بیان کی گئی ہے کہ جیسے انسانی ذہن ارتقائی منازل طے کرتا ہے اسی طرح نوعِ انسانی کا فکر اور ذہن بھی بحیثیتِ مجموعی ان ارتقائی مراحل سے گزرا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انسان اپنے ذہنی ارتقاء کے اعتبار سے بلوغ کو پہنچ گیا تو محمد رسول اللہﷺ پر ''الہدیٰ'' کا اتمام ہو گیا۔ اسی طریقے سے تمدنِ انسانی کا بھی ارتقاء ہوا ہے۔ کبھی انسان غاروں میں رہتا تھا، کوئی اجتماعی نظام تھا ہی نہیں۔ پھر کوئی قبائلی نظام قائم ہوا، پھر کوئی ریاستی نظام قائم ہوا، پھر بڑی بڑی مملکتیں قائم ہو گئیں۔ اور اب آ کر پورا نظامِ زندگی جس طور سے اجتماعیت کی گرفت میں آ چکا ہے، تو اگر وہ نظام صحیح ہو تو تمام افراد کا معاملہ بھی بہتر ہو جائے گا، اور نظام ہی غلط ہو تو ظاہر بات ہے کہ معاشرہ تلپٹ ہو کر رہ جائے گا۔ تو جب وہ تمدن اس سطح کو پہنچ گیا کہ روم اور فارس جیسی بڑی بڑی عظیم مملکتیں (Empires) قائم ہو گئیں تو اس وقت حضورﷺ کو عدل وقسط پر مبنی ایک کامل نظامِ اجتماعی (Politico-Socio-Economic system) دے کر بھیجا گیا، جسے آپﷺ نے جزیرہ نمائے عرب میں بالفعل قائم کر کے دکھایا اور اسے پوری دنیا میں قائم کرنے کی ذمہ داری اُمت کے سپرد فرمائی۔ اور ظاہر بات ہے کہ جب تک اسے قائم کر کے نہ دکھا دیا جائے، یہ نظام دنیا پر حجت نہیں بن سکتا۔

شہادت علی الناس پر ان دروس میں بھی گفتگو ہوئی ہے کہ شہادت زبان سے بھی دی جاتی ہے، دل سے بھی اور عمل سے بھی۔

وہی ذاتِ واحد عبادت کے لائق
زباں اور دل کی شہادت کے لائق!

ہم گواہی دیتے ہیں: نَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَنَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ ۔ ہمیں یہ گواہی اپنے عمل سے بھی دینی چاہیے کہ واقعتاً ہم اللہ کو اپنا الٰہ، معبود اور حاکمِ مطلق مانتے ہیں اور محمدﷺ کو واقعتاً اللہ کا رسول مانتے ہیں۔ پھر یہ گواہی انفرادی طور پر ہی نہیں، اجتماعی طور پر بھی مطلوب ہے، اور یہ گواہی اُس وقت قائم ہو گی جب کہ وہ نظام عملاً قائم کر کے دکھایا جائے۔ ورنہ کہا جائے گا کہ یہ محض خیالی جنت (Eutopia) ہے، باتیں تو بڑی اچھی ہیں، لیکن قابل عمل نہیں ہیں، انہونی سی باتیں ہیں۔ ''سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُھُمْ'' کہنا تو بڑا آسان ہے، لیکن کیا واقعتاً کہیں ایسا ہو سکتا ہے؟ جی ہاں! اس کا عملی نقشہ اگر دیکھنا ہو تو ابوبکر اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو دیکھ لیجیے۔ ایسا نہیں ہے کہ بس کوئی شاعری کی گئی ہو، معاذ اللہ ——— بلکہ وہ نظام عملاً قائم کر کے دکھایا جس میں ہر نوع سے توازن ہے۔ عورتوں کو حقوق دیئے گئے ہیں، لیکن وہ حقوق اس طرح کے نہیں ہیں کہ خاندانی نظام درہم برہم ہو جائے۔ عوام کو حقوق دیئے ہیں، وہ خلیفۃ المسلمین کو دورانِ خطبہ ٹوک کر پوچھ سکتے ہیں کہ یہ کُرتا آپ نے کہاں سے بنایا ہے؟ لیکن وہ آزادی اس طرح کی بھی نہیں ہے کہ وہ نظام ہی بالکل درہم برہم ہو کر رہ جائے۔ اسی طرح جو صاحبِ مال ہے اس کے اپنے حقوق ہیں، لیکن مزدور کا اپنا حق ہے۔ صاحبِ مال کو اس کی اجازت نہیں دی جائے گی کہ سود کی بنیاد پر اپنے مال میں اضافہ کرنے لگے اور ارتکازِ زر کا مرتکب ہو۔ اسلام کے نزدیک یہ سب سے بڑی حرام شے ہے۔ یہ نظام ہے جو دینِ حق کی شکل میں محمد عربیﷺ کو دیا گیا۔

ہم تقابل کر رہے تھے کہ جہاں عمومی قانون بیان ہوا، وہاں تین چیزیں مذکور

ہوئیں: ﴿لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ وَاَنۡزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡمِیۡزَانَ﴾ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کا معاملہ خصوصی ہے۔ اس کے بارے میں فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ﴾ اس لیے کہ الہدیٰ قرآن ہے' قرآن ہی معجزہ بھی ہے اور قرآن ہی الکتاب بھی ہے۔ اور وہ نظامِ عدلِ اجتماعی دینِ حق کی شکل میں کامل نظام کی حیثیت سے پیش کر دیا گیا۔ تو کس لیے بھیجا حضور کو؟ ﴿لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ﴾ ''تاکہ اس کو کل جنسِ دین پر غالب کر دے''۔ اس نظامِ عدلِ اجتماعی کو غالب کر کے دکھائے۔ یہ نظام کسی اور نظام کے تابع رہے گا تو پھر ظاہر کیسے ہوگا؟ اگر یہ ملوکیت کے تابع ہو گیا' سرمایہ داری کے تابع ہو گیا یا کسی اور نظام کے تابع ہو گیا تو پھر وہ نظام نہیں' مذہب بن جائے گا' جو عقائد' مراسمِ عبودیت اور سماجی رسومات کا مجموعہ ہوگا۔ جیسا کہ خلافتِ راشدہ کے بعد تدریجاً جب خلافت کا نظام ختم ہوا اور ملوکیت آئی' جاگیرداری آئی' سرمایہ داری آئی' تو دین سکڑ کر مذہب کی صورت اختیار کر گیا۔ اب یہ صرف عقائد اور نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ تک محدود ہو گیا۔ اس کے علاوہ کچھ ذکر اور مراقبوں کے حلقے اس میں راہ پا گئے۔ باقی رہا نظام' وہ تو بادشاہوں کا تھا۔ محلات ان کے بننے لگے۔ بادشاہ کی محبوب بیوی کا انتقال ہوا تو کروڑوں روپے سے تاج محل بن گیا۔ بادشاہ کو محل چاہیے' الحمرا بن گیا۔ بادشاہ کے لیے تو بڑا شاندار توپ کاپی جیسا محل ہونا چاہیے۔ استنبول میں جا کر دیکھئے کتنا عظیم الشان محل بنایا ہے۔ کہاں عمر فاروق رضی اللہ عنہ تھے جو حجرے میں رہتے تھے' لیکن ان کے نام سے قیصر و کسریٰ کے ایوانوں کے اندر لرزہ طاری ہوتا تھا' کہاں یہ عالم کہ عیاشیاں ہیں' ایوان سجا رکھے ہیں' لیکن دنیا کے اندر ان کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ تو بہرحال اس چیز کو سمجھئے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کا مقصد بعثت یہ ہے: ﴿لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ﴾ تاکہ وہ اس دین کو غالب کریں' قائم کریں' نافذ کریں اور پورے نظامِ زندگی پر اسلام چھا جائے' اسلام غالب آ جائے' اسلام قائم ہو جائے۔ زندگی کا کوئی جزو' کوئی پہلو اس سے خارج اور آزاد نہ رہ جائے۔ وہی بات یہاں کہی گئی: ﴿لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ وَاَنۡزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡمِیۡزَانَ لِیَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ﴾

انزالِ حدید کی غرض و غایت

اب یہ مقصد پورا کیسے ہوگا؟ فرمایا: ﴿وَاَنۡزَلۡنَا الۡحَدِیۡدَ﴾ ''اور ہم نے لوہا بھی اتارا ہے'' ﴿فِیۡهِ بَاۡسٌ شَدِیۡدٌ﴾ ''جس میں شدید جنگ کی صلاحیت ہے''۔ ''بأس'' کا ترجمہ بعض حضرات صرف قوت کر دیتے ہیں کہ ''اس میں بڑی طاقت ہے'' لیکن اس کا حقیقی ترجمہ ''اسلحہ کی قوت'' ہے۔ اسی لوہے سے تلوار' نیزہ' ڈھال اور دیگر سامانِ جنگ تیار ہوتا ہے ''بأساء'' جب جمع کی شکل میں آتا ہے تو اس سے مراد فقر و فاقہ' بھوک اور تنگی ہوتا ہے لیکن جب ''الباس'' آتا ہے تو یہ جنگ ہی کے معنی میں آتا ہے۔ ہمارے منتخب نصاب کے درس دوم (آیۃ البر) میں یہ دونوں ہی الفاظ آئے ہیں ——— فرمایا:

﴿وَالصّٰبِرِیۡنَ فِی الۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیۡنَ الۡبَاۡسِ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۷۷)

''اور صبر کرنے والے تنگی و مصیبت کے وقت میں اور (حق و باطل کی) جنگ میں۔''

چنانچہ ''اَلۡبَاۡسَاءِ'' سے تنگی' فاقہ' بھوک' زخم وغیرہ کی تکلیف یا کوئی مصیبت وغیرہ مراد ہے' جبکہ ''الباس'' جنگ ہے۔ انسان کا اصل امتحان تو ''حِیۡنَ الۡبَاۡسِ'' یعنی جنگ کے وقت ہی ہوتا ہے جہاں جان کے لالے پڑ جائیں' جہاں جان کی بازی کھیلنی پڑے۔ جو وہاں پر صبر کا مظاہرہ کر سکیں وہ ہیں کہ جن کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا ؕ وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ﴾ ''یہ ہیں وہ لوگ جو واقعۃً (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں اور یہی ہیں وہ لوگ جو واقعۃً متقی ہیں۔'' یہ بات ذہن میں رکھتے ہوئے ان الفاظ کا مطالعہ کیجیے: ﴿فِیۡهِ بَاۡسٌ شَدِیۡدٌ﴾ ''اس میں شدید جنگ کی صلاحیت ہے''۔ ﴿وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ ''اور لوگوں کے لیے دوسری منفعتیں بھی ہیں''۔ آج کل تو اس اعتبار سے ہمارے نزدیک لوہے کی اہمیت کم ہو گئی ہے' ورنہ توا' پرات' چمٹا' پھونکنی سب لوہے سے ہی بنتی تھیں۔ اب ہمارے زیر استعمال اشیاء میں لوہا اس طرح سے نمایاں نظر نہیں آتا' لیکن بہرحال اس میں لوگوں کے لیے اور بھی بہت سے فائدے

ہیں۔

آگے فرمایا: ﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ﴾ ''اور تاکہ اللہ یہ ظاہر کردے''۔ ''لِيَعْلَمَ'' کا لفظی ترجمہ ہے ''تاکہ اللہ یہ جان لے''، لیکن ہم اس کا ترجمہ کرتے ہیں ''تاکہ اللہ دکھا دے' ظاہر کردے''۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا علم تو قدیم ہے' اللہ کو معلوم ہے کون کتنے پانی میں ہے' لیکن اللہ لوگوں کو دکھا دینا چاہتا ہے اور یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہے۔ ﴿مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ﴾ ''کون ہے وہ جو غیب کے باوجود اللہ کی اور اُس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے''۔ دین اللہ کا ہے جس کے قیام کی جدوجہد کرنا ہے۔ حاکمیت اللہ کے لیے ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کے پہلے حصے میں ہم دو مرتبہ یہ الفاظ پڑھ چکے ہیں: ﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ''اسی کی بادشاہت ہے آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی''۔ پھر ہم یہ بھی پڑھ چکے ہیں: ﴿وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ ''وہی غالب حکمت والا ہے''۔ وہ العزیز بھی ہے' الحکیم بھی ہے۔ بادشاہ حقیقی وہ ہے' حکم اس کا چلنا چاہیے۔ لہٰذا جو لوگ اس لوہے کی طاقت کو ہاتھ میں لے کر اللہ کے حکم کو نافذ کرتے ہیں وہ اللہ کے مددگار ہیں۔ اور اللہ کے اس دین کو عملاً قائم کرنا فرضِ منصبی ہے محمد رسول اللہ ﷺ کا اور تمام رسولوں کا' تاکہ دنیا میں عدل قائم کریں۔ اس کے لیے یہاں الفاظ آئے: ﴿لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ ''تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں''۔ سورۃ الشوریٰ میں واحد کے صیغے میں محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے فرمایا گیا: ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ﴾ ''اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے مابین عدل کروں''۔ اور سورۃ التوبۃ' سورۃ الفتح اور سورۃ الصّف میں تین مرتبہ یہ الفاظ آگئے: ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ تو گویا کہ جو بھی لوہے کی طاقت لے کر محمد رسول اللہ ﷺ کی نصرت کے لیے میدان میں آگئے وہ ہیں اللہ کے بھی مددگار اور رسولؐ کے بھی مددگار۔

محمد رسول اللہ ﷺ کا طریقِ انقلاب

یہ وہ حقیقت ہے جس کے بارے میں میں نے کہا تھا کہ اسے قرآن نے عریاں انداز میں بیان کیا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کو حق بات کہنے میں کوئی جھجک نہیں' کوئی رکاوٹ نہیں۔ ازروئے الفاظ قرآنی: ﴿وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ﴾ (الاحزاب: ۵۳) ''اور اللہ حق بات کہنے میں نہیں شرماتا''۔ عام آدمی سمجھے گا یہ بات کہنے کی نہیں ہے' اگر ہے بھی تو دل میں رکھو' اس کو زبان پر نہ لاؤ۔ لیکن یہاں اچھی طرح بات سمجھا دی گئی ہے کہ دنیا میں نظامِ عدل اجتماعی کو قائم کرنے کا طریق کار کیا ہے؟ اس کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ آپؐ کو جو الہدیٰ دی گئی ہے' جو کتاب ہدایت بھی ہے اور معجزہ بھی' اس کے ذریعے سے لوگوں کو دعوت دیجیے۔ اسی ہدایت کی لوگوں میں تبلیغ کیجیے۔ اس پیغام ربانی کو عام کیجیے' لوگوں کو ذہناً اور قلباً اس پر مطمئن کیجیے' اس کے مضمرات کو کھول کر بیان کیجیے۔ ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾ (النحل) ''(اے محمدؐ) ہم نے آپ پر یہ ذکر نازل فرمایا تاکہ آپ لوگوں کے لیے اس تعلیم کی تشریح اور وضاحت کریں جو ان کے لیے نازل کی گئی ہے''۔ یہ سارے کام کیجیے۔ جیسا کہ سورۃ الجمعہ میں ہم نبی اکرم ﷺ کے اساسی منہجِ عمل کے عناصر چہارگانہ پڑھ چکے ہیں: ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ —— یعنی لوگوں کو اللہ کی آیات سنانا' ان کا تزکیہ کرنا اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دینا۔

ہمیں پانچویں جماعت میں سب سے پہلا سائنسی تجربہ غالباً یہ کرایا جاتا تھا کہ لوہ چون اور لکڑی کے برادے کو علیحدہ کیسے کیا جائے گا۔ ہاتھ میں مقناطیس لے کر اس مکسچر پر پھیریے تو لوہ چون اس کے ساتھ چمٹتا چلا جائے گا اور برادہ باقی رہ جائے گا۔ بالکل یہی معاملہ اس ''الہدیٰ'' کا ہے۔ یہ ہدایت کی طرف کھینچنے والا مقناطیس ہے۔ اور یہ اسی کو اپنی طرف کھینچے گا جس کی اپنی فطرت کے اندر کسی نہ کسی درجے میں ہدایت موجود ہے۔ اگر وہ موجود نہیں تو جیسے برادہ میگنٹ کے ساتھ نہیں چمٹتا اسی طرح اس الہدیٰ کے ساتھ وہ ابوجہل نہیں چمٹے گا جس کی فطرت مسخ ہو چکی۔ ابولہب نہیں چمٹے گا چاہے وہ حقیقی چچا ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ کا ایک دیوار بیچ کا پڑوسی ہے۔ اس کا حال تو یہ تھا کہ اگر حضورؐ کے گھر میں ہنڈیا پک رہی ہے تو اس کے اندر بھی اس کے گھر سے غلاظت پھینکی جا رہی ہے' اور یہ سگا چچا کر رہا تھا جو باپ کی جگہ پر ہوتا ہے' لیکن عناد' دشمنی' شقاق اور حسد

کے جذبات کے زیر اثر وہ اندھا بہرا ہو چکا تھا۔ اس حوالے سے جان لیجیے کہ جس کے اندر صلاحیت ہے وہی اس مقناطیس کے ذریعے کھنچے گا۔ جو شے حرارت کے لیے اچھے موصل (کنڈکٹر) کا درجہ رکھتی ہے' اسی میں حرارت سرایت کرے گی۔ اسی طرح جو بجلی کے لیے اچھا موصل ہے' اسی میں سے الیکٹرک کرنٹ گزر سکے گا۔ لیکن بہرحال آپ اس میگنٹ کو پھیلائیں۔ جتنا بڑا معاشرہ ہے اسی پیمانے پر پھیلائیں گے' تب ہی اس میں جو بھی سلیم الفطرت لوگ ہیں وہ چمٹ کر آئیں گے۔ اگر آپ صرف اپنی کُٹھیا میں گڑ پھوڑتے رہیں گے' تو آس پاس کے لوگوں کو کیا پتا چلے گا؟ لہٰذا آپ اپنے میدانِ کار کی وسعت کے مطابق اس قرآن کی دعوت کو پھیلائیے' عام کیجیے۔

پھر یہ کہ یہ دعوتِ قرآنی وقت کی ذہنی سطح کے مطابق ہو۔ یہ نہ ہو کہ آپ صرف وعظ کہہ رہے ہوں اور آپ کے معاشرے کا جو ذہین عنصر ہے وہ اس کی طرف توجہ ہی نہ دے۔ آپ جو دعوت دے رہے ہیں اس کے لیے دلائل اور براہین ہونے چاہئیں۔ ازروئے الفاظ قرآنی: ﴿اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَ الۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ وَ جَادِلۡہُمۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ ؕ﴾ (النحل:۱۲۵) ''اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ' اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو''۔ قرآن معجزہ بھی ہے' قرآن برہان بھی ہے' قرآن میں حکمت بھی ہے' ﴿ذٰلِکَ مِمَّاۤ اَوۡحٰۤی اِلَیۡکَ رَبُّکَ مِنَ الۡحِکۡمَۃِ﴾ (بنی اسراء یل:۳۹) ''یہ ہیں وہ حکمت کی باتیں جو تیرے رب نے تجھ پر وحی کی ہیں''۔ آپ اپنے معاشرے کے ذہین عناصر کو متاثر کیجیے' تعلیم یافتہ طبقے میں اسے عام کیجیے۔ قرآن کے وعظ و نصیحت کے ذریعے سے عوام الناس کو کھینچیے۔

بہرحال جن کے اندر بھی خیر اور بھلائی ہے' صلاحیت ہے' وہ کھنچے چلے آئیں گے۔ لیکن جن کے اندر صلاحیت نہیں ہے' وہ نہیں آئیں گے۔ اور جن کے پیش نظر مفادات ہیں وہ بات کو حق سمجھ کر بھی نہیں آئیں گے' جیسے کہ میں پہلے مثال دے چکا ہوں کہ یہود کے علماء سے بڑھ کر کون تھا جو حضور ﷺ کو پہچان سکتا تھا؟ قرآن ان کے بارے میں کہتا ہے: ﴿یَعۡرِفُوۡنَہٗ کَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَہُمۡ﴾ (البقرۃ:۱۴۶) ''وہ انہیں اس طرح پہچانتے ہیں جیسے اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں''۔ لیکن انہوں نے آپ ؐ کو مانا کیوں نہیں؟ اس لیے کہ ان کی چودھراہٹیں تھیں' ان کی مسندیں تھیں' ان کی حیثیتیں تھیں' لوگ ان کے ہاتھ چومتے تھے۔ لوگ آ آ کر ان سے فتویٰ مانگتے تھے' ان سے مسئلے پوچھتے تھے۔ وہ کتابِ الٰہی کے عالم تھے۔ لہٰذا اب اگر وہ حضور ﷺ کو مان لیتے' تو ان کی حیثیت ختم ہوتی تھی۔ چنانچہ نہیں مانا۔ اس حوالے سے جان لیجیے کہ مراعات یافتہ طبقے کا ایک بڑا حصہ' جس کے موجودہ نظامِ باطل کے ساتھ مفادات وابستہ ہیں' اس دعوت پر کان نہیں دھرے گا ——— بلکہ ان کی تو کوشش یہ ہوگی کہ انقلابِ اسلامی کا راستہ روکو! نظامِ کہنہ کے پاسبانو' یہ معرضِ انقلاب میں ہے!! ان کی تو آپس میں جتھہ بندیاں بنیں گی کہ آؤ اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔

چنانچہ اب ایک ہی راستہ ہے کہ جو سلیم الفطرت لوگ آ گئے ہیں' ان کو جمع کیا جائے اور ان کا تزکیہ کیا جائے۔ ان کی نیتیں بھی خالص ہو جائیں' کوئی کھوٹ نہ رہے۔ ان کی شخصیتیں نکھر جائیں۔ لوگوں کو ان کے کردار کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہ رہے۔ یہ آزمائشوں میں سے گزریں' امتحانوں میں سے نکلیں' اور کندن بن جائیں۔ پھر ان کو منظم کرو' آرگنائز کرو اور ان کو بٹ کر کوڑا بناؤ۔ جیسے مختلف دھاگوں اور رسیوں کو بٹ دیں تو کوڑا بنتا ہے۔ علیحدہ علیحدہ دھاگا کمزور ہوتا ہے' اسے جو چاہے توڑ سکتا ہے۔ لیکن دھاگوں کو بٹ کر رسیاں اور رسیوں کو باہم بٹ کر جو کوڑا بنایا جاتا ہے یہ بہت مضبوط ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ نے یہ جو کوڑا بنایا ہے' اب یہ کوڑا باطل کے سر پر دے مارو۔ یہ ہے اصل میں فلسفہ انقلاب۔ اس کے لیے ظاہر بات ہے ٹکرانا پڑے گا۔ اور ٹکرانے کے لیے جب میدان میں آؤ گے تو یَقۡتُلُوۡنَ کے ساتھ یُقۡتَلُوۡنَ بھی ہو گا۔ جہاں قتل کرو گے وہاں خود بھی قتل ہو گے۔ تمہیں کوئی گارنٹی نہیں دی جا سکتی کہ تم قتل نہیں ہو گے۔ یہ گارنٹی تو صحابہ کرام ؓ کو بھی نہیں دی گئی۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو کوئی لوہے کا جسم نہیں دیا گیا تھا کہ برچھا اس کے پار نہیں ہو گا۔ چنانچہ وحشی کی برچھی

حضرت حمزہؓ کو ناف کے قریب لگی اور جسم کے آر پار ہوگئی۔ جب صحابہ کرام ؓ کو ایسی کوئی ضمانت نہیں دی گئی تھی تو پھر اور کون ہوگا جسے کوئی ضمانت حاصل ہو یا اللہ کی طرف سے انشورنس ہو؟ نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے تو دوٹوک الفاظ میں ارشاد فرمادیا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقٰتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ؕ﴾ (التوبۃ:۱۱۱)

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے تو اہل ایمان سے ان کے مال اور ان کی جانیں جنت کے عوض خرید لی ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں تو قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں۔''

غزوۂ بدر میں ستر قریشی مارے گئے اور صحابہ ؓ میں سے صرف تیرہ شہید ہوئے۔ ان کے علاوہ ایک زخمی تھے جو مدینہ واپسی پر راستے میں شہید ہوگئے۔ لیکن غزوۂ احد میں مسلمانوں کی ایک غلطی کی وجہ سے پانسہ بالکل پلٹ گیا اور ستر مسلمان شہید ہوگئے۔ تو ''یَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ'' کا معاملہ تو کرنا پڑے گا' انقلاب اس کے بغیر نہیں آتا۔ انقلاب کے لیے جان بھی دینی پڑے گی اور اس کے لیے طاقت کا استعمال بھی کرنا ہوگا۔

دین کے بعض حقائق کو علامہ اقبال نے بڑی خوبصورتی سے اشعار کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ ان کے یہ دو شعر ملاحظہ کیجیے:

(۱) گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد؟
گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن!

''اللہ تعالیٰ نے مجھ سے کہا کہ یہ جو میری دنیا ہے کیا یہ تمہارے لیے سازگار ہے؟ (یعنی کیا اس کا موجودہ نظام تمہیں پسند ہے؟ تم اس پر مطمئن ہو؟) میں نے عرض کیا کہ نہیں' یہ میرے لیے سازگار نہیں ہے۔ اس پر اللہ نے فرمایا کہ پھر اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دو!''

اور اس ''برہم زن!'' کا طریقِ کار کیا ہے؟ اسے اقبال نے اگلے شعر میں واضح کر دیا۔

(۲) با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!

پہلا مرحلہ درویشی یعنی دعوت و تبلیغ کا ہوگا۔ گالیاں کھا کر بھی دعائیں دینی ہوں گی۔ پتھراؤ کے جواب میں بھی پھول پیش کرنے ہوں گے۔ جو لوگ خون کے پیاسے ہیں انہیں معاف کرنا ہوگا۔ جیسے کہ اہل طائف کی طرف سے شدید ترین اذیت رسانی کے بعد بھی نبی رحمت ﷺ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلے: اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ''اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے۔ اس لیے کہ یہ جانتے نہیں ہیں''۔ دعوت کے مرحلے میں تو گویا بدھ مت کے بھکشوؤں والی روش اختیار کرنی پڑے گی۔ دعوت کے اندر تو التجا بھی ہوتی ہے' لجاجت بھی ہوتی ہے کہ اللہ کے بندو میری بات سنو! در در پر جارہے ہیں۔ کسی نے کچھ کہہ دیا' کسی نے کچھ کہہ دیا۔

رسول اللہ ﷺ طائف میں وہاں کے تینوں سرداروں سے ملے ہیں۔ ایک نے کہا: اچھا جی آپ کے سوا کوئی نہیں ملا تھا اللہ کو رسول بنانے کے لیے؟ نکل جاؤ یہاں سے! ایک نے کہا: جاؤ چلے جاؤ' میں تم سے بات بھی نہیں کرنا چاہتا۔ ایک نے کہا: یا تو تم جھوٹے ہو یا سچے ہو' اگر جھوٹے ہو تو جھوٹے کو میں منہ نہیں لگاتا اور اگر سچے ہو تو میں کہیں گستاخی کر بیٹھوں گا۔ لہٰذا بہتر ہے تم روانہ ہی ہو جاؤ۔ ایسے ایسے زہر میں بجھے ہوئے جملے محمد رسول اللہ ﷺ کو سننے پڑے۔ اور پھر جب وہاں سے واپس روانہ ہوئے تو انہوں نے وہاں کے اوباش لڑکوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا' جنہوں نے محبوبِ ربُّ العالمین ﷺ پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ تاک تاک کر ٹخنے کی ہڈی کو نشانہ بنایا جارہا ہے۔ اور اُس وقت صرف ایک ساتھی زید بن حارثہ ؓ آپ ﷺ کے ہمراہ تھے۔ ایک آدمی ایک طرف سے ہی ڈھال بن سکتا ہے۔ حضرت زید ؓ حضور ﷺ کو بچانے کے لیے' آپ ؐ کو cover کرنے کے لیے ایک طرف آتے تو اوباش دوسری اطراف سے پتھر مارتے۔ جسم اطہر لہولہان ہو رہا ہے۔ پاؤں میں آ کر خون جوتوں میں جم گیا ہے۔ پھر کچھ غشی سی طاری ہوگئی تو آپ ؐ بیٹھ گئے ہیں۔ اس پر ایک غنڈے نے ایک بغل میں ہاتھ ڈالا' دوسرے نے دوسری بغل میں' اور حضور ﷺ سے کہا کہ اٹھو' چلو! دعوت کے مرحلے میں۔ یہ نقشہ ہے اللہ کے رسول ﷺ کا۔ محبوبِ ربُّ العالمین ﷺ کا — سیّد

الاوّلین والآخرین ﷺ کا۔۔۔

رسول اللہ ﷺ پر ذاتی اعتبار سے ابتلاء اور امتحان کا یہ نقطۂ عروج (Climax) ہے۔ شہر سے باہر آ کر آپ ﷺ ایک پتھر سے ٹیک لگا کر تشریف رکھتے ہیں اور اس موقع پر وہ دعا آپؐ کی زبانِ مبارک سے نکلتی ہے کہ جس کو پڑھتے، سنتے اور سناتے وقت کلیجہ شق ہوتا ہے:

اَللّٰھُمَّ اِلَیْکَ اَشْکُوْ ضُعْفَ قُوَّتِیْ وَقِلَّۃَ حِیْلَتِیْ وَھَوَانِیْ عَلَی النَّاسِ

''اے اللہ! کہاں جاؤں، کہاں فریاد کروں، تیری ہی جناب میں فریاد لے کر آیا ہوں، اپنی قوت کی کمی اور اپنے وسائل و ذرائع کی کمی کی۔۔۔ اور لوگوں میں جو رسوائی ہو رہی ہے، اس کی''۔

اِلٰی مَنْ تَکِلُنِیْ؟ اِلٰی بَعِیْدٍ یَتَجَھَّمُنِیْ اَوْ اِلٰی عَدُوٍّ مَلَّکْتَہٗ اَمْرِیْ؟

''اے اللہ! تو مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے؟ کیا تو نے میرا معاملہ دشمنوں کے حوالے کر دیا ہے کہ وہ جو چاہیں میرے ساتھ کر گزریں؟''

اِنْ لَّمْ یَکُنْ عَلَیَّ غَضَبُکَ فَلَا اُبَالِیْ!

''پروردگار! اگر تیری رضا یہی ہے اور اگر تو ناراض نہیں ہے تو پھر میں بھی راضی ہوں، مجھے اس تشدد کی کوئی پروا نہیں ہے۔'' (ع سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!)

اَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْھِکَ الَّذِیْ اَشْرَقَتْ لَہُ الظُّلُمٰتُ

''اے ربّ! میں تیرے روئے انور کی ضیاء کی پناہ میں آتا ہوں جس سے ظلمات منور ہو جاتے ہیں۔''

اُس وقت ملک الجبال حاضر ہوتا ہے کہ اللہ نے مجھے بھیجا ہے، میں پہاڑوں پر مامور فرشتہ ہوں۔ آپؐ اگر حکم دیں تو میں ان دونوں پہاڑوں کو ٹکرا دوں جس کے مابین طائف کی یہ بستی ہے جس میں آپؐ کے ساتھ یہ سلوک ہوا ہے۔ فرمایا: نہیں، کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ ان کی آئندہ نسلوں کو ہدایت دے دے۔

اب بتائیے کون بدھ مت کا بھکشو درویشی میں اس سے آگے جائے گا؟ اور جبکہ اپنے ساتھی نگاہوں کے سامنے ذبح کیے جا رہے ہیں، حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا ذبح کی جا رہی ہیں، ان کے شوہر حضرت یاسر ؓ کو ابوجہل نے جس برے طریقے سے سرعام ٹکڑے کر دیا، اس پر بھی آپؐ نے اہل ایمان کو مشتعل نہیں ہونے دیا۔ تشدد و تعذیب کے وقت حضور ﷺ ان کے پاس سے گزرتے تو یہ فرماتے: ((اِصْبِرُوْا یَا آلَ یَاسِرَ فَاِنَّ مَوْعِدَکُمُ الْجَنَّۃَ)) ''اے یاسر کے گھر والو! صبر کرو، تمہارے وعدے کی جگہ اللہ کے ہاں جنت ہے''۔۔۔۔ لیکن ساتھیوں میں سے کسی کو اجازت نہیں دی کہ ابوجہل کی تکہ بوٹی کر دے۔ اس لیے کہ ابھی مرحلہ درویشی کا ہے ۔

نغمہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی!

ابھی ذرا اپنے جذباتِ انتقام کو تھامے رکھو! ابھی مرحلہ Passive Resistance کا ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ تمہارے ہاتھ کھول دیئے جائیں گے۔ وہ وقت آنے والا ہے کہ تمہیں اذنِ قتال ملے گا، تمہیں اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی اجازت ملے گی۔ لیکن ابھی اپنے ہاتھ باندھے رکھو! پھر وہ وقت آیا کہ اب تلواریں بھی ہیں، نیزے بھی ہیں، میدان میں آئے ہیں ﴿یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ﴾ کا نقشہ دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس سارے process کو علامہ اقبال نے دو مصرعوں میں بیان کر دیا ہے ۔

با نشۂ درویشی در ساز و دما دم زن!
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن!!

پہلا مرحلہ یہ ہوگا کہ درویشی کی روش اختیار کرو، درویشی کی خو پختہ کرتے رہو۔ دعوت و تربیت کے مرحلے میں دعوت دیتے رہو، محنت کرتے رہو، تربیت اور تزکیہ کرتے رہو اور اس دوران تمام تکلیفیں اور مصیبتیں پورے صبر کے ساتھ جھیلو اور برداشت کرو۔ ساتھ ساتھ اپنی تنظیم پر توجہ دو، ساتھیوں کو منظم کرو۔۔۔۔ اور جب تعداد کے اعتبار سے اور کیفیت و کمیت دونوں اعتبارات سے تیار ہو جاؤ کہ سیرت بھی پختہ ہو چکی ہو، تربیت بھی ہو چکی ہو، تزکیہ بھی ہو چکا ہو، قول و فعل کا تضاد نہ رہا ہو، انسان کا ظاہر باطن

ایک ہو چکا ہو، منظّم ہو چکے ہوں، ایک امیر کی دعوت پر کھڑے ہو کر لبیک کہیں اور اپنی جانوں کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو جائیں، اور اگر روکنے کا حکم دیا جائے تو رک جائیں، تو پھر نظامِ باطل سے ٹکرا جائیں ع چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن! جب خود کو پختہ کر لو تو اب اپنے آپ کو سلطنت جم پر دے مارو! یہ ہے دو مصرعوں میں پورا طریقِ انقلاب۔

سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں یہ پورا طریق انقلاب دوٹوک انداز میں بیان فرما دیا گیا ہے کہ ہم نے دلیل بھی اتار دی، بیّنہ بھی اتار دی، کتاب بھی نازل کر دی اور میزان بھی اتار دی۔ کتاب کی دعوت سے لوگ آپ کے قریب آ جائیں گے۔ لیکن اب ان کو منظّم کر کے ایک طاقت بنانا ہے تاکہ نظام باطل سے ٹکرایا جائے۔ ایسے سرفروش اور ایسے جان فروش تیار کرنے ہیں کہ جو اپنے سر کی اور جان کی بازی کھیلنے کو تیار ہوں۔ جیسے سورۃ الاحزاب میں فرمایا:

﴿مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ رِجَالٌ صَدَقُوۡا مَا عٰهَدُوا اللّٰهَ عَلَیۡهِ ۚ فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ قَضٰی نَحۡبَهٗ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّنۡتَظِرُ ۫ۖ﴾

”اہل ایمان میں وہ جوان مرد ہیں کہ جو عہد انہوں نے اللہ سے کیا تھا وہ سچا کر دکھایا۔ پس ان میں سے وہ بھی ہیں جو اپنی نذر پیش کر چکے اور جو باقی ہیں وہ منتظر ہیں کہ کب باری آئے“۔

گویا ؎

وبالِ دوش ہے سر، جسمِ ناتواں پہ مگر
لگا رکھا ہے ترے خنجر و سناں کے لیے!

تو یہ ہے وہ آیت مبارکہ جس کے بارے میں میں کہا کرتا ہوں کہ دنیا بھر کے انقلابی لٹریچر میں اس سے زیادہ عریاں انقلابی الفاظ کہیں نہیں ملتے! فرمایا: ﴿وَاَنۡزَلۡنَا الۡحَدِیۡدَ فِیۡهِ بَاۡسٌ شَدِیۡدٌ﴾ ”اور ہم نے لوہا اتارا جس میں قوت ہے جنگ کی“ ﴿وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ ”اور لوگوں کے لیے کچھ اور فائدے بھی ہیں“ ﴿وَلِیَعۡلَمَ اللّٰهُ مَنۡ یَّنۡصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالۡغَیۡبِ﴾ ”اور تاکہ اللہ دیکھے کہ کون ہیں وہ (صادق الایمان وفادار بندے) جو غیب میں رہتے ہوئے، اللہ اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں؟“ ایمان کا دعویٰ تو آسان ہے، مگر ؎

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!

محبوبیتِ الٰہی کا مقام

اس کے ساتھ سورۃ الصّف کی یہ آیت جوڑ لیجیے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِهٖ صَفًّا کَاَنَّهُمۡ بُنۡیَانٌ مَّرۡصُوۡصٌ﴾ ”اللہ کو تو محبوب ہیں (اپنے وہ بندے) جو اُس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں صفیں باندھ کر، گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں“۔

سورۃ الحدید اس اعتبار سے عجیب سورت ہے کہ اس میں لفظِ جہاد آیا نہ قتال، لیکن دونوں کے مضامین موجود ہیں۔ لفظ ”الحدید“ (لوہا) میں اسلحہ کا ذکر آ گیا۔ یہ اُمّ المسبحات ہے اور کل مسبحات کے سارے مضامین اس میں جمع ہیں۔ ﴿وَلِیَعۡلَمَ اللّٰهُ مَنۡ یَّنۡصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالۡغَیۡبِ ؕ﴾ کے الفاظ میں گویا واضح کر دیا گیا کہ اللہ کو تو محبت ان اہل ایمان سے ہے جو اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں، غیب میں ہونے کے باوجود“۔ ؎

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند!

اللہ کو محبوب اپنے وہ بندے ہیں جو لوہے کی طاقت کو ہاتھ میں لے کر اللہ کے دشمنوں کی سرکوبی کے لیے میدان میں آتے ہیں۔ وہ نہیں کہ جو ع ”تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو!“ کے مصداق اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے ضربیں لگاتے جائیں اور ساری عمر ضربیں لگاتے ہوئے ہی گزار دیں۔ نہ زندگی میں باطل کے ساتھ کبھی پنجہ آزمائی کا موقع آئے نہ کبھی باطل کو للکارنے کا۔

اس طرزِ عمل کے بارے میں میں یہ حدیث بارہا سنا چکا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ

نے ارشاد فرمایا: اَوْحَی اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ اِلٰی جِبْرَئِیْلَ عَلَیْہِ السَّلَامُ اَنِ اقْلِبْ مَدِیْنَۃَ کَذَا وَکَذَا بِاَھْلِھَا. ’’اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ فلاں فلاں بستیوں کو ان کے رہنے والوں سمیت تلپٹ کر دو۔‘‘ قَالَ : فَقَالَ : یَا رَبِّ اِنَّ فِیْھَا عَبْدَکَ فُلَانًا لَمْ یَعْصِکَ طَرَفَۃَ عَیْنٍ حضور ﷺ فرماتے ہیں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا: پروردگار! اس بستی میں تیرا فلاں بندہ بھی ہے جس نے آج تک کبھی پلک جھپکنے جتنا وقت بھی تیری معصیت میں بسر نہیں کیا‘‘۔ قَالَ : فَقَالَ : اِقْلِبْھَا عَلَیْہِ وَعَلَیْھِمْ ، فَاِنَّ وَجْھَہٗ لَمْ یَتَمَعَّرْ فِیَّ سَاعَۃً قَطُّ ’’حضور ﷺ فرماتے ہیں اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: الٹو اس بستی کو پہلے اس پر، پھر دوسروں پر۔ اس لیے کہ اس کے چہرے کا رنگ میری غیرت کی وجہ سے کبھی متغیر نہیں ہوا‘‘۔ یہ بیٹھا اپنی ذاتی نیکی، ذاتی تقویٰ، ذاتی عبادت گزاری، تہجد گزاری اور مراقبوں میں منہمک رہا اور اس کے ارد گرد باطل پروان چڑھتا رہا، پھیلتا رہا، اس کا بول بالا ہوتا رہا۔ شریعت کی دھجیاں بکھرتی رہیں اور یہ لگا رہا اپنے اسی کام میں، تو یہ دوسروں سے زیادہ بڑا مجرم ہے۔ لہٰذا الٹو اس بستی کو پہلے اس پر پھر دوسروں پر۔

دوسری طرف اگر اپنی تربیت اور اپنا تزکیہ کیے بغیر میدان میں آ جاؤ تو وہی کچھ ہو گا جو آج جہاد کے نام پر ہو رہا ہے۔ اس طرح جہاد بدنام بھی ہوگا اور فساد کی شکل اختیار کرے گا۔ کسی اجتماعیت میں نہ دعوت کا مرحلہ آیا، نہ تربیت اور تزکیہ کا، اور نہ ہی قول و فعل میں مطابقت پیدا کی گئی اور نکل کھڑے ہوئے کلاشنکوف لے کر جہاد کرنے کے لیے! چنانچہ اس جہاد کا دنیا میں مذاق اڑ رہا ہے اور جہاد بدنام ہو رہا ہے۔ اس طرح دین کی بنیادی اصطلاحات کو رسوا کیا جا رہا ہے اور اس کے نتیجے میں سوائے فساد کے کچھ حاصل نہیں ہو رہا۔

موجودہ حالات میں مسلح تصادم کا متبادل

محمد رسول اللہ ﷺ کے طریقِ انقلاب پر میری پوری کتاب ’’منہج انقلابِ نبویؐ‘‘ موجود ہے اور اس موضوع پر میرے اردو اور انگریزی خطابات کے آڈیو اور ویڈیو کیسٹس بھی موجود ہیں۔ ان خطابات میں مَیں نے پوری تفصیل سے واضح کیا ہے کہ منہج انقلابِ نبوی یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کا طریقِ انقلاب کیا ہے، اس کے مختلف مراحل کیا ہیں اور یہ کہ آج کے زمانے میں مسلح تصادم اور قتال کی متبادل کیا صورت ہے۔ آج کے دَور میں قتال یک طرفہ (one way) بھی ہو سکتا ہے۔ یک طرفہ جنگ یہ ہو گی کہ آپ منکرات کے خلاف مظاہروں اور picketing کے لیے میدان میں نکل کھڑے ہوں اور اعلان کر دیں کہ جب تک ان منکرات کا خاتمہ نہیں ہوتا، ہم ٹیکس اور لگان نہیں دیں گے۔ یہ سودی نظام جو چل رہا ہے یہ حرام ہے، ہم اسے چلنے نہیں دیں گے!! اس پر قانون نافذ کرنے والے ادارے حرکت میں آئیں گے اور آپ پر لاٹھیاں برسیں گی، گولیاں چلیں گی۔ اب اگر یہ مظاہرین ثابت قدم رہیں، جوابی کارروائی نہ کریں اور گولیوں کے سامنے سینہ سپر رہیں تو بالآخر حکومت وقت کو ہار ماننا پڑے گی اور انقلاب آ جائے گا۔ ایران کی مثال آپ کے سامنے موجود ہے کہ ایرانیوں نے تیس چالیس ہزار جانوں کی قربانی دی تو وہاں انقلاب آ گیا۔ کشمیر میں بھی چالیس ہزار جانیں دی جا چکی ہیں، لیکن وہاں ابھی اس کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ کہاں ایران جتنا بڑا ملک اور کہاں وہ کشمیر کا چھوٹا سا خطہ! اگرچہ اسے ’’ایرانِ صغیر‘‘ کہتے ہیں۔ بقول اقبال ؎

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر

کشمیریوں کا جس طرح قتل عام ہو رہا ہے اس اعتبار سے یہ اعداد و شمار غلط نہیں ہو سکتے۔ لیکن چالیس ہزار جانیں جانے کے باوجود نتیجہ کچھ نہیں —— جبکہ ایران میں اتنی تعداد میں جانیں دی گئیں تو بادشاہ کو وہاں سے بھاگنا پڑا۔ اس لیے کہ ایرانیوں کی جنگ یک طرفہ (one way) تھی۔ انہوں نے مارا کسی کو نہیں، خود مرے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خود بادشاہ کو اپنی فوج کی طرف سے یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ یہ میرا تختہ اُلٹ دے گی۔ فوج بھی تو آخر عوام میں سے ہوتی ہے۔ یہ انہی کے بھائی بند اور بھانجے بھتیجے ہوتے ہیں۔ چنانچہ عوام کے خلاف ایک حد تک کارروائی کے بعد فوج جواب دے دیا کرتی

ہے۔ یہاں پر بھی بھٹو صاحب کو فوج نے جواب دے دیا تھا کہ کب تک ہم لوگوں کو مارتے رہیں گے۔ یہ قابض فوج تو نہیں ہے' نیشنل آرمی ہے۔ کتنوں کو مارے گی اور کیوں مارے گی؟ میں نے ان کا ٹیلی ویژن انٹرویو دیکھا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ میری کرسی بہت مضبوط ہے۔ لیکن آپ نے دیکھا کہ وہ کرسی تو بڑی کمزور ثابت ہوئی۔ کرسی تو فوج کے بل بوتے پر مضبوط تھی۔ جب فوج نے جواب دے دیا تو کرسی کہاں مضبوط رہی!

سیرتِ طیبہ کے مختلف مراحل میں حکمتِ ترتیب

منہج انقلابِ نبویؐ کے ضمن میں پہلے objectively سمجھ لیجیے کہ حضورﷺ کی سیرت کے کیا مراحل تھے اور ان میں حکمتِ ترتیب کیا تھی۔ پہلے تیرہ برس تک یعنی پوری مکی زندگی میں یہ حکم تھا کہ چاہے تمہارے ٹکڑے اڑا دیے جائیں' تم ہاتھ نہیں اٹھاؤ گے۔ لیکن ہجرت کے بعد حکم آ گیا کہ ﴿وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ﴾ (البقرۃ:۱۹۰) ''اور اللہ کی راہ میں ان سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں''۔ اور ﴿وَقَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ﴾ (الانفال:۳۹) ''اور ان (کافروں) سے جنگ کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین کُل کا کُل اللہ کے لیے ہو جائے''۔ ان دو طرح کے احکام میں بظاہر زمین و آسمان کا فرق ہے' لیکن درحقیقت یہ ایک پراسیس کے دو مختلف مراحل ہیں۔ اسی طرح ایک وقت میں آنحضورﷺ دب کر صلح کر رہے ہیں۔ صلح حدیبیہ کی شرائط یقیناً بڑی غیر مساوی (unequal) تھیں اور یہ معاہدہ ہونے کے بعد مسلمان بہت رنجیدہ و دل گرفتہ ہو گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب رسول اللہﷺ نے انہیں وہیں قربانی کے جانور ذبح کر کے احرام کھولنے کا حکم دیا تو ان میں سے ایک آدمی بھی نہیں اٹھا۔ مسلمانوں کے دل اس درجے زخمی تھے کہ ہم کیوں دب کر صلح کر رہے ہیں ــــــ لیکن ایک سال کے بعد قریش کا سردار ابوسفیان چل کر مدینہ منورہ آتا ہے اور وہ خوشامدیں کر رہا ہے' سفارشیں کروا رہا ہے کہ خدا کے لیے صلح کی تجدید کر لیجیے' لیکن حضورﷺ نہیں کر رہے' کیوں؟ اس لیے کہ اب محمد رسول اللہﷺ کی جدوجہد دعوت کے مرحلے سے نکل کر جہاد وقتال کے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے ــــ اسی کے بارے میں تو ٹائن بی نے کہا تھا:

> "Muhammad failed as a prophet but succeeded as a statesman."

اس لیے کہ اس کی آنکھیں صرف ظاہر کو دیکھ رہی تھیں' آنحضورﷺ کے منہج انقلاب کی حکمتِ ترتیب سے واقف نہیں تھیں' لہٰذا اسے حضورﷺ کی زندگی میں تضاد نظر آیا اور اس نے اسے واضح کیا۔ ان مستشرقین کو مکہ والے محمدﷺ تو نبی نظر آتے ہیں' جیسے حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے۔ انہیں نظر آتا ہے کہ مکے والا محمدؐ یقیناً یحییٰ علیہ السلام اور عیسیٰؑ کی طرح دعوت دے رہا ہے' تبلیغ کر رہا ہے' ماریں کھا رہا ہے' گالیاں سن رہا ہے' لیکن وہی محمد رسول اللہﷺ مدینے میں آ کر ایک مدبر ہے' حکمران ہے' جنگجو ہے' سپہ سالار ہے۔ اور ڈاکٹر منٹگمری واٹ نے اسی فلسفے کے زیر اثر آنحضورﷺ کی حیاتِ طیبہ کے ''تضاد'' کو ظاہر کرنے کے لیے Mohammad at Mecca اور Mohammad at Medina دو کتابیں تصنیف کر ڈالیں۔ ان کی نظر میں مکے والا محمدؐ تو بالکل ہی کچھ اور تھا اور مدینے والا محمدؐ بالکل کچھ اور نظر آتا ہے۔ معاذ اللہ! وہ شخصیت ایک ہی ہے' ان کا انقلاب کا پراسیس ایک ہی ہے' لیکن اس پراسیس کے مختلف مراحل ہیں۔ اس انقلاب کا پہلا مرحلہ مکی دور پر مشتمل ہے' جس کے بارے میں اقبال نے کہا ہے ع

با نشۂ درویشی در ساز و دما دم زن!

اور دوسرا مرحلہ اسی شعر کے دوسرے مصرعے میں یوں بیان کر دیا ع

چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!!

ظاہر ہے اس کے بغیر کوئی انقلاب آ ہی نہیں سکتا۔

یہ ہے اصل میں اسلامی انقلاب کا پراسیس جو اس آیت میں بڑے واشگاف الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرما دیا۔ رسولوں کے ساتھ بیّنات' کتاب اور میزان اتارے جانے کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا: ﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ﴾ ''اور ہم نے لوہا بھی

اتارا''۔ پنجابی میں کہا جاتا ہے: ''چار کتاباں عرشوں آئیاں' پنجواں آیا ڈنڈا''۔ اس ڈنڈے کی اپنی اہمیت وضرورت ہے۔ کیا قرآن حکیم صرف اس لیے نازل ہوا ہے کہ اس کی تلاوت کرتے رہیۓ' تراویح میں پڑھتے رہیۓ اور ثواب لیتے رہیۓ؟ جبکہ قرآن خود یہ کہتا ہے کہ

﴿قُلْ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ حَتّٰی تُقِیْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ﴾ (المائدۃ:٦٨)

''اے اہل کتاب! تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو (تمہاری کوئی حیثیت ہماری نگاہ میں نہیں ہے) جب تک کہ تم تورات اور انجیل اور جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے' اس کو قائم نہیں کرتے۔''

قرآن پڑھتے رہو' قرآن سنتے رہو' قرآن یاد کرتے رہو' حسنِ قراءت کے مقابلے منعقد کرو' جشن نزولِ قرآن مناتے رہو —— لیکن اگر تم قرآن کو قائم کرنے کے لیے تیار نہیں ہو تو پھر گویا قرآن تم سے بایں الفاظ مخاطب ہے: یٰٓاَھْلَ الْقُرْاٰنِ لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ حَتّٰی تُقِیْمُوا الْقُرْاٰنَ ''اے قرآن والو! تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک تم قرآن کو قائم نہیں کرتے''۔ قرآن قائم کرو' یہ میزانِ عدل ہے' اسے نصب کرو۔ اس نے جو نظام دیا' وہ عدل وقسط پر مبنی ہے۔ جس کا جو حق ہے وہ اس کو دو اور جس کی جو ذمہ داری ہے اس کے اوپر عائد کرو۔ اگر یہ نہیں کرتے تو پھر صرف اس کی تلاوت کا جو ثواب لے رہے ہو' اس سے کہیں بڑھ کر اس کوتاہی کا گناہ ہو سکتا ہے جو تم اس کی طرف سے برت رہے ہو۔

''بِالْغَیْبِ'' کا مفہوم

﴿وَلِیَعْلَمَ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ وَرُسُلَہٗ بِالْغَیْبِ﴾ ''اور تاکہ اللہ یہ ظاہر کردے کہ کون غیب کے باوجود اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے''۔ ''بِالْغَیْبِ'' کے بارے میں مجھے مولانا اصلاحی صاحب کی یہ بات پسند ہے کہ یہاں ''بِ'' ظرفیہ ہے۔ اصل میں یہ بڑی پیاری اور فلسفیانہ بات ہے کہ اللہ غیب میں نہیں ہے' غیب میں ہم ہیں۔ عربی کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

اَغِیْبُ وَذُو اللَّطَائِفِ لَا یَغِیْبُ
وَاَرْجُوْہُ رَجَاءً لَا یَخِیْبُ

''میں غائب ہو جاتا ہوں' وہ اللہ جو ذوالطائف ہے وہ تو غائب نہیں ہوتا (وہ تو ہر آن ہر جگہ موجود ہے) اور میں اس سے ایسی امید کا طلب گار ہوں جو ناامیدی میں نہیں بدلتی''۔

چنانچہ یہ تو ہماری آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ ہم غیب میں ہیں' وہ غائب میں نہیں ہے۔ علامہ اقبال کا بڑا پیارا شعر ہے ؎

کرا جوئی؟ چرا در پیچ و تابی؟
کہ او پیداست تو زیر نقابی!

''تم کس کو تلاش کر رہے ہو؟ کس لیے پیچ وتاب کھا رہے ہو؟ وہ تو سامنے بالکل ظاہر ہے' ہاں تم خود محجوب ہو' پردے کی اوٹ میں ہو''۔

غیب کا پردہ تو تم پر پڑا ہوا ہے۔ تو بالغیب کا مفہوم ہوگا ''غیب میں ہوتے ہوئے''۔ ہم اللہ کو دیکھ نہیں رہے' پھر بھی جو شخص اللہ کے لیے تن من دھن وقف کر دے اس کے لیے اللہ کی طرف سے بڑی شاباش ہے۔ بعض احادیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کے سامنے مباہات کے انداز میں اپنے نیک بندوں کا ذکر کرتا ہے کہ میرے یہ بندے مجھ سے جنت مانگ رہے ہیں' حالانکہ انہوں نے جنت کو دیکھا نہیں ہے' اور یہ دوزخ سے پناہ مانگ رہے ہیں حالانکہ انہوں نے دوزخ دیکھی نہیں ہے۔ تو جو شخص غیب میں ہونے کے باوجود اللہ اور اس کے رسولوں کی مدد کے لیے تیار ہے اس نے جو دیکھا ہے دل کی آنکھ سے دیکھا ہے' عقل کی آنکھ سے دیکھا ہے۔ ظاہر کی آنکھ سے کچھ نہ دیکھنے کے باوجود وہ پکار اٹھتا ہے:

﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾

غیب کے ضمن میں کسی کا یہ خیال ہو سکتا ہے کہ رسول تو غیب میں نہیں تھے یا صحابہ کرام ؓ تو رسول اللہ ﷺ سے غیب میں نہیں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ صحابہؓ بھی غیب میں تھے' اس لیے کہ اُن کے سامنے جو موجود تھے وہ محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب تھے' رسول

اللہ ﷺ کی رسالت تو غیب ہی کا معاملہ ہے۔ کیا کسی نے اپنی آنکھوں سے جبرائیلؑ کو آتے ہوئے دیکھا تھا؟ جبرائیلؑ اگر کبھی انسانی شکل میں آئے بھی تھے تو وہ تو گویا ایک انسان تھا جو آیا اور مل کر چلا گیا۔ درحقیقت رسول کی رسالت بھی غیب کی بات ہی تھی اور اُس سے اس وقت وہ لوگ بھی غیب میں تھے جو سامنے نظر آتے تھے۔ اسی لیے تو ان کے درمیان منافقین کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو کہتے تھے کہ ہم ان کی ہر بات کیوں مانیں؟ ان کے بھی دو ہاتھ ہیں، دو پاؤں ہیں! البتہ جو قرآن یہ کہتے ہیں کہ ان پر نازل ہوا، اس کو ہم مان لیں گے۔ ہمارے ہاں بھی "حَسْبُنا کتابُ اللّٰہ" کے قائلین "اہل قرآن" کا جو فتنہ ہے، درحقیقت اس کی جڑیں انہی منافقوں کے ساتھ ملتی ہیں۔

تو یہ جان لیجیے کہ اصل میں جو اللہ کی مدد کر رہا ہے وہ اللہ کے رسولؐ کی مدد کر رہا ہے۔ وہ مدد درحقیقت محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب کی نہیں کر رہا، محمد رسول اللہ ﷺ کی کر رہا ہے، اور ظاہر بات ہے ان کی رسالت کا معاملہ غیب کا ہے۔ ﴿وَلِیَعْلَمَ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ وَرُسُلَہٗ بِالْغَیْبِ ؕ﴾ "تاکہ اللہ دیکھے (یا اللہ ظاہر کر دے) کون ہیں (اس کے وفادار اور صادق الایمان بندے) جو غیب میں ہونے کے باوجود اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں"۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر تلوار کی طاقت ہاتھ میں لے کر باطل نظام کا قلع قمع کرنے کے لیے میدان میں آتے ہیں، یا اگر تلوار ہاتھ میں نہیں بھی لیتے تو یک طرفہ جنگ کی صورت میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا، اس دور میں "مسلح تصادم" کے متبادل کے لیے اجتہاد کرنا پڑے گا۔ اس لیے کہ ایک تو ہمارے حکمران جیسے بھی ہیں، بہرحال مسلمان ہیں۔ دوسرے یہ کہ اب حکومتوں کے پاس بہت بڑے بڑے پیمانے پر مسلح افواج (Armed Forces) ہیں جن کا مقابلہ ممکن نہیں۔ عرب کا حال یہ تھا کہ وہاں کوئی باقاعدہ حکومت قائم نہیں تھی اور کوئی سٹینڈنگ آرمیز بھی نہیں، لہٰذا تعداد اور اسلحہ کے اعتبار سے اتنا بڑا فرق نہیں تھا۔ بدر میں تین سو تیرہ مسلمانوں کے مقابلے میں ایک ہزار کفار آئے تھے۔ اس طرح ان میں ایک اور تین کی نسبت ہوئی۔ ہتھیاروں کا فرق لگا لیجیے تو ایک اور دس کی یا ایک اور بیس کی نسبت ہو سکتی ہے۔ چلیے ایک اور سو کی نسبت ہو گی، اس سے تو زیادہ نسبت نہیں تھی۔ لیکن یہاں جاگیرداری، سرمایہ داری اور ملوکیت کا جو نظام ہے اس کی طاقت کا تو اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ شاہ فہد کی حکومت کو تحفظ دینے والے ان کی فوج بھی ہے، پولیس بھی ہے، ایئر فورس بھی ہے۔ مصر میں الاخوان کا مضبوط گڑھ "حما" ایئر فورس کے ہاتھوں تہس نہس ہو گیا تھا۔ لہٰذا یہاں اجتہاد کی ضرورت ہے۔ بہرحال جو بھی جس کا حق ہے وہ ادا کیا جانا چاہیے۔ میرے نزدیک اس دَور میں ایرانیوں نے اس کی ایک مثال پیش کی ہے کہ دو طرفہ جنگ کے بجائے یک طرفہ جنگ کا انداز اپنایا اور گولیاں کھانے کے لیے اپنے سینے کھول دیئے۔ اس ضمن میں ایسے ایسے لرزہ خیز واقعات ہوئے ہیں کہ ایک جلوس صرف خواتین کا نکلا تھا جو بچوں کو گود میں لیے ہوئے تھیں۔ ان پر فائرنگ ہوئی تو یہ گولیاں کھا کر شیر خوار بچوں سمیت سڑک پر گر پڑیں۔ جب معاملہ یہاں تک پہنچا تب شاہ کو وہاں سے تخت و تاج چھوڑ کر اس طرح بھاگنا پڑا کہ ع

دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں!

کیونکہ اب اسے اندیشہ تھا کہ کہیں فوج اچانک مجھ پر الٹ نہ پڑے۔ اس نے اسی میں عافیت سمجھی کہ اپنی جان سلامت لے کر بھاگ کھڑا ہو۔ تو یہ ہے اصل میں موجودہ حالات کے اعتبار سے اجتہاد کا معاملہ، جسے میں تفصیل سے اپنی کتاب میں درج کر چکا ہوں۔

اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ

آیت مبارکہ کے آخری الفاظ ہیں: ﴿اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ ﴾ "یقیناً اللہ بڑی قوت والا، زبردست ہے"۔ یہ نہ سمجھو کہ اللہ تم سے مدد مانگ رہا ہے تو اللہ کمزور ہے اور اس کو تمہاری مدد کی حاجت ہے۔ وہ تو القوی ہے، بڑی قوت والا ہے۔ **العزیز** ہے، زبردست ہے۔ اس کا ایک حرفِ کُن آنِ واحد میں یہ سارا نظام تلپٹ کر سکتا ہے، لیکن اصل میں پیش نظر تمہارا امتحان ہے:

﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ﴾ (الملك:٢)

’’اس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تا کہ تمہیں آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے‘‘۔

قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

تمہیں ثابت کرنا ہوگا کہ تم اس امتحان میں پورے اترے ہو۔

اس ضمن میں آیت ۱۰ اس کے ساتھ جوڑ لیجیے:

﴿لَا يَسْتَوِىْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ﴾

’’تم میں سے جو لوگ فتح کے بعد انفاق اور قتال کریں گے وہ کبھی ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جنہوں نے فتح سے پہلے انفاق اور قتال کیا۔ ان کا درجہ بعد میں انفاق اور قتال کرنے والوں سے بہت بڑھ کر ہے‘‘۔

کسی انقلاب کے جو ابتدائی مراحل ہوتے ہیں ان میں جنہوں نے اپنی جانیں کھپائیں‘ اپنے مال کھپائے‘ اپنی صلاحیتیں لگائیں‘ اپنا وقت لگایا‘ اپنی زندگی لگائی‘ ان کا جو رتبہ ہے وہ بعد والوں کو کبھی نہیں مل سکتا۔ ع ’’یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا!‘‘ بعد میں جب حالات بدل جائیں تو ان قربانیوں کی وہ قدر و قیمت نہیں رہے گی۔ نیک کام جب بھی کیا جائے گا بہرحال نیک ہے‘ اس کا ثواب ملے گا‘ لیکن قدر و قیمت میں زمین و آسمان کا فرق واقع ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ یہ سب کچھ اس لیے کرنا ہے کہ اللہ تمہیں آزمانا چاہتا ہے۔ وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے غیب کے باوجود ـــــــ جبکہ اللہ خود بڑی طاقت والا‘ زبردست ہے۔ وہ جب چاہے آنِ واحد میں اپنا نظام برپا کر سکتا ہے۔ لیکن تمہاری اطلاع و آزمائش کے لیے وہ تمہیں یہ موقع دے رہا ہے۔ آخر میں یہ شعر پھر آپ کے گوش گزار کر رہا ہوں ؎

منّت منہ کہ خدمتِ سلطاں ہمی کنی
منّت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت!

’’تم بادشاہ پر یہ احسان مت دھرو کہ تم اس کی خدمت میں مصروف ہو۔ بلکہ بادشاہ کا احسان مانو کہ اس نے تمہیں اپنی خدمت کا موقع دیا ہے‘‘۔

بابِ ھشتم

مشتمل بر

سورۃ الحدید کی آیات ۲۶ تا ۲۹

ترکِ دنیا و رہبانیت کی نفی

اور

نجات اور فوز و فلاح کی واحد راہ:

اتباعِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

☆

اعوذ باللہ من الشَّیطٰن الرَّجیم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا وَّاِبۡرٰهِيۡمَ وَجَعَلۡنَا فِىۡ
ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالۡكِتٰبَ فَمِنۡهُمۡ مُّهۡتَدٍ‌ ۚ وَكَثِيۡرٌ
مِّنۡهُمۡ فٰسِقُوۡنَ Z ثُمَّ قَفَّيۡنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمۡ بِرُسُلِنَا
وَقَفَّيۡنَا بِعِيۡسَى ابۡنِ مَرۡيَمَ وَاٰتَيۡنٰهُ الۡاِنۡجِيۡلَ ۙ وَجَعَلۡنَا
فِىۡ قُلُوۡبِ الَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡهُ رَاۡفَةً وَّرَحۡمَةً ؕ
وَرَهۡبَانِيَّةَ ۨ ابۡتَدَعُوۡهَا مَا كَتَبۡنٰهَا عَلَيۡهِمۡ اِلَّا ابۡتِغَآءَ
رِضۡوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوۡهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيۡنَا
الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡهُمۡ اَجۡرَهُمۡ‌ ۚ وَكَثِيۡرٌ مِّنۡهُمۡ
فٰسِقُوۡنَ ∝ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوۡا
بِرَسُوۡلِهٖ يُؤۡتِكُمۡ كِفۡلَيۡنِ مِنۡ رَّحۡمَتِهٖ وَيَجۡعَلۡ
لَّـكُمۡ نُوۡرًا تَمۡشُوۡنَ بِهٖ وَيَغۡفِرۡ لَـكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ
غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ β لِّـئَلَّا يَعۡلَمَ اَهۡلُ الۡكِتٰبِ اَ لَّا
يَقۡدِرُوۡنَ عَلٰى شَىۡءٍ مِّنۡ فَضۡلِ اللّٰهِ وَاَنَّ الۡفَضۡلَ
بِيَدِ اللّٰهِ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُوالۡفَضۡلِ

الْعَظِيْمِ ﴾

ہم سورۃ الحدید کے تین رکوعوں کا مطالعہ مکمل کر چکے ہیں اور اس کا آخری رکوع' جو چار آیات پر مشتمل ہے' ابھی اس کا مطالعہ باقی ہے۔ جس طرح کسی مضمون کی تکمیل کے بعد بعض اوقات اضافی وضاحت کی ضرورت پیش آتی ہے' سورۃ الحدید کے اس آخری رکوع کی نوعیت اس سورۂ مبارکہ کے باقی مضامین کے اعتبار سے قریباً وہی ہے۔ گویا یوں کہا جا سکتا ہے کہ سورۃ الحدید کا اصل مضمون ۲۵ آیات میں پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا' لیکن اس اندیشے کے پیش نظر کہ اس کا کوئی غلط نتیجہ نہ نکال لیا جائے' ایک تنبیہہ اور وارننگ کے طور پر ایک ضمیمے اور تکملے کی حیثیت سے یہ چار آیات بھی شامل کی گئیں۔ ''اینٹی کلائمکس'' کا لفظ اگرچہ قرآن حکیم کے لیے استعمال کیا جانا مناسب نہیں ہے' لیکن ہماری مجبوری ہے کہ افہام و تفہیم کے لیے ہمیں بعض ایسی اصطلاحات کا استعمال کرنا پڑتا ہے جن سے ہم عام طور پر متعارف ہیں۔ اس کو بلاتشبیہہ سمجھنا چاہیے کہ جیسے کسی مضمون کے کلائمکس کو پہنچ جانے کے بعد ایک اینٹی کلائمکس آتا ہے کچھ اسی طرح کا معاملہ سورۃ الحدید کے اس چوتھے رکوع کی چار آیات کا اس کے بقیہ تین رکوعوں کی پچیس آیات کے ساتھ ہے۔ اس لیے کہ پچیسویں آیت کے بارے میں مَیں نے عرض کیا تھا کہ یہ نہ صرف قرآن حکیم کی اہم ترین آیات میں سے ہے' بلکہ پوری دنیا میں جتنا بھی انقلابی لٹریچر موجود ہے' اس میں جامع ترین اور عریاں ترین انقلابی نظریہ اس ایک آیت میں ہے۔

سابقہ مضامین پر نگاہِ بازگشت

سورۃ الحدید کی آخری چار آیات کا مطالعہ کرنے سے قبل مناسب ہوگا کہ ہم تیزی کے ساتھ ایک طائرانہ نگاہ ان مضامین پر ڈال لیں جن کا ہم مطالعہ کر چکے ہیں۔ ہم نے تفہیم کی غرض سے اس سورۂ مبارکہ کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ اب میں ان حصوں کو کچھ ترمیم کے ساتھ بیان کر رہا ہوں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک حصے میں کوئی نہ کوئی آیت ایسی آئی ہے جس کی نظیر پورے قرآن حکیم میں نہیں ملتی۔ اس

سورۂ مبارکہ کا پہلا حصہ جو چھ آیات پر مشتمل ہے' قرآن حکیم میں ذات و صفاتِ باری تعالیٰ کے بیان پر جامع ترین مقام ہے' نیز یہ ذات و صفاتِ باری تعالیٰ سے متعلق مشکل ترین مسائل سے بلند ترین علمی سطح پر بحث کرتا ہے۔ اس حصے کی عظیم ترین آیت ہے: ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ﴾ اللہ تعالیٰ کے ان چار اسماء کے حوالے سے ہم نے فلسفۂ وجود' ماہیتِ وجود اور ربط الحادث بالقدیم جیسے مسائل پر گفتگو کی' جو فلسفے اور علمِ کلام کے اہم ترین اور مشکل ترین مسئلے ہیں۔

اس سورۂ مبارکہ کا دوسرا حصہ بھی چھ آیات (۷-۱۲) پر مشتمل ہے۔ ان آیات میں باہمی ربط اور نظم اتنا نمایاں اور ظاہر و باہر ہے کہ کم از کم میرے نزدیک قرآن حکیم میں اس کی کوئی دوسری نظیر موجود نہیں۔ ان میں سے پہلی آیت (آیت ۷) میں دین کے تمام تقاضوں کو دو اصطلاحات (ایمان اور انفاق) میں بیان کر دیا گیا: ﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا﴾ ''ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر (جیسا کہ ایمان لانے کا حق ہے) اور خرچ کرو (اللہ کی راہ میں)۔'' پھر آیت ۸ اور ۱۰ میں زرا زجر کا انداز اختیار کیا گیا: ﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ ''تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں رکھتے؟ (جیسا کہ ایمان کا حق ہے)۔'' اور ﴿وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ''تمہیں کیا ہو گیا ہے کیوں خرچ نہیں کرتے اور کھپاتے اللہ کی راہ میں؟ (جیسا کہ خرچ کرنے اور کھپانے کا حق ہے)۔'' جبکہ آیت ۹ اور ۱۱ میں ترغیب و تشویق اور حوصلہ افزائی کا انداز ہے۔ آیت ۹ کا مضمون یہ ہے کہ اگر اپنے باطن میں جھانکو اور محسوس کرو کہ واقعی اور حقیقی ایمان موجود نہیں ہے تو قرآن حکیم کی طرف رجوع کرو جو منبع ایمان ہے ﴿هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ﴾ یہ قرآن موجود ہے' اس کی آیاتِ بینات سے اپنے سینے کو منور کرو' ایمانِ حقیقی کی نعمت تمہیں یہاں سے مل جائے گی۔ پھر یہ کہ انفاق کے لیے ترغیب کا جو بہت ہی مؤثر انداز ہو سکتا ہے وہ آیت ۱۱ میں اختیار کیا گیا' جس کے لیے میں نے غالب کا یہ مصرعہ آپ کو سنایا تھا ع ''کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق؟'' ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ

يُقۡرِضُ اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا﴾ ''کون ہے وہ جو قرض دے اللہ کو قرضِ حسنہ؟'' اب یہ پانچ آیتیں ہو گئیں۔ چھٹی آیت کو میں اس مرتبہ اسی دوسرے حصے میں شامل کر رہا ہوں۔ ان آیات میں دین کے جو تقاضے (ایمان اور انفاق) بیان ہوئے، جو شخص ان دونوں تقاضوں کو پورا کر دے گا تو اس کے لیے قیامت کے دن میدانِ حشر میں نور کا ظہور ہو گا۔ فرمایا: ﴿یَسۡعٰی نُوۡرُهُمۡ بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِمۡ وَبِاَیۡمَانِهِمۡ﴾ ''اُن کا نور اُن کے سامنے اور اُن کے دائیں طرف دوڑ رہا ہو گا۔ نورِ ایمان ان کے سامنے ہو گا اور نورِ انفاق ان کے دائیں طرف۔ اس لیے کہ انفاق دائیں ہاتھ سے کیا جاتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی بڑی پیاری حدیث ہے کہ اللہ کی راہ میں اس طور سے مال خرچ کرو کہ تمہارا داہنا ہاتھ جو دے وہ تمہارے بائیں ہاتھ کے علم میں نہ آئے۔

تیسرا حصہ آیت ۱۳ سے آیت ۱۵ تک تین آیات پر مشتمل ہے۔ اس کے لیے عنوان ہے ''تفریق المسلمین بین المؤمنین والمنافقین''۔ دنیا میں جو لوگ مسلمان سمجھے جاتے تھے، قیامت کے روز ان کے مابین تمیز اور تفریق کی جائے گی۔ یہ وہی مرحلہ ہے جسے ہم عام طور پر ''پل صراط'' کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ میدانِ حشر کے مراحل میں سے ایک مرحلہ ہے جب ایک چھلنی لگے گی کہ وہ مسلمان جو حقیقی ایمان سے بہرہ ور ہوں گے وہ اس راستے سے گزر کر جنت میں داخل ہو جائیں گے، جبکہ وہ لوگ جو حقیقی ایمان سے محروم تھے، بلکہ ان کے دلوں میں نفاق کا روگ تھا، وہاں پر ٹھوکریں کھاتے ہوئے جہنم میں جا گریں گے۔ آیت ۱۴ نفاق کی حقیقت اور اس کے مراحل و مدارج کے موضوع پر قرآن حکیم کی جامع ترین آیت ہے۔ نفاق کا اصل سبب کیا ہے؟ یہ کہ انسان مال اور اولاد سے اس حد سے زیادہ محبت کرے جس حد تک محبت کرنا درست ہے۔ اگر مال اور اولاد کی یہ محبت انسان کے دل پر ضرورت سے زیادہ قابو پا لے تو گویا اُس نے اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں فتنے میں ڈال دیا۔ اب اس کے بعد مزید مراحل ہیں۔ فرمایا: ﴿وَلٰكِنَّكُمۡ فَتَنۡتُمۡ اَنۡفُسَكُمۡ وَتَرَبَّصۡتُمۡ وَارۡتَبۡتُمۡ وَغَرَّتۡكُمُ الۡاَمَانِیُّ حَتّٰی جَآءَ اَمۡرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمۡ بِاللّٰهِ الۡغَرُوۡرُ﴾ ''لیکن تم نے اپنے آپ کو (اپنے ہاتھوں) فتنے میں ڈالا اور پھر تم گومگو کی کیفیت میں مبتلا ہو گئے اور تم شکوک و شبہات میں مبتلا ہو گئے اور تمہیں آرزوؤں نے دھوکے میں ڈالے رکھا، یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آ گیا اور وہ بڑا دھوکے باز (شیطان) تمہیں اللہ کے معاملے میں دھوکہ دیتا رہا''۔ اور پھر اس کا جو انجام ہے وہ بیان فرما دیا: ﴿فَالۡیَوۡمَ لَا یُؤۡخَذُ مِنۡكُمۡ فِدۡیَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا﴾ ''پس آج نہ تو تم سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ کافروں سے''۔ دنیا میں منافق اہلِ ایمان کے ساتھ گڈمڈ تھے، آخرت میں اُن کا حشر کافروں کے ساتھ ہو گا۔

چوتھا حصہ ۱۶ سے ۱۹ تک، چار آیات پر مشتمل ہے، جس کے لیے میں نے جامع عنوان ''سلوکِ قرآنی'' تجویز کیا تھا۔ آیت ۱۶ کا مضمون یہ ہے کہ دیکھو اگر تنبّہ ہو گیا ہے، اگر حقیقت کا انکشاف ہو گیا ہے، اگر اللہ نے اپنے اندر جھانکنے کی توفیق عطا کر دی ہے، اگر یہ احساس ہو گیا ہے کہ ایمانِ حقیقی سے محرومی ہے، تو اب کمرِ ہمت کسو اور اس وقت کو ہاتھ سے جانے نہ دو! کہیں تاخیر و تعویق کے فتنے میں مبتلا نہ ہو جانا! فرمایا: ﴿اَلَمۡ یَاۡنِ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ تَخۡشَعَ قُلُوۡبُهُمۡ لِذِكۡرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الۡحَقِّ﴾ ''کیا ابھی وقت نہیں آیا اہلِ ایمان کے لیے (ایمان کے دعوے داروں کے لیے) کہ ان کے دل واقعتاً جھک جائیں اللہ کی یاد کے لیے اور (وہ تسلیم کر لیں اس سب کو) جو حق میں سے نازل ہوا ہے''۔ گویا کہ جھنجھوڑنے کا انداز ہے کہ اب مزید تاخیر کا موقع نہیں ہے۔

دوسری طرف اگر تم اپنے اندر جھانک کر محسوس کر رہے ہو کہ دل میں سختی موجود ہے، تو گھبراؤ نہیں، مایوس نہ ہو، بددل نہ ہو۔ ﴿اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ یُحۡیِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا﴾ ''جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد ازسرِ نو زندگی عطا فرما دیتا ہے''۔ دیکھو اللہ تعالیٰ مردہ زمین پر بارش برسا کر اسے ازسرِ نو حیاتِ تازہ عطا کر دیتا ہے۔ کیا عجب کہ وہ تمہارے دلوں کی زمین کو بھی ایمان کی لہلہاتی فصل سے دوبارہ زندہ کر دے۔ اس کے لیے جو شرط لازم ہے وہ اگلی آیت میں بیان کر دی گئی۔

نفاق کا اصل سبب حبِّ دنیا ہے، جس کی سب سے بڑی علامت حبِّ مال ہے۔ چنانچہ علاج بالضد کے اصول پر نفاق کا علاج یہ ہوگا کہ خرچ کرو، لگاؤ، کھپاؤ اللہ کی راہ میں۔ فرمایا: ﴿اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ﴾ ''یقیناً کثرت کے ساتھ صدقہ کرنے والے مرد اور عورتیں اور جنہوں نے اللہ کو قرضِ حسن دیا ہے، ان کو یقیناً کئی گنا بڑھا کر دیا جائے گا اور اُن کے لیے بہترین اجر ہے''۔ گویا مال کی محبت کو ہر دو طریقے پر دل سے نکالنا ہوگا، محتاجوں کی فلاح و بہبود پر خرچ کر کے بھی اور اللہ کے دین کے قیام کی جدوجہد کے لیے بھی۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ حبِّ مال ایک طرح کا بریک ہے۔ اگر بریک لگا ہوا ہو تو آپ ایکسیلیٹر کو خواہ کتنا ہی دبائیں گاڑی نہیں چلے گی۔ پہلے بریک کھولیے، پھر ایکسیلیٹر کو دبایئے تو گاڑی چلے گی۔ لہٰذا مال کی محبت کا یہ بریک کھول دو۔ اب اپنے ایمان کی تجدید کرو اور اپنی کشتِ قلب میں از سرِ نو بیج ڈالو اور اس کی آبیاری کرو۔ پھر تمہیں لہلہاتی ہوئی بہار نصیب ہوگی اور اپنی افتادِ طبع کے اعتبار سے بلند ترین مقامات میں سے صدیقیت یا شہادت کے رتبے تک فائز ہو جاؤ گے۔ فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ﴾ ''اور جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر وہی ہیں صدیق اور شہید اپنے رب کے پاس۔ ان کے لیے محفوظ ہے ان کا اجر بھی اور ان کا نور بھی''۔

سورۃ الحدید کا پانچواں حصہ آیات ۲۰ تا ۲۴، پانچ آیات پر مشتمل ہے۔ حیاتِ دُنیوی کی اصل حقیقت اور خاص طور پر اس کے مراحل و ادوار کے بیان کے ضمن میں آیت ۲۰ قرآن مجید کی عظیم ترین آیت ہے اور اس کی کوئی نظیر قرآن میں موجود نہیں۔ فرمایا: ﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِى الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ﴾ اس ایک آیت میں انسانی زندگی کے پانچ ادوار گنوا دیے گئے ہیں: (i) بچپن کا کھیل کود۔ (ii) نوجوانی کا لہو اور تلذذ (sensual gratification)۔ (iii) زینت و زیبائش اور آرائش۔ (iv) باہمی تفاخر۔ یعنی اپنی دولت، نسل، علم، عقل، ذہانت و فطانت یا کسی اور استعداد اور صلاحیت پر فخر۔ (v) اموال و اولاد میں کثرت کی خواہش۔ اسی کا تکملہ آخری پارے کی سورتوں میں سورۃ التکاثر ہے۔ پھر اس کے لیے ﴿كَمَثَلِ غَيْثٍ ......الخ﴾ کے الفاظ میں بہترین تشبیہ دی گئی کہ جیسے بارش کے بعد زمین سے سبزہ اگتا ہے اور جب فصل اُپکتی ہے تو کاشتکار کو کس قدر خوشی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اس کے بعد اسی فصل پر زردی آتی ہے اور پھر وہ چُورا چُورا ہو کر بھس بن جاتی ہے۔ پھر وہی کھیت ویرانی کا منظر پیش کر رہا ہوتا ہے۔ گویا حیات کا ایک دور جو آیا تھا وہ ختم ہو گیا۔

اس کے ساتھ ہی فرمایا کہ اصل میں حیاتِ دنیوی کا نصب العین تو یہ ہونا چاہیے: ﴿سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ﴾ ''ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے رب کی مغفرت اور اُس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین جیسی ہے۔ یہ تیار کی گئی ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر''۔ یہ ہے مومن کا نصب العین۔ باقی تمام چیزیں فرائض کے درجے میں رہیں گی، نصب العین اس کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔

اس حصے میں بیان ہونے والا تیسرا اہم مضمون یہ ہے کہ انسان پر آنے والی ہر مصیبت اللہ کی طرف سے پہلے سے طے ہوتی ہے۔ اس دنیا کی زندگی میں انسان مختلف حوادث اور آفاتِ ارضی و سماوی سے بہت متاثر ہوتا ہے۔ کبھی تکالیف آ گئیں، کوئی بیماری آ گئی، کوئی نقصان ہو گیا، کوئی عزیز فوت ہو گیا، یا یہ کہ اقامتِ دین کی جدوجہد میں انسان مختلف خطرات سے دوچار ہوتا ہے اور اسے جان و مال کے ضیاع کا خوف لاحق ہو جاتا ہے۔ یہاں ان سب سے نجات دلانے والی بات فرما دی گئی: ﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِىْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا﴾ ''نہیں نازل ہوتی کوئی نازل ہونے والی زمین میں اور نہ تمہارے اپنے نفسوں میں مگر یہ کہ وہ ایک کتاب میں درج ہے اس سے پہلے کہ ہم اسے ظاہر

کریں‘‘۔انسان اپنے فرائض سے گریز کے لیے اس کو بہانہ بنائے تو یہ گویا اس کی
نادانی اور ناسمجھی ہے۔ وہ تو آ کر رہنے والی چیزیں ہیں اور ان کا اصل مقصد ابتلاء‘
آزمائش اور امتحان ہے جو حیاتِ دُنیوی کی اصل غرض و غایت ہے۔ازروئے الفاظِ
قرآنی: ﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ ’’اس نے
موت اور زندگی کی تخلیق فرمائی تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں کون اچھے اعمال کرتا ہے۔‘‘

سورۃ الحدید کا چھٹا حصہ ایک آیت پر مشتمل ہے‘ جس کے بارے میں مَیں نے
عرض کیا تھا کہ یہ اس سورۂ مبارکہ کا کلائمکس ہے: ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا
مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ ’’ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو
واضح تعلیمات اور واضح نشانیوں کے ساتھ اور ان کے ساتھ ہم نے کتاب اور میزان
اتاری‘ تاکہ لوگ عدل پر قائم ہوں۔‘‘ یعنی نبوت و رسالت اور کتاب و میزان کا اصل
مقصد اور اصل ہدف قیامِ نظامِ عدلِ اجتماعی ہے۔ جہاں تک انفرادی سطح پر ایک بندۂ
مؤمن کے نصب العین کا تعلق ہے وہ آخرت کی فلاح و نجات‘ حصولِ مغفرت اور
حصولِ جنت ہے۔لیکن دنیا میں اس کی مساعی‘ اس کی جدوجہد‘ بھاگ دوڑ کا ہدف‘ بلکہ
اس کے دوسرے فرائضِ دینی کا نقطۂ عروج نظامِ عدلِ اجتماعی کا قیام ہے۔اس مقصد
کے لیے جہاں دعوت و تبلیغ‘ تعلیم و نصیحت‘ تلقین و تشویق اور ترغیب و ترہیب کی
ضرورت ہے وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ قوت فراہم کرو اور وقت آنے پر قوت کا
استعمال کرو۔ جو لوگ بھی اس نظامِ عدلِ اجتماعی کے قیام کی راہ میں مزاحم ہوں اُن کے
ساتھ مقابلہ کرو۔ یہاں تک کہ ضرورت ہو تو ان کی سرکوبی کرو۔ ہم نے لوہا اسی لیے
اتارا ہے: ﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ
يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ﴾ ’’اور ہم نے لوہا بھی اتارا ہے جس میں شدید جنگ
کی صلاحیت ہے اور لوگوں کے لیے دوسری منفعتیں بھی ہیں‘ اور تاکہ اللہ یہ ظاہر کر دے
کہ کون ہے وہ جو غیب کے باوجود اللہ اور اُس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے‘‘۔ یہ اس سورۂ
مبارکہ کا کلائمکس ہے۔

اعمالِ صالحہ کے نقطۂ عروج پر شیطان کا اِغوا و اِضلال

اب دیکھئے‘ یہاں ایک بات سامنے آ رہی ہے کہ دین کی شاہراہ پر چلتے ہوئے
ایک بندۂ مؤمن تدریجاً نقطۂ عروج پر پہنچ گیا۔ظاہر بات ہے کہ شیطان انسان کا ازلی
دشمن ہے لہٰذا اس نقطۂ عروج پر پہنچ کر بھی وہ شیطان کے اغوا و اضلال سے محفوظ و مامون
نہیں ہو سکتا۔ اور شیطان کا معاملہ یہ نہیں ہے کہ وہ ایک ہی ہتھیار سے سب کو شکار کرنا
چاہے۔وہ مختلف ذہنی سطح اور مختلف افتادِ طبع کے لوگوں کو مختلف حربوں سے زیر کرنے کی
کوشش کرتا ہے۔کوئی شخص ایمان اور عملِ صالح کی منزلیں طے کرتا ہوا دین کی شاہراہ
پر گامزن ہے تو اسے آخری منزل سے ہٹانے کے لیے شیطان کا اغوا اور اضلال یہ ہے
کہ اس کی جدوجہد کو اقامتِ دین کے رخ سے موڑ کر تزکیہ کے خانقاہی تصور کی طرف
منعطف کر دیا جائے کہ بس اپنی ہی ذات کو رگڑے جاؤ‘ اسی کو مانجھے جاؤ‘ اسی کو
سنوارے جاؤ۔

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے!

تاکہ یہ نظامِ باطل کو چیلنج نہ کرے اور میرے استبداد‘ میرے استیلاء‘ میری حکومت اور
میرے غلبے کے لیے چیلنج نہ بن جائے۔ لگا رہے نمازوں میں‘ روزانہ روزے رکھے‘
پوری پوری رات کھڑا رہا کرے۔ اپنی دانست میں منکرات اور حرام سے بچنے کے لیے
نہایت خوردہ گیری اور خوردہ بینی سے کام لے‘ لیکن میرے مقابلے میں نہ آئے‘ میرے
نظام کو چیلنج نہ کرے‘ استحصالی و استبدادی نظام کے لیے خطرہ نہ بنے۔ایک شخص یہاں
تک آ گیا کہ اس نے اللہ کو پہچان لیا‘ آخرت کو جان لیا‘ اس نے طے بھی کر لیا کہ مجھے
اللہ ہی کی رضا حاصل کرنی ہے۔یعنی اس کا نصب العین بھی درست ہو گیا۔ پھر یہ کہ
اپنے نفس کے حربوں اور ہتھکنڈوں سے بھی اس نے آزادی حاصل کر لی ہے‘ گناہوں
سے بچ رہا ہے‘ حرام خوری سے اجتناب کر رہا ہے‘ فواحش و منکرات سے بچ گیا ہے۔ یہ
سارے ہفت خوان طے کر چکا ہے۔لیکن آخری مرحلے پر شیطان جو داؤ اور اڑنگا لگاتا

ہے وہ یہ ہے کہ اب اس کا رخ موڑ دو اور اسے اپنی ذاتی اصلاح ہی کے اندر لگائے رکھو' تا کہ یہ کہیں نظام کی اصلاح کے لیے میدان میں نہ آ جائے۔ یہ ہے درحقیقت شیطان کا آخری حربہ جو وہ نیک لوگوں پر آزماتا ہے اور ان کی نیکی کو بدی کے لیے چیلنج نہیں بننے دیتا' بلکہ انہیں ان کی انفرادی نیکی کے اندر محو کر کے رکھ دیتا ہے۔

اس آخری حصے میں شیطان کے اس حربے کے خلاف ایک تنبیہہ آ رہی ہے' اور چونکہ انبیاء و رُسل کی اُمتوں میں سے ایک اُمت کی ایسی مثال موجود ہے' لہٰذا اسے یہاں اُجاگر کیا جا رہا ہے' تا کہ ایک نشانِ عبرت سامنے موجود رہے کہ بالفعل ایسا ہوا ہے اور شیطان نے یہ داؤ آزما کر ایک بڑی عظیم اُمت کو ایک غلط رخ پر ڈال دیا ہے۔ یہ درحقیقت حضرت عیسٰی علیہ السلام کے پیروکاروں کی مثال ہے جنہوں نے اپنی اسی ذاتی انفرادی نیکی کے غلبے کے زیر اثر اور غیر معتدل تصور کے تحت رہبانیت کا نظام ایجاد کر لیا۔ جبکہ اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ اس کے وفادار بندے لوہے کی طاقت ہاتھ میں لے کر میدان میں آئیں اور اللہ کی مدد بھی کریں اور اللہ کے رسولوں کی مدد بھی کریں۔ دین اللہ کا ہے۔ اسے قائم کرنے کی جدوجہد گویا اللہ کی مدد ہے اور چونکہ رسولؐ کو بھیجا ہی اس لیے گیا ہے کہ اس دین کو غالب کرے' لہٰذا یہ گویا رسولؐ کی بھی مدد ہے۔ یہی بات سورۃ الصّف کی آخری آیت میں فرمائی گئی ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوٰرِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوٰرِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ﴾

''اے ایمان والو! اللہ کے مددگار بن جاؤ' جس طرح عیسٰیؑ بن مریم نے حواریوں سے کہا تھا کہ کون ہے میرا مددگار اللہ کی طرف؟ حواریوں نے کہا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار!''

اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے اب ہم ان آیات کا مطالعہ شروع کرتے ہیں۔ ارشاد ہوا:

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِیْمَ وَجَعَلْنَا فِیْ ذُرِّیَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَكَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۲۶﴾

''ہم نے نوحؑ اور ابراہیمؑ کو بھیجا اور ان دونوں کی نسل میں نبوت اور کتاب رکھ دی' پھر ان کی اولاد میں سے کسی نے ہدایت اختیار کی اور بہت سے فاسق ہو گئے''۔

یہ ایک بڑی پُرشکوہ تمہید ہے آگے زیر بحث آنے والے اس مضمون کے لیے کہ حضرت عیسٰیؑ کے پیروکار جس غلط رخ پر پڑ گئے تھے تم بھی کہیں اس رخ پر نہ پڑ جانا۔ اس سے تمہیں پیشگی طور پر متنبہ کیا جا رہا ہے۔ تو گویا اصلاً مقصود حضرت عیسٰی علیہ السلام کا تذکرہ ہے' لیکن قرآن کا یہ اسلوب ہے کہ بات کا آغاز پُرشکوہ تمہید سے کیا جاتا ہے۔ اس اسلوب کی ایک مثال سورۂ آل عمران میں ہے کہ اصلاً تذکرہ تو حضرت عیسٰی اور حضرت مریم کا' اور حضرت زکریا اور حضرت یحیٰی (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کا کرنا ہے' لیکن اس کا آغاز آیت ۳۳ سے بایں الفاظ کیا گیا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ۳۳﴾ اس اسلوب کا مفاد یہ ہے کہ جس موضوع پر گفتگو ہونی ہے اس کا اصل پس منظر اور سیاق و سباق (context) معین ہو جائے۔ تو یہاں پر بھی ایک پرشکوہ تمہید کے طور پر یہ مضمون آیا ہے۔

تاریخِ نبوت و رسالت کا ایک تحقیق طلب پہلو

فرمایا: ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِیْمَ﴾ ''اور ہم نے بھیجا نوحؑ کو اور ابراہیمؑ کو'' ﴿وَجَعَلْنَا فِیْ ذُرِّیَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ﴾ ''اور ہم نے رکھ دی انہی دونوں کی نسل میں نبوت اور کتاب''۔ یہ معاملہ تاریخ نبوت و رسالت کے اعتبار سے محققین کے لیے نہایت اہم رہنمائی کا حامل ہے۔ یہاں یہ مضمون ضمنی طور پر آیا ہے' اور میں بارہا عرض کر چکا ہوں کہ قرآن حکیم میں اہم ترین علمی مضامین اکثر و بیشتر ضمنی طور پر آتے ہیں۔ ایک ہے قرآن کی ہدایت' تذکرہ' ذکریٰ' یاددہانی' وہ تو قرآن مجید میں آپ کو سطح پر ملے گی' وضاحت سے ملے گی' بتکرار و اعادہ ملے گی' اور ایسی سطح پر ملے گی جس کو ایک عام انسان بھی بآسانی سمجھ لے۔ لیکن جو علمی نوادر اور اعلیٰ علمی و عقلی نکات ہیں وہ آپ کو

ضمنی طور پر اس انداز سے ملیں گے کہ عام آدمی تو اس پر سے گزر جائے‘ یہاں رکے نہیں‘ اس کا ذہنی تسلسل ٹوٹنے نہ پائے اور وہ تذکرہ کے عمل میں کہیں کوئی رخنہ نہ پائے‘ لیکن جس شخص کے ذہن میں علمی اشکالات اور سوالات ہیں‘ جو کسی تحقیق میں سرگرداں ہے‘ وہ وہاں پر پہنچے تو رک جائے اور پھر وہ اپنا ہائی پاور لینز (lense) فوکس کر کے بیٹھ جائے کہ جا ایں جاست! اسے محسوس ہو کہ اس مقام سے تو مجھے بڑی رہنمائی مل رہی ہے۔

اس ضمن میں اب ہم تجزیہ کرتے ہیں۔ جہاں تک حضرت نوح علیہ السلام کا معاملہ ہے وہ تو بالکل واضح ہے۔ اس لیے کہ آپؑ آدم ثانی ہیں‘ پوری موجودہ نسلِ انسانی حضرت نوحؑ کی اولاد سے ہے۔ قرآن مجید سے بھی اس کی گواہی ملتی ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ﴾ (الصّٰفّٰت) ”ہم نے صرف اسی کی نسل کو باقی رکھا“۔ حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت نوح علیہ السلام تک ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ زمانی فصل کتنا ہے۔ لیکن بہر حال اس دور میں جتنی بھی نسلیں آدم علیہ السلام کی پھیلی ہیں وہ سب کی سب ہلاک کر دی گئیں‘ سوائے حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد اور ان کے اہلِ ایمان ساتھیوں کے۔ گمان غالب یہ ہے کہ سوائے ان کے اپنے بیٹوں اور ان کی بیویوں کے اور کوئی بھی باقی نہیں بچا تھا۔ واللہ اعلم! لیکن اگر کوئی تھے بھی تو ان کی نسل آگے نہیں چلی۔ نسل صرف حضرت نوح علیہ السلام کی چلی ہے۔ آج پوری نسلِ انسانی حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں حضرت سام‘ حضرت حام اور حضرت یافث کی اولاد سے ہے۔ یعنی آج دنیا میں جتنی بھی اقوامِ عالم ہیں‘ سب کی سب انہی تینوں کی نسلوں سے ہیں۔ لہٰذا اس میں تو کوئی اشکال اور اشتباہ نہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام سے حضرت ابراہیم علیہ السلام تک نبوت حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد ہی میں رہی۔ البتہ حضرت ابراہیمؑ کا معاملہ بہت اہم ہے۔ ظاہر بات ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے بعد جب ان کی نسل آگے چلی تو دُنیا میں اور اقوام بھی موجود تھیں۔ حضرت سام کی اولاد کی بھی اور بہت سی شاخیں ہیں۔ ان کے علاوہ حضرت حام اور حضرت یافث کی اولاد سے کئی نسلیں اور ان کی شاخیں ہیں۔ لیکن قرآن معین طور پر کہتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد نبوت اور کتاب کا معاملہ صرف نسلِ ابراہیمی کے ساتھ مختص کر دیا گیا۔ اور جیسا کہ میں نے بارہا عرض کیا ہے کہ اہم مضامین قرآن مجید میں کم سے کم دو جگہ ضرور آتے ہیں۔ لہٰذا اس مضمون کا مثنیٰ سورۃ العنکبوت کی آیت ۲۷ ہے‘ جہاں تعین کے ساتھ واحد کے صیغے میں حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں یہ بات کہی گئی: ﴿وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ﴾ ”ہم نے ابراہیمؑ کو اسحاقؑ (جیسا بیٹا) اور یعقوبؑ (جیسا پوتا) عنایت فرمایا اور ہم نے اس کی نسل میں نبوت اور کتاب رکھ دی“۔ نوٹ کیجیے کہ یہاں ”فِيْ ذُرِّيَّتِهِمْ“ نہیں‘ بلکہ واحد کی ضمیر کے ساتھ ”فِيْ ذُرِّيَّتِهٖ“ فرمایا۔ ﴿وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ ”اور ہم نے اسے اس دنیا کی زندگی میں بھی اس کا اجر بھرپور طریقے پر عطا فرمایا اور آخرت میں تو وہ یقیناً ہمارے نیکوکار بندوں میں سے ہوگا“۔ اب اس سے جو بات سامنے آ رہی ہے اس پر غور کیجیے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام آج سے کم از کم چار ہزار برس قبل کی شخصیت ہیں۔ میرا اندازہ چار سے ساڑھے چار ہزار برس تک کا ہے۔ اس لیے کہ مصر سے بنی اسرائیل کا خروج (exodus) چودہ سو قبلِ مسیح سے لے کر تیرہ سو قبلِ مسیح تک کے درمیان کا زمانہ ہے۔ چنانچہ ۳۴۰۰ برس تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہو چکے ہیں۔ اب ان سے پہلے کئی سو برس حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مابین گزرے ہیں‘ جس کے دوران بنی اسرائیل کی تعداد میں اس قدر اضافہ ہوا کہ صرف ستر بہتر افراد کا قافلہ جو مصر میں داخل ہوا تھا وہ وہاں سے چھ لاکھ کی تعداد میں نکلا ہے۔ یعنی اس میں خاصا وقت لگا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کم از کم پانچ سو برس کا معاملہ ہے‘ جن میں سے ان کے دو اڑھائی سو برس تو بڑے عیش و آرام میں گزرے‘ جیسے کہ پیرزادے ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ حضرت یوسف علیہ السلام سے اُس وقت کے شہنشاہِ مصر کو جو عقیدت ہو گئی تھی اس کے نتیجے میں انہیں اور ان کے خاندان کو ازحد عقیدت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا

تھا۔ اس کے علاوہ کچھ اور تاریخی عوامل بھی تھے۔ اُس دور کے شہنشاہانِ مصر ’’چرواہے بادشاہ‘‘ (Hyksos Kings) قبطی النسل لوگ نہیں تھے‘ بلکہ وہ عرب ہی کے کسی علاقے سے آئے تھے‘ لہٰذا سیاسی مصلحت کے تحت انہیں ضرورت تھی کہ کوئی ایسی قوت وہاں موجود رہے جسے وہاں کی مقامی آبادی قبطی نسل کے لیے کاؤنٹر ویٹ کی حیثیت حاصل رہے۔

دوسری طرف حضرت یوسف علیہ السلام سے گرویدگی اور عقیدت مندی کا بھی یہ نتیجہ تھا کہ حضرت یوسفؑ کے خاندان کو ’’جشن‘‘ کے علاقے میں آباد کیا گیا جو مصر کا بہترین اور نہایت زرخیز علاقہ تھا۔ لیکن جب وہاں ایک قومی انقلاب آ گیا اور وطن کے سپوتوں (sons of the soil) یعنی قبطیوں نے چرواہے بادشاہوں کا تختہ اُلٹ دیا اور پھر وہاں پر فراعنہ کا دَور دوبارہ آ گیا تو اس کے بعد وہی لوگ جو کہ پہلے منظورِ نظر اور مراعات یافتہ تھے‘ وہی عتاب کا نشانہ بن گئے۔ بنی اسرائیل چونکہ دشمن کے منظورِ نظر تھے لہٰذا قبطیوں کی نظر میں دشمن ٹھہرے۔ بنی اسرائیل پر عتاب کا یہ دور بڑا طویل ہے‘ جس کے دوران نامعلوم کتنے ہزار افراد ہلاک کیے گئے۔ ان میں سے بہت سے اہرامِ مصر کی تعمیر کے دوران سرمہ بن گئے۔ ان کے اوپر بڑی بڑی چٹانیں گریں اور ان کا نام ونشان نہ رہا۔ قرآن مجید سے ثابت ہوتا ہے کہ ان پر کم از کم دو مرتبہ ایسا دَور بھی آیا جب فراعنہ مصر نے حکم دے دیا کہ ان کی نوزائیدہ اولاد میں سے بیٹوں کو قتل کر دو‘ صرف بیٹیوں کو زندہ رکھو۔ اس کے باوجود مصر سے خروج کے وقت ان کی تعداد چھ لاکھ تھی۔

یہ بات بھی واضح رہے کہ جہاں تک ہماری تاریخی معلومات کا تعلق ہے وہ اس دور سے زائد ہیں ہی نہیں۔ انسان آج تک بس پانچ ہزار سال کی تاریخ کی تحقیق کر پایا ہے۔ پاکستان کے دو قصبوں موہنجوڈرو اور ہڑپہ کے علاوہ ہریانہ (مشرقی پنجاب) میں اسی دور کی تہذیب کے کھنڈرات دریافت ہوئے ہیں۔ مصر اور عراق کے اندر بھی اسی دور کی انسانی تہذیب کے آثار ملتے ہیں۔ ہمارے عام تحقیق اور انکشافات کے ذرائع اس سے آگے نہیں پہنچ پائے۔ متذکرہ بالا دو آیات کی رو سے ان چار ساڑھے چار ہزار سال کے دوران نبوت کا معاملہ صرف نسلِ ابراہیمی میں ہوسکتا ہے۔

یہاں درحقیقت ایک بہت بڑا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ ایک طرف قرآن یہ کہتا ہے: ﴿وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ﴾ (فاطر) ’’کوئی ایسی بستی نہیں ہے کہ جس میں کوئی نہ کوئی خبردار کرنے والا نہ گزرا ہو‘‘۔ پھر سورۃ الرعد میں فرمایا: ﴿وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ یعنی ہر قوم کے لیے ہم نے ہادی بھیجے۔ تو اب ان دونوں باتوں کے درمیان مطابقت کیسے ہو‘ یہ ایک بڑا علمی مسئلہ ہے۔ اس اشکال کے حل کے لیے ہم پہلے دنیا کی باقی اقوام پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ مثلاً چین کی تہذیب بڑی قدیم تہذیب ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ چین‘ روس‘ سینٹرل ایشیا میں وسطی سلسلۂ کوہ سے پرے آباد ہونے والی اقوام‘ پھر یورپ کے میدانی علاقے اور مغربی یورپ کے اندر اترنے والی نارڈک نسلیں (Nordic Races) یہ سب حضرت یافث کی نسل سے ہیں۔ اسی طرح اِدھر ایران‘ ہند اور سندھ اور اُدھر شمالی افریقہ کے علاقے قبط اور سوڈان میں حضرت حام کی اولاد آباد ہے۔ حضرت سام کی اولاد اس تکون میں نیچے اتر گئی ہے۔ آج کل جو علاقہ کردستان کہلاتا ہے یہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا مسکن ہے‘ جس کو ’’جزیرہ‘‘ بھی کہا جاتا ہے۔ فرات اور دجلہ کے درمیان شمال میں جا کر وہ علاقہ کافی چوڑا ہو جاتا ہے۔ یہاں پر حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت ہوئی۔ وہاں سے نیچے جنوب کی طرف جزیرہ نمائے عرب تک جو قومیں اتر گئیں‘ وہ حضرت سام کی اولاد ہیں۔ اس میں عراق اور شام کے باشندوں کے علاوہ پورے جزیرہ نمائے عرب کے لوگ بھی آتے ہیں۔ اس سامی نسل کے اندر بھی بہت سے انبیاء و رسل مبعوث ہوئے ہیں۔ قرآن مجید بار بار جن قوموں کا تذکرہ کرتا ہے ان میں قومِ عاد اور قومِ ثمود کا تعلق اس سامی نسل ہی سے تھا‘ جن کی طرف بالترتیب حضرت ہود علیہ السلام اور حضرت صالح علیہ السلام بھیجے گئے تھے۔ یہ دونوں رسول حضرت ابراہیم علیہ السلام سے قبل کے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے قبل حضرت حام اور حضرت یافث کی اولاد میں بھی انبیاء کا ہونا بالکل قرین قیاس ہے‘ لیکن چونکہ ریکارڈ موجود نہیں لہٰذا ہم تعین کے ساتھ کچھ نہیں

کہہ سکتے۔ ہمیں کچھ حکماء کا تذکرہ تو ملتا ہے' مثلاً کنفیوشس کوئی بڑا حکیم و دانا انسان تھا' لیکن اس کا نبوت و رسالت کے ساتھ کوئی رشتہ وتعلق تھا یا نہیں' اس کے لیے کوئی ثبوت موجود نہیں۔ ہندوستان کے ایک عالم دین شمس نوید عثمانی صاحب نے اپنی ایک کتاب میں ایک نظریہ پیش کیا ہے جو بہت مدلل ہے۔ انہوں نے ہندوستان کی پرانی کتابوں اور سنسکرت کے اشلوکوں کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی نسل ہندوستان میں بھی آ کر آباد ہوئی اور حضرت نوح علیہ السلام کے ماننے والے ہندوستان میں موجود رہے ہیں۔ مہا نوح (The Great Noah) کا تذکرہ ان کے ہاں ''منو'' کے نام سے موجود ہے۔ عثمانی صاحب کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو جو صحیفے دیے تھے اور جو شریعت عطا کی تھی اس کے باقیات الصالحات ''منوسمرتی'' نامی کتاب کی شکل میں موجود ہیں۔ یہ تمام چیزیں عین ممکن ہیں' قرینِ قیاس ہیں۔

اس کے علاوہ' جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے' عین قرینِ قیاس ہے کہ ان ساڑھے چار ہزار سال کے دوران حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے کوئی شاخ ہندوستان آ کر آباد ہوئی ہو۔ اس لیے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کے دو بیٹوں کا تذکرہ آتا ہے: حضرت عیس یا عیسوؑ اور حضرت یعقوبؑ۔ یہ دونوں توام یعنی جڑواں بھائی تھے۔ پہلے حضرت عیس یا عیسو کی ولادت ہوئی' ان کے عقب میں یعقوب علیہ السلام پیدا ہوئے۔ ان کا نام یعقوبؑ اسی لیے مشہور ہوا۔ ''اور یعقوب اپنے بھائی عیسو کی ایڑیاں پکڑے ہوئے تولد ہوا''۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی نسل یعنی بنی اسرائیل کے انبیاء کی تاریخ تو ہمیں ''عہد نامہ قدیم'' کے ذریعے ملتی ہے' لیکن حضرت عیس یا عیسو کا کیا معاملہ ہوا' اس کے بارے میں تاریخ خاموش ہے۔ ان کی اولاد اَدوم کے علاقے کی نسبت سے اَدومی کہلاتی ہے' اور اُدمی کا لفظ ہندوستان کے ناموں میں کثرت کے ساتھ ملتا ہے۔ تو کوئی عجب نہیں کہ حضرت عیس کی نسل اس علاقے میں آباد ہوئی ہو اور ان کی نسل کے اندر کوئی نبی یا رسول آیا ہو۔

پھر یہ کہ ۱۴۰۰ ق م میں بنی اسرائیل کا جو خروج ہوا اس کے نتیجے میں ان کے کچھ قبائل لا پتہ ہو گئے تھے' جنہیں ''The lost tribes of the house of Israel'' کہا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں بھی گمان موجود ہے کہ ان کے کچھ قبائل یہاں آ کر آباد ہو گئے ہوں۔ اور مجھے تو گمان غالب کی حد تک محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان میں ''برہما'' اور ''برہمن'' کا جو تصور ہے اس کا درحقیقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ کوئی رشتہ ضرور ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی یہ بات میں نے کئی مرتبہ عرض کی ہے کہ ان کے نزدیک گوتم بدھ نبی تھے۔ قرآن مجید میں دو مرتبہ ''ذوالکفل'' کا تذکرہ آیا ہے۔ ان کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں ملتی کہ وہ کہاں پیدا ہوئے اور ان کی تاریخ کیا ہے۔ مولانا کا گمان یہ ہے کہ ''ذوالکفل'' دراصل کپل وسطو کا شہزادہ ہے۔ یہ ریاست نیپال کے علاقہ میں تھی اور ذوالکفل وہاں کے شہزادے تھے۔ اگر ایسا ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ وہ یقیناً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں سے ہیں۔ اس لیے کہ قرآن مجید کی نصِ قطعی کی رو سے حضرت ابراہیمؑ کے بعد نبوت اور کتاب حضرت ابراہیمؑ کی ذریت سے باہر ممکن نہیں۔ آیت زیر مطالعہ ﴿وَجَعَلْنَا فِیْ ذُرِّیَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ﴾ کو سامنے رکھیں گے تو تحقیق کے بہت سے دروازے کھل جائیں گے' بہت سے گوشے نمایاں ہو جائیں گے۔ ایک انسان جب آسمانی ہدایت کی روشنی اور راہنمائی میں تحقیق کا سفر طے کرتا ہے تو صحیح تر نتائج تک اس کی رسائی ممکن ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد ''نبوت'' اور ''کتاب'' ذُرِّیت ابراہیمؑ کے ساتھ مخصوص ہے۔ اگرچہ دنیا میں اور علاقے بھی ہیں لیکن تاریخ یہودیت اور تاریخ عیسائیت کے حوالے سے ہمارے پاس ثبوت اسی علاقے کا ہے جسے ہم مشرقِ وسطیٰ (Middle East) کہتے ہیں۔ درحقیقت اسلام اور ان دونوں مذاہب (یہودیت اور عیسائیت) کا تعلق اسی علاقے سے ہے۔ قرآن مجید نے بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے قبل کے جن رسولوں کا تذکرہ کیا ہے وہ بھی اسی علاقے سے متعلق تھے' یعنی حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام۔ اس کے علاوہ پوری دنیا میں دوسرے علاقوں سے' خاص طور پر ہندوستان اور چین' جو تہذیب و تمدن کے بہت قدیم مراکز ہیں' قرآن مجید

نے صراحت کے ساتھ بحث نہیں کی ہے۔ اور یہ بات بالکل واضح اور منطقی ہے‘ اس لیے کہ قرآن کریم کے اوّلین مخاطب یعنی اہل عرب کے پاس ان کے بارے میں واقفیت نہیں تھی۔ لہٰذا خواہ مخواہ ان کا تذکرہ کرنا ان کے لیے گویا ایک لایعنی سی بات ہوتی‘ کیونکہ اس کے لیے انہیں پہلے تاریخ اور جغرافیہ کی تعلیم دی جاتی‘ پھر اُن تمام علاقوں میں بھیجے گئے انبیاء ورُسل کا تذکرہ کیا جاتا‘ جبکہ اس کی قطعاً کوئی حاجت نہیں تھی۔ البتہ اس سے جو اشکال سامنے آرہا ہے‘ جسے ہم نے حل کرنا ہے‘ وہ یہ ہے کہ ایک طرف تو قرآن کہتا ہے: ﴿وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ﴾ ’’اور ہر بستی میں ایک خبردار کرنے والا (نبی یا رسول) گزرا ہے‘‘ اور: ﴿وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ ’’اور ہر قوم کے لیے ایک راہنما (گزرا) ہے‘‘۔ جبکہ دوسری طرف یہ حقیقت سامنے آرہی ہے کہ کم از کم گزشتہ ساڑھے چار ہزار برس کے دوران تو صرف ذریت ابراہیمؑ ہی میں کتاب اور نبوت رہی۔

ان دونوں الفاظ ’’ہادی اور نذیر‘‘ پر غور کرتے ہوئے یہ بات ملحوظ خاطر رہنی چاہیے کہ ہر لفظ کے کچھ مضمرات ہوتے ہیں‘ اس کی اپنی ایک connotation ہوتی ہے۔ لفظ ’’ھادٍ‘‘ یا ’’ھادی‘‘ (ہدایت دینے والا) ایک عام لفظ ہے۔ اسی طریقے سے ’’نذیر‘‘ (خبردار کرنے والا) بھی ایک عام لفظ ہے۔ یہ دونوں لفظ ایسے شخص کے لیے بھی استعمال ہو سکتے ہیں جو حقائق سے آشنا ہو جائے‘ چاہے وہ از خود ہی آشنا ہوا ہو۔ قرآن مجید میں اس کی ایک بڑی اہم مثال موجود ہے۔ اور وہ اس اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ اگر اس کا تذکرہ اتنی وضاحت وصراحت کے ساتھ نہ ہوتا تو یہ اہم مضمون ہم پر منکشف ہی نہ ہو پاتا۔ اور وہ مثال ہے حضرت لقمان کی۔ آپ نہ نبی تھے‘ نہ رسول تھے اور نہ ہی ان کے بارے میں کسی نبی یا رسول کے اُمتی ہونے کا کوئی ثبوت ہے۔ وہ بس ایک سلیم الفطرت‘ سلیم العقل انسان تھے۔ اس سلیم الفطرت انسان نے اپنی عقلِ سلیم کی راہنمائی میں غور وفکر اور سوچ بچار کے ذریعے ان تعلیمات تک رسائی حاصل کر لی جو قرآن مجید کی بنیادی تعلیمات ہیں‘ یعنی توحید اور معاد۔ اب

تیسری چیز جو رہ جاتی ہے وہ نیکی اور بدی کا امتیاز ہے۔ اس کی تمیز اور اس کا شعور بھی اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں ودیعت کر دیا ہے۔ نبوت اور کتاب درحقیقت ہدایتِ خداوندی کی معین شکلیں ہیں‘ لیکن ہدایتِ خداوندی اور انذار صرف نبوت اور کتاب کے ساتھ وابستہ نہیں ہے‘ بلکہ ایک حکیم اور دانا انسان بھی ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے غور و فکر کے نتیجے میں ان حقائق تک پہنچا ہو اور اپنے ان حقائق اور اپنی علمی اور عقلی یافت کے حوالے سے لوگوں کو خبردار کر رہا ہو‘ انہیں نیکی کی تلقین کر رہا ہو۔ جیسے سورۃ لقمان میں حضرت لقمان کا قول نقل ہوا ہے: ﴿يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ؕ﴾ (آیت ۱۷) ’’اے میرے بیٹے! نماز قائم کر‘ نیکی کا حکم دے اور برائی سے منع کر‘ اور تجھ پر جو بھی مصیبت پڑے اس پر صبر کر۔‘‘ تو یہاں انذارِ آخرت بھی ہے‘ توحید کی تلقین بھی ہے اور شرک کی مذمت بھی۔ اس سورۂ مبارکہ میں شرک کی مذمت میں حضرت لقمان کا قول ہے:

﴿يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾

’’اے میرے بیٹے! اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرا! یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے۔‘‘

تو گویا یہ تمام بنیادی حقائق نبوت اور کتاب کے بغیر بھی نوعِ انسانی کی رسائی میں ہیں‘ بشرطیکہ اس حوالے سے صحیح فکر کے نتیجے میں مختلف حکماء کی توحید تک رسائی ہو جائے‘ وہ پہچان لیں کہ بس حیاتِ دُنیوی سے پوری تسکین نہیں ہو رہی‘ ذہن مطمئن نہیں ہو رہا‘ بلکہ کوئی اور زندگی ہونی چاہیے اور یہ ہو کر رہے گی۔ اور پھر اس حوالے سے انہوں نے انذارِ آخرت بھی کیا ہو۔ تو یہ ’’انذار‘‘ اور ’’ہدایت‘‘ عام الفاظ ہیں۔ پوری دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے ہادی اور مُنذر اٹھائے ہیں۔ ضروری نہیں کہ وہ نبی ہوں‘ لیکن کتاب درحقیقت شریعت سے عبارت ہے‘ یعنی ایک واضح ہدایت کہ یہ کرو‘ یہ نہ کرو‘ یہ حرام ہے اور یہ تمہارے لیے واجب اور فرض ہے۔ یہ چیز درحقیقت ذریت ابراہیمؑ پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و کرم ہے‘ جس کے لیے قرآن مجید میں ایک آیت بھی

موجود ہے کہ ﴿اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا﴾ ''یقیناً میں آپ کو لوگوں کے لیے امام بنانے لگا ہوں''۔

امامت کا مقام جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عطا ہوا ہے' درحقیقت اسی کا یہ ایک مظہر ہے کہ ''نبوت'' اور ''کتاب'' جو ہدایت خداوندی کی ایک معین شکل ہے' نسل ابراہیمیؑ کے لیے مخصوص کر دی گئی ہے۔ نسل ابراہیمی کی ایک شاخ وہ ہے جو حضراتِ اسحٰق اور یعقوب علیہما السلام سے چلی اور زیادہ تفاصیل ہمیں انہی کی معلوم ہیں۔ دوسری شاخ حضرت اسماعیل علیہ السلام سے چلی اور ان میں نبی اکرم ﷺ کی بعثت ہوئی۔ تیسری شاخ حضرت قتورہ سے چلی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تیسری بیوی ہیں۔ ان کے کئی بیٹے تھے۔ ہم ان میں سے صرف ایک سے واقف ہیں جن کی نسل قومِ مدین یا مدیان کہلائی ہے' جن میں حضرت شعیب علیہ السلام بھیجے گئے۔ لیکن ان کی اولاد کہاں کہاں پھیلی ہے' اس کا ہمیں کوئی پختہ علم نہیں۔ جیسے میں عرض کر چکا ہوں کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کے دوسرے بیٹے حضرت عیس یا عیسو کے بارے میں ہم نہیں جانتے کہ وہ کہاں گئے۔ نسل تو وہ بھی ابراہیمؑ ہی کی ہوگی۔ اس نسل میں بھی کوئی نبی آئے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے وہ دور دراز کے علاقوں میں جا کر آباد ہو گئے ہوں۔ لیکن بہرحال نبوت اور کتاب کی شکل اگر ہے تو وہ صرف ذریتِ ابراہیمیؑ میں ہے۔ باقی عام اخلاقی ہدایات' عام اخلاقی تعلیمات' کم سے کم توحید کی تلقین اور شرکت کی مذمت' یہ وہ چیزیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے چونکہ عقل سلیم اور فطرتِ سلیمہ میں ودیعت کر دی ہیں لہٰذا اس حوالے سے ہر قوم کے اندر کسی نبی' یا کسی ہادی یا کسی نذیر کا آنا بالکل قرین قیاس ہے اور ان دونوں چیزوں میں کوئی تضاد نہیں۔

یہ آیت مبارکہ ان الفاظ پر ختم ہوتی ہے: ﴿فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ﴾ ''پس ان میں ہدایت یافتہ بھی ہیں لیکن ان کی اکثریت فاسقوں پر مشتمل ہے''۔ اس سے پہلے فرمایا گیا تھا: ﴿وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ﴾ ''اور ہم نے ان دونوں کی اولاد میں نبوت اور کتاب رکھی''۔ جب تک حضرت ابراہیم علیہ السلام نہیں آئے حضرت نوح علیہ السلام کی نسل میں نبوت و کتاب رہی۔ بعد ازاں حضرت ابراہیمؑ کے بعد اُن کی نسل میں نبوت و کتاب کو مخصوص کر دیا گیا۔ لیکن چاہے وہ ذریت نوحؑ ہو یا ذریت ابراہیمؑ' یہ سب کے سب نیک لوگ نہیں تھے۔ ان میں سے کچھ وہ بھی ہوئے جنہوں نے ہدایت اختیار کی' ہدایت یافتہ ہوئے' جبکہ ان میں سے بہت سے وہ ہیں کہ جنہوں نے اس راستے کو چھوڑا' اس سے اعراض وانحراف کیا' بدعات اور طرح طرح کی گمراہیوں میں مبتلا ہوئے اور مشرکانہ اوہام میں مبتلا ہو گئے۔ بہرحال ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی تھے کہ جو ہدایت پر تھے' لیکن ان میں سے بہت سے فاسق اور نافرمان ہیں' وہ اللہ کی ہدایت سے مُنہ موڑ کر فسق و فجور میں مبتلا ہو گئے۔

حضرت ابراہیمؑ کے بعد سلسلۂ ارسالِ رُسل

اس حصے کا اصل مضمون اس دوسری آیت میں آ رہا ہے۔ فرمایا: ﴿ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا﴾ ''پھر ہم نے ان کے نقوش قدم پر اپنے بہت سے رسولوں کو اٹھایا''۔ یعنی حضراتِ نوح' ابراہیم علیہما السلام اور اُن کے جو صالح پیرو تھے ان کے نقشِ قدم پر بہت سے رسولوں کو بھیجا گیا۔ ''قفی'' کا مطلب ہے کسی شے کے پیچھے لگنا' کسی کی پیروی کرنا۔ اس ''ق ف ی'' مادہ سے اردو میں بھی ایک لفظ بنتا ہے ''قافیہ'' (جمع قوافی)۔ یہ لفظ شعر کے پیچھے آتا ہے جس کے حوالے سے اشعار میں ایک ردھم قائم ہوتا ہے' یکسانیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ لفظ ''قَفَّيْنَا'' قرآن مجید میں چار مرتبہ آیا ہے جن میں سے دو مقامات تو یہی ہیں۔ اس مادے سے صرف ایک جگہ یہ لفظ اس طرح آیا ہے: ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا﴾ (بنی اسرائیل) ''اور اس چیز کے پیچھے مت پڑو جس کے بارے میں تمہیں علم نہیں ہے۔ یقیناً سماعت' بصارت اور عقل ان تمام چیزوں کے بارے میں باز پُرس ہو گی''۔ ''وَلَا تَقْفُ'' کا مطلب ہے مت پیچھے لگو' مت پیچھے پڑو اُن چیزوں کے جن کے لیے تمہارے پاس کوئی واضح علم نہیں ہے۔ ہم نے تمہیں سماعت' بصارت اور عقل کی جو صلاحیتیں دی ہیں اس لیے دی ہیں کہ ان کی رہنمائی کو اختیار کرو۔ غور و فکر

کرو‘ سوچ بچار کرو۔ پھر دوسری چیز ہدایت ہے جس کے لیے یہ وحی کا سلسلہ ہے۔ لیکن اس سے ہٹ کر طرح طرح کے اوہام ہیں‘ جیسے ستارہ شناسی اور دست شناسی ہے۔ یہ چیزیں ہمارے ہاں ”occult sciences“ کے نام سے مشہور ہیں۔ اسی طرح ہمارے ہاں علم الاعداد (سائنس آف نمبرز) ہے۔ اگرچہ ان سب کو سائنس کا نام دے دیا گیا ہے لیکن ان کو occult sciences کہتے ہیں۔ قرآن کی راہنمائی یہ ہے کہ ان کے پیچھے نہ پڑو۔ درحقیقت سمع و بصر اور عقل کی جو صلاحیتیں دی گئی ہیں یہ اُن کی ناقدری ہے کہ انسان اِن چیزوں کی پیروی کرے‘ ان کے پیچھے پڑے۔

حضرت عیسٰیؑ اور ان کے متبعین کا تذکرہ

آگے فرمایا: ﴿وَقَفَّیۡنَا بِعِیۡسَی ابۡنِ مَرۡیَمَ وَاٰتَیۡنٰهُ الۡاِنۡجِیۡلَ ۙ﴾ ”اور پھر ہم نے ان کے پیچھے اُٹھایا مریم کے بیٹے عیسٰیؑ کو اور اسے ہم نے عطا کی انجیل“۔ نبوت کے ساتھ کتاب کا ایک خاص ربط ہے۔ حضرت موسٰی علیہ السلام کو تورات عطا کی گئی‘ اور اُن کے بعد جو بہت سے انبیاء بنی اسرائیل ہیں ان کو بہت سے صحیفے دیے گئے۔ خاص طور پر ایک صحیفہ ”زبور“ کے نام سے مشہور ہے جو حضرت داوٗد علیہ السلام کو دیا گیا۔ پھر حضرت عیسٰی علیہ السلام کو انجیل کے ساتھ مبعوث کیا گیا۔ آگے فرمایا گیا: ﴿وَجَعَلۡنَا فِیۡ قُلُوۡبِ الَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡهُ رَاۡفَةً وَّرَحۡمَةً ؕ﴾ ”اور جن لوگوں نے اس کی پیروی کی (یعنی حضرت عیسٰی علیہ السلام کی) ان کے دلوں میں ہم نے رأفت اور رحمت پیدا کر دی“۔ ”رأفت“ اور ”رحمت“ تقریباً مترادف الفاظ ہیں۔ بہت سے الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ جو مترادفات کے طور پر مستعمل ہوتے ہیں‘ لیکن ظاہر بات ہے کہ دو الگ الگ الفاظ کے دو مفہوم یقیناً ہوتے ہیں اور جب وہ بیک وقت سامنے آتے ہیں تو پھر غور کرنا پڑتا ہے کہ ان کے مابین فرق کیا ہے‘ ورنہ وہ ایک دوسرے کی جگہ بھی استعمال ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ ”ایمان“ اور ”اسلام“ مترادف بھی ہیں (ہمارے منتخب نصاب میں یہ الفاظ بار بار استعمال ہوئے ہیں) لیکن ان کا اپنا علیحدہ مفہوم بھی ہے۔ اسی طرح جہاد و قتال‘ نبوت و رسالت اور نبی و رسول تقریباً مترادف بھی ہیں لیکن ان کا علیحدہ علیحدہ مفہوم اور مضمون بھی ہے۔ اس کے بارے میں اصول یہ بیان کیا گیا ہے کہ: ”اِذَا تَفَرَّقَا اجۡتَمَعَا وَاِذَا اجۡتَمَعَا تَفَرَّقَا“ کہ جب یہ جوڑوں کے الفاظ علیحدہ علیحدہ آتے ہیں تو مفہوم تقریباً ایک ہی ہوتا ہے‘ لیکن جہاں دونوں ایک ساتھ آ جائیں گے تو وہاں یقیناً کوئی نہ کوئی فرق ہو گا جس کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔ یہاں پر بھی رأفت اور رحمت جوڑا بن کر آئے ہیں۔ ان دونوں میں نسبت یہ ہے کہ رأفت اس کیفیت کا نام ہے جس کے تحت کسی کے دکھ اور درد کو انسان اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔ اس کے لیے فارسی کا لفظ ”ہمدردی“ مستعمل ہے جو اِس مفہوم کو بہت خوبصورتی سے ادا کرتا ہے۔ جیسے ایک جماعت کے لوگ ہم جماعت اور ایک زمانے کے لوگ ہم عصر کہلاتے ہیں اسی طرح ہمدرد کا مطلب ہے جن کا درد باہم مشترک ہے‘ یعنی ایک دوسرے کے درد کو محسوس کرنے والے لوگ ہمدرد ہیں۔ جیسے کسی شاعر نے کہا: ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے!

اس ہمدردی کے مادے کو ایک حدیث میں رِفق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے: ((مَنۡ یُحۡرَمِ الرِّفۡقَ فَقَدۡ حُرِمَ الۡخَیۡرَ کُلَّهٗ)) ”جو شخص دل کی نرمی سے محروم کر دیا گیا وہ کُل کے کُل خیر سے محروم ہو گیا“۔ یعنی کٹھور دل‘ سخت دل انسان خیر سے بالکل محروم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح رقیق القلب اور شفیق کے الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں۔ آپ کا مشفق وہ ہے جسے آپ کے بارے میں اندیشے رہیں کہ آپ کو کہیں کوئی گزند نہ پہنچ جائے‘ کوئی تکلیف نہ پہنچ جائے‘ کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ یہ شفقت ہے۔ والدین کی شفقت یہی ہے کہ انہیں ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ اولاد کو کہیں کوئی نقصان نہ ہو‘ کوئی گزند نہ پہنچے۔ ان تمام کیفیات کے لیے ”رأفت“ درحقیقت ایک جامع عنوان ہے۔ یہ دل کی وہ کیفیت ہے کہ جس میں کسی کے دکھ درد کو انسان خود اپنے باطن میں محسوس کر سکے۔ اس کا نتیجہ نکلتا ہے ”رحمت“ کی صورت میں۔ رحمت یہ ہے کہ اب آپ اس کے درد کو بانٹنے کی کوشش کریں‘ اس کے ازالے کی کوشش کریں‘ اس کی

تکلیف کو رفع کرنے کی کوشش کریں۔ تو رحمت گویا اس کا نتیجہ ہے۔ رأفت اور رحمت اب جوڑے کی شکل میں آئے ہیں اور بیک وقت دونوں الفاظ آئے ہیں تو ان میں یہ نسبت ہے۔ یہ الفاظ یا تو اللہ کے لیے آتے ہیں، جیسے رؤف اور رحیم، یعنی نہایت شفیق، نہایت مہربان اور نہایت رحم فرمانے والا۔ یا پھر یہ حضورﷺ کے لیے سورۃ التوبۃ کی آخری سے پہلی آیت میں آئے ہیں: ﴿بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ ''(آپﷺ) مؤمنوں کے حق میں نہایت شفیق اور نہایت رحیم ہیں''۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے پیروکاروں کے لیے بھی یہ الفاظ آئے ہیں۔ اس لیے کہ اُن کے دلوں میں ایک خاص رقتِ قلبی تھی۔ اسی طرح صحابہ کرام ؓ میں سے حضورﷺ اور حضرت ابوبکر ؓ کے مابین یہ وصف بہت ہی مشترک تھا۔ اس اعتبار سے حضرت ابوبکرؓ حضورﷺ کی شخصیت کا ایک کامل پرتو تھے۔ یہ ہے رأفت اور رحمت۔

رہبانیت کی اصل حقیقت

اس کے بعد فرمایا: ﴿وَرَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ﴾ ''اور رہبانیت کی بدعت خود انہوں نے ایجاد کی تھی، ہم نے اسے ان پر لازم نہیں کیا تھا''۔ اس رأفت اور رحمت کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ جب یہ چیز حدّ اعتدال سے تجاوز کر گئی تو اس نے رہبانیت کی شکل اختیار کر لی۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ لفظ ''رَہبانیت'' اصل میں کیا ہے۔ عام طور پر ہم رُہبانیت کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ لفظ دونوں درست ہیں لیکن یہاں رَہبانیت ہے، رُہبانیت نہیں ہے۔ رَہب کہتے ہیں خوف کو۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے: ﴿وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ﴾ (البقرۃ) ''پس مجھ ہی سے ڈرو''۔ اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد ہے: ﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ﴾ (الانفال: ۶۰) ''(مسلمانو!) اپنے دشمنوں کے لیے اپنے پاس حتی الامکان طاقت اور بندھے ہوئے گھوڑے (یعنی وقت کے تقاضوں کے مطابق جدید ترین اسلحہ تیار رکھو) تاکہ تم ڈراؤ (خوف زدہ کرو) اپنے دشمنوں کو بھی اور اللہ کے دشمنوں کو بھی''۔ تو ''رَہب'' کا مطلب ہے خوف۔ رَہب سے ''ر'' کے زبر کے ساتھ رَہبان بنتا ہے۔ جیسے رَحم سے رَحمان۔ یہ فَعلان کے وزن پر مبالغے کا صیغہ ہے کہ جب کوئی وصف بہت ہی ہیجانی کیفیت میں ہو، طوفانی انداز کا ہو، ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح ہو۔ اسی طرح کی رحمت ''رحمان'' کے لفظ میں ظاہر ہوتی ہیں۔ تو رَھبان سے مراد وہ شخص ہے جس کے اندر بہت ہی زیادہ خشیت الٰہی ہو، اللہ کا خوف، آخرت کی باز پُرس کا خوف انتہائی شدت اختیار کر جائے۔ یعنی بہت زیادہ خوف زدہ، بہت زیادہ ڈرنے والا۔ اور ''رَہبانیت'' اس کیفیت کا نام ہے۔ اور اس سے جو ایک نظام وجود میں آتا ہے اس کے لیے گویا کہ یہ بطور اسمِ علَم ہے۔ جبکہ رَہب سے اسم فاعل ''راہب'' ہے اور اس کی جمع ''ر'' کے پیش کے ساتھ ''رُہبان'' ہے۔ اس سے رُہبانیت بنا ہے جس کا مطلب ہے راہبوں کا طریقہ، راہبوں کا مسلک، راہبوں کا انداز۔ تو ''رُہبانیت'' اور ''رَہبانیت'' کے اس فرق کو نوٹ کر لیں۔ فرمایا گیا: ﴿وَرَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا﴾ ''اور رہبانیت کی بدعت انہوں نے خود اختیار کر لی۔'' اس سے مراد کیا ہے؟ درحقیقت دنیا میں یہ ایک نظام ہے کہ انسان جہاد اور قتال کے راستے سے ہٹ کر کوئی راستہ نکالے اور شیطان انسان کی تمام تر توجہ کو صرف ذاتی اصلاح کے اوپر مرکوز کر دے، اور اس میں اس درجے تشدد ہو جائے کہ انسان اپنی نفس کُشی پر آمادہ ہو جائے۔

دیکھئے ایک تو ہے ضبطِ نفس (self control)۔ یہ تو مطلوب ہے، اس کے بغیر تو ظاہر بات ہے کہ انسان بھلائی اور نیکی کا کوئی کام کر ہی نہیں سکتا۔ تقویٰ نام ہی اسی کا ہے کہ پہلے انسان کو اپنے نفس کے اوپر کنٹرول حاصل ہو اور پھر وہ اسے اللہ کے سامنے جھکا دے۔ تو تقویٰ اور ضبطِ نفس گویا کہ تقریباً مترادف الفاظ ہیں۔ لیکن ایک لفظ ہے ''نفس کشی''۔ نفس کشی یہ ہے کہ انسان کے اندر جب یہ جذبہ ایک حد اعتدال سے تجاوز کر جائے تو پھر وہ اپنے آپ کو اذیتیں پہنچاتا ہے، اپنے نفس کو اس کی کوئی بھی مرغوب شے فراہم نہیں کرتا، ہر طرح سے اس کے تقاضوں کو کچل ڈالتا ہے۔ انگریزی

میں ''self annihilation'' کا لفظ اس کی بہترین تعبیر ہے۔ یعنی انسان نفس کشی میں اتنا مبالغہ کرے، اتنا تعمق کرے کہ جس کی نفی قرآن مجید میں بھی آئی ہے۔ فرمایا گیا ہے: ﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾ (الاعراف:۳۲) ''(اے نبیؐ!) ان سے کہیے کہ کس نے حرام کی ہیں زینت کی وہ چیزیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں، اور پاکیزہ چیزیں رزق میں سے؟'' بلکہ صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ ان چیزوں کو جائز راستے سے حاصل کرو، جائز راستے سے اچھا کھاؤ، اچھا پہنو۔ اسی طرح ادائے حقوق کا معاملہ ہے۔ اللہ کا جو حق ہے وہ ادا کرو، اپنے پڑوسی کا حق ادا کرو، رشتہ داروں کا حق ادا کرو۔ اسی طرح سائلین اور محرومین کا حق ادا کرو۔ جیسے فرمایا گیا ہے: ﴿وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ﴾ (الذّٰریٰت) ''اور ان کے مالوں میں سائلوں اور محروموں کا حق ہے''۔ حقوق کے معاملے میں دین کا تصور تو یہ ہے کہ حضورﷺ نے فرمایا: ((وَاِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا)) ''اور یقیناً تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے''۔ اس کو بھی اس کا حق پہنچاؤ۔ اس کی جو بھی ضروریاتِ زندگی اور تقاضے ہیں، اللہ تعالیٰ نے جسم کے اندر جو داعیات رکھ دیے ہیں ان تمام تقاضوں اور داعیات کو جائز راستے سے پورا کرو۔

دراصل جب نیکی کا جذبہ حدِ اعتدال سے تجاوز کر جاتا ہے، اس میں مبالغہ، تعمق اور گہرائی پیدا ہو جاتی ہے تو پھر یہ ایک عجیب شکل اختیار کرتا ہے۔ پھر انسان اپنے نفس کو اُس کے جائز حقوق بھی دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا، بلکہ اُس پر قدغنیں لگاتا ہے۔ ہر طرح کی معاشرتی آسائشوں سے اپنے آپ کو محروم کر کے اور معاشرے سے کٹ کر دُور جنگلوں میں، پہاڑوں کی غاروں میں اور چوٹیوں پر جا کر بیٹھ جاتا ہے۔ پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص برفانی چوٹیوں پر ننگے بدن کھڑا سردی کو جھیل رہا ہے، تاکہ وہ اپنے نفس کو کچلے۔ یہ ہے درحقیقت وہ رَہبانیت کہ جس کی طرف کچھ لوگ مائل ہو گئے۔ یہ لوگ اپنی نیک نیتی اور نیک دلی سے اس راستے کی طرف گئے، لیکن شیطان نے اُن کے رخ کو موڑ دیا، انہیں divert کر دیا۔ شیطان نے انہیں غلط پٹی پڑھائی کہ بجائے اس کے کہ معاشرے میں رہ کر باطل کے ساتھ مقابلہ کرو، ظلم کا استیصال کرو، بدی کو ختم کرنے کی کوشش کرو، تم معاشرے سے ہی کٹ جاؤ اور جا کر کہیں جنگلوں، غاروں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر بسیرا کرو اور بس اسی نفس کشی (self annihilation) کے اندر اپنی پوری زندگی بِتا دو۔ یہ راستہ درحقیقت رَہبانیت ہے، جس کے بارے میں اسلام میں شدت سے نفی آئی ہے۔

ضبطِ نفس کا اسلامی تصور

مسند احمد بن حنبل میں حضورﷺ کی ایک حدیث ہے: ((لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْاِسْلَامِ)) ''اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں''۔ اسی طرح غالباً مسند احمد ہی کی ایک روایت ہے کہ حضور اکرمﷺ نے فرمایا: ((رَهْبَانِيَّةُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ الْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ)) ''اِس اُمت کی رہبانیت جہاد فی سبیل اللہ ہے''۔ یہ حضورﷺ کا نہایت حکیمانہ قول ہے۔ اس سے زیادہ حکیمانہ بات نہیں ہو سکتی، کہ تم اپنے نفس کو تکلیفیں پہنچانا چاہ رہے ہو، یہی تکلیفیں جہاد فی سبیل اللہ میں بھی تو ہیں۔ جب تم غاروں میں بیٹھ کر اپنے نفس کو تکلیفیں پہنچاؤ گے تو اس سے اگر کوئی فائدہ پہنچے گا بھی تو صرف تمہاری اپنی ذات کو پہنچے گا۔ اگرچہ اس میں بہت سے خطرات بھی ہیں جو بہت زیادہ خوفناک نتائج پیدا کر سکتے ہیں، لیکن بالفرض اگر مثبت پہلو ہی سامنے رکھا جائے تو اس سے صرف تمہاری ذات کو ہی فائدہ پہنچ رہا ہے۔ یہی تکلیفیں تم اپنے نفس کو جہاد فی سبیل اللہ میں پہنچاؤ۔ وہاں جا کر بھوک بھی ستاتی ہے۔ ایسا وقت بھی آتا ہے، جیسا کہ غزوۂ تبوک میں ہوا ہے، کہ تین تین مجاہدین کے لیے چوبیس گھنٹے کا راشن صرف ایک کھجور ہے۔ اب اس سے زیادہ نفس کشی اور کیا ہوگی۔ لیکن یہ نفس کشی اس راستے میں ہے کہ جس سے دین کا غلبہ ہوگا، نظامِ عدل وقسط قائم ہوگا۔ اس سے بحیثیت مجموعی کروڑوں انسان ظلم، جبر واستبداد اور استحصال کے پھندوں سے نجات پائیں گے۔ ان کے لیے پھر ممکن ہوگا کہ وہ بھی اپنے پروردگار کی طرف کوئی توجہ کریں، اس سے لو لگائیں، اس کے ساتھ راتوں کو کھڑے ہو کر مکالمہ اور مخاطبہ کریں، اس کے ساتھ مناجات کریں۔ لیکن یہ تب ہوگا کہ

انہیں ظلم کی چکیوں سے نکالا جائے۔ وہ جو کولھو کے بیل بنے ہوئے ہیں‘ جو بار برداری کے جانور بن کر رہ گئے ہیں‘ ان کے لیے کیا ممکن ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے لو لگائیں اور کہیں کوئی اعلیٰ خیال بھی ان کے ذہن میں آ سکے؟ تو نوعِ انسانی کو اِن بندھنوں سے آزاد کرانے کے لیے جدوجہد کرو۔ یہ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اس جہاد فی سبیل اللہ میں بھوک بھی آ جائے گی‘ بے آرامی بھی آ جائے گی‘ تکلیفیں بھی آ جائیں گی۔ بجائے اس کے کہ غاروں میں جا کر اپنے نفس کو یہ تکلیفیں پہنچاؤ‘ وہ سارے مقاصد جہاد فی سبیل اللہ میں بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔ تو حضورﷺ نے فرمایا: ((رَھْبَانِیَّۃُ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ الْجِھَادُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ)) ’’اِس اُمت کی رہبانیت جہاد فی سبیل اللہ ہے‘‘۔ اور یہی جہاد فی سبیل اللہ ہے جس کا نقطۂ عروج (climax) یہ آیت ہے:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْہِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ......﴾ (الحدید:۲۵)

’’ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی‘ تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔ اور ہم نے لوہا اتارا جس میں جنگ کی قوت ہے اور لوگوں کے لیے منافع بھی ہیں......‘‘

اپنے نفس کے خلاف مجاہدہ یہ بھی ہے کہ حرام سے اس کو بچالو۔ فرض کیجیے اندر سے کسی حرام کی خواہش جنم لے رہی ہے تو اپنے نفس کو اُس سے روکو۔ جیسے ایک جگہ فرمایا گیا ہے: ﴿وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی ۷﴾ (النّٰزعٰت) ’’اور اس نے اپنے نفس کو روکے رکھا (اور اس کی لگامیں کھینچ کر رکھیں) خواہش سے‘‘۔ بشرطیکہ وہ خواہش حرام کے راستے کی ہو۔ لیکن اگر جائز کی خواہش ہے تو اس کے لیے تو فرمایا گیا ہے: ((وَاِنَّ لِنَفْسِکَ عَلَیْکَ حَقًّا)) ’’یقیناً تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے‘‘۔ یعنی ادائے حقوق کے اندر یہ بھی شامل ہے کہ اپنے نفس کو اس کا حق ادا کرو۔ رَہبانیت میں نہایت تشدد ہوتا ہے۔ بلکہ میں اس کے لیے تعمق کا لفظ استعمال کرتا ہوں کہ بہت گہرائی میں جانا‘ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے بارے میں بھی‘ جن کو ہم صغائر کہتے ہیں‘ نہایت حساس ہو جانا اور اپنے اوپر بہت سختی کرنا۔

اس سلسلے میں سنن ابی داؤد میں حضرت انس بن مالک ؓ سے مروی حدیث نبویؐ ہے کہ حضورﷺ نے فرمایا: ((لَا تُشَدِّدُوْا عَلٰی اَنْفُسِکُمْ فَیُشَدَّدَ عَلَیْکُمْ)) ’’اپنے اوپر زیادہ تشدد نہ کرو (زیادہ سختی نہ کرو‘ اس نفس کو جائز چیزوں سے تو محروم نہ کرو) ورنہ نتیجہ یہ نکلے گا کہ اللہ تم پر سختی کرے گا (اور یہ سختی تمہارے لیے ناقابل برداشت ہو جائے گی) ((فَاِنَّ قَوْمًا شَدَّدُوْا عَلٰی اَنْفُسِھِمْ فَشَدَّدَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ)) ’’اس لیے کہ تم سے پہلے بھی ایک قوم ایسی گزری ہے جس نے اپنے اوپر بہت تشدد کیا (نفس کشی کی انتہا کو پہنچ گئے) تو اللہ نے بھی ان پر سختی کی‘‘۔ ((فَتِلْکَ بَقَایَاھُمْ فِی الصَّوَامِعِ وَالدِّیَارِ)) ’’پس ان کلیساؤں‘ گرجوں اور راہب خانوں میں ان کے بقایا بیٹھے ہوئے ہیں‘‘۔ ان کا جو حشر ہے اس سے اللہ کی پناہ! خود مغربی مؤرخین نے Christian Monasticism کی جو تاریخ مرتب کی ہے اس میں جس طرح کی تفاصیل سامنے آتی ہیں اس سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ابتدائی دور میں جن لوگوں نے اس کو ایجاد کیا یقیناً انہوں نے اپنے اوپر بہت تشدد اور سختی کی۔ دراصل کچھ لوگ تو باہمت ہوتے ہیں جو اُس سختی کو برداشت کر جاتے ہیں‘ اس کی پابندی کر جاتے ہیں‘ لیکن پھر اُن کے اکثر پیرو اُن چیزوں کی پابندی نہیں کر پاتے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بظاہر راہب اور راہبائیں ہیں‘ غیر شادی شدہ ہیں‘ لیکن اندر خانے راہب خانوں کے اندر زنا کاری ہو رہی ہے‘ حرامی اولاد پیدا ہو رہی ہے‘ ان کے گلے گھونٹے جا رہے ہیں اور راہب خانوں کے تہہ خانوں میں ناجائز اولاد کے قبرستان بن گئے ہیں۔

دراصل انسان جب اپنی فطرت سے کشتی کرتا ہے تو کچھ لوگ تو باہمت ہوتے ہیں جو واقعتاً اپنے نفس پر قابو پا لیتے ہیں‘ اسے کچل دیتے ہیں‘ لیکن اکثریت کا معاملہ یہ نہیں ہوتا‘ بلکہ انسان کی فطرت‘ اس کی سرشت اسے پچھاڑ دیتی ہے‘ اور پھر انسان جس طرح گندگی کے اندر گرتا ہے اور جس انتہائی پستی تک پہنچتا ہے‘ واقعہ یہ ہے کہ اس کا تذکرہ کرنا بھی بڑا مشکل ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے کہ مت کرو اپنے اوپر تشدد۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے بار بار آپ کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے کہ قرآن مجید میں تین مقامات

بہت اہم ہیں، جن میں کبائر سے بچنے کو کہا گیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

﴿اِنۡ تَجۡتَنِبُوۡا كَبَآئِرَ مَا تُنۡهَوۡنَ عَنۡهُ نُكَفِّرۡ عَنۡكُمۡ سَيِّاٰتِكُمۡ وَنُدۡخِلۡكُمۡ مُّدۡخَلًا كَرِيۡمًا﴾ (النساء)

''اگر تم اُن بڑی چیزوں سے جن سے تمہیں روکا جا رہا ہے، اجتناب کر لو گے تو چھوٹی چیزیں ہم خود ہی تم سے دور کر دیں گے اور تمہیں عزت کی جگہ داخل کریں گے''۔

عام طور پر جب مذہبی مزاج اور مذہبی ذہنیت بنتی ہے اور ان چھوٹی چھوٹی چیزوں میں تعمق شروع ہوتا ہے تو پھر بسا اوقات صورت وہ پیدا ہو جاتی ہے کہ مچھر چھانے جاتے ہیں اور سموچے اونٹ نگلے جاتے ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے یہود کے علماء پر تنقید کی تھی کہ تمہارا حال یہ ہے کہ مچھر چھانتے رہتے ہو اور سموچے اونٹ نگل جاتے ہو۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں میں تعمق بھی ہے، تشدد بھی ہے، تکلف بھی ہے اور over emphasis بھی ہے، لیکن بڑی بڑی چیزیں نگلی جا رہی ہیں۔

اسی طرح سورۃ النجم میں فرمایا:

﴿اَلَّذِيۡنَ يَجۡتَنِبُوۡنَ كَبٰٓئِرَ الۡاِثۡمِ وَالۡفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ﴾ (آیت ۳۲)

''جو بڑے بڑے گناہوں اور کھلے کھلے قبیح افعال سے پرہیز کرتے ہیں، الاّ یہ کہ کچھ قصور اُن سے سرزد ہو جاتے ہیں''۔

معمولی چیزیں انسان سے سرزد ہو جاتی ہیں۔ ان کے بارے میں زیادہ حساس نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ اصول یہ دیا گیا ہے کہ: ﴿اِنَّ الۡحَسَنٰتِ يُذۡهِبۡنَ السَّيِّاٰتِ﴾ (ہود:۱۱۴) ''یقیناً نیکیاں چھوٹی چھوٹی برائیوں کا ازالہ کرتی رہتی ہیں''۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ انسان وضو کرتے ہوئے اپنا چہرہ دھوتا ہے تو آنکھوں کے گناہ دھل جاتے ہیں۔ یہ صغائر ہوتے ہیں۔ فرض کیجیے غیر ارادی طور پر کسی نامحرم پر نگاہ پڑ گئی ہے، اور اُس وقت انسان نے بلا ارادہ کوئی تلذذ (Gratification) بھی محسوس کیا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرمائے گا۔ وضو کرتے ہوئے جب آپ آنکھ دھوئیں گے تو اس کی جو کدورت اور کثافت ہے وہ دھل جائے گی۔ ہاں ارادے کے ساتھ یہ معاملہ نہ ہو، ورنہ کبائر تک معاملہ چلا جائے گا۔

تیسرا مقام سورۃ الشوریٰ کا ہے جس میں فرمایا:

﴿وَالَّذِيۡنَ يَجۡتَنِبُوۡنَ كَبٰٓئِرَ الۡاِثۡمِ وَالۡفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوۡا هُمۡ يَغۡفِرُوۡنَ﴾

''اور جو لوگ بڑے بڑے گناہوں اور کھلے کھلے قبیح افعال سے پرہیز کرتے ہیں، اور جب بھی وہ غضب ناک ہوتے ہیں تو معاف کر دیتے ہیں''۔

تو حقیقی طرزِ عمل یہ ہے کہ ایک تو اپنی پوری توجہ کو اس جدوجہد پر مرکوز کیا جائے کہ دین غالب ہو، نظامِ عدل وقسط قائم ہو، ظلم، باطل، استحصال اور جبر کا استیصال کر دیا جائے، اور دوسرے خود انسان کبائر سے بچا ہوا ہو، تمام بڑے بڑے گناہوں سے اس نے اپنے آپ کو محفوظ کر لیا ہو تو اللہ تعالیٰ صغائر کو دھوتے رہتے ہیں۔ جیسے فرمایا گیا ہے: ﴿نُكَفِّرۡ عَنۡكُمۡ سَيِّاٰتِكُمۡ﴾ ''ہم تمہاری برائیوں کو تم سے دور کر دیں گے''۔ اور: ﴿اِنَّ الۡحَسَنٰتِ يُذۡهِبۡنَ السَّيِّاٰتِ﴾ کہ انسان کی اچھائیاں اس کی چھوٹی چھوٹی برائیوں کا خود بخود ازالہ کرتی رہتی ہیں۔ وہ خود بخود دھلتی چلی جاتی ہیں۔

ضبطِ نفس اور اُسوۂ رسول ﷺ

عام طور پر ایک مذہبی مزاج کے اندر جو تشدد اور تعمق پیدا ہو جاتا ہے حدیث نبویؐ میں اس کی بہترین مثال موجود ہے۔ بخاری اور مسلم میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: جَاءَ ثَلَاثَةُ رَهْطٍ اِلٰی بُيُوتِ النَّبِيِّ ﷺ يَسْأَلُونَ عَنْ عِبَادَةِ النَّبِيِّ ﷺ ''تین اشخاص حضور ﷺ کی ازواجِ مطہرات کے گھروں میں آئے اور اُن سے حضور ﷺ کی نفلی عبادت کے بارے میں سوال کیا''۔ ظاہر بات ہے فرض عبادات تو سب کے نزدیک متفق علیہ ہے! پانچ نمازیں تو سب کو پڑھنی ہیں۔ انہوں نے دریافت کیا کہ حضور ﷺ اور کتنی نمازیں پڑھتے ہیں، یعنی رات کو کتنی دیر تک آپ نوافل ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح رمضانِ مبارک کے روزے تو سب نے رکھنے ہی ہیں، حضور ﷺ نفلی روزے کتنے رکھتے ہیں۔ انہوں نے یہ تحقیق کی۔ ان کے اندر نیکی کا

جذبہ بہت توانا اور طاقتور ہو کر اُبھر آیا تھا تو انہوں نے اندازہ کرنا چاہا کہ حضورﷺ کا معمول کیا ہے۔ آگے فرماتے ہیں: فَلَمَّا اُخْبِرُوْا کَاَنَّھُمْ تَقَالُّوْھَا ''جب انہیں اس کی خبر دی گئی تو انہوں نے اس کو کم تصور کیا''۔ ظاہر بات ہے کہ نہ حضورﷺ کی زندگی میں کوئی تکلف وتصنع تھا اور نہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کی طرف سے اس معاملے میں' معاذ اللہ' کوئی مبالغہ آرائی ہو سکتی تھی۔ جو صحیح صحیح صورت حال تھی انہوں نے بیان کر دی۔ لیکن ان تین صحابہ رضی اللہ عنہم کے اندازے سے یہ بات بہت کم نکلی۔ وہ سمجھتے تھے حضورﷺ تو شاید ساری رات بستر سے اپنی کمر لگاتے ہی نہیں ہوں گے۔ لیکن انہیں معلوم ہوا کہ حضورﷺ تہجد اور نوافل پڑھتے ہیں لیکن رات کو استراحت بھی فرماتے ہیں۔ اسی طرح ان کا گمان تھا کہ حضورﷺ تو روزے کا کبھی ناغہ ہی نہیں کرتے ہوں گے' ہمیشہ روزے رکھتے ہوں گے۔ انہیں بتایا گیا کہ نہیں' ایسا نہیں ہے۔ حضورﷺ کے روزے رکھنے کا اتنا معمول ہے۔ یہ بات ان کی توقع سے کم تھی۔ راوی فرماتے ہیں: فَقَالُوْا وَاَیْنَ نَحْنُ مِنَ النَّبِیِّ ﷺ قَدْ غُفِرَ لَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ وَمَا تَاَخَّرَ ''اب انہوں نے (اپنے آپ کو تسلی دینے کے لیے) کہا کہ ہمارا حضورﷺ سے کیا مقابلہ (ہم اپنے معاملے کو حضورﷺ کے معاملے پر کہاں قیاس کر سکتے ہیں!) جب کہ ان کے تمام اگلے پچھلے گناہ اللہ نے پہلے ہی معاف کر دیے ہیں''۔ قَالَ اَحَدُھُمْ اَمَّا اَنَا فَاِنِّیْ اُصَلِّی اللَّیْلَ اَبَدًا ''اب ان میں سے ایک نے کہا کہ میں تو اب ہمیشہ رات بھر نماز پڑھوں گا (قطعاً نہیں سوؤں گا)''۔ وَقَالَ آخَرُ اَنَا اَصُوْمُ الدَّھْرَ وَلَا اُفْطِرُ ''دوسرے نے کہا میں تو ہمیشہ روزہ رکھا کروں گا' کبھی افطار نہیں کروں گا (ناغہ نہیں کروں گا)''۔ وَقَالَ الْآخَرُ وَاَنَا اَعْتَزِلُ النِّسَاءَ فَلَا اَتَزَوَّجُ اَبَدًا ''تیسرے نے کہا کہ میں تو عورتوں سے بالکل علیحدہ رہوں گا اور کبھی بھی شادی نہیں کروں گا''۔

فَجَاءَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِلَیْھِمْ فَقَالَ: ''پس رسول اللہﷺ ان کے پاس گئے اور فرمایا''۔ یہاں سے معلوم ہو رہا ہے کہ حضورﷺ کو جوں ہی یہ بات معلوم ہوئی آپؐ خود اُن کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا: ((اَنْتُمُ الَّذِیْنَ قُلْتُمْ کَذَا وَکَذَا؟)) ''کیا آپ ہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے یہ یہ باتیں کہی ہیں؟'' ((اَمَا وَاللّٰہِ اِنِّیْ لَاَخْشَاکُمْ لِلّٰہِ وَاَتْقَاکُمْ لَہٗ)) ''اللہ کی قسم! میرے اندر تم میں سب سے بڑھ کر اللہ کی خشیت ہے اور میں تم میں سب سے بڑھ کر متقی ہوں''۔ یہ حضورﷺ کا بہت ہی غیر معمولی انداز ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا: ((لٰکِنِّیْ اَصُوْمُ وَاُفْطِرُ)) ''لیکن (میرا معمول تو یہ ہے کہ) میں روزہ رکھتا بھی ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں (یعنی ناغہ بھی کرتا ہوں)'' ((وَاُصَلِّیْ وَاَرْقُدُ)) ''اور میں رات کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں'' ((وَاَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ)) ''اور میں تو عورتوں سے نکاح کرتا ہوں (متعدد ازواج میرے گھر میں ہیں)'' ((فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ)) ''تو (کان کھول کر سن لو!) جو میری سنت سے اِعراض کرے گا (جسے میری سنت پسند نہیں ہے) اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں''۔ یعنی ہے تو یہ نیکی کا جذبہ جو بڑا مشتعل ہو گیا ہے' بہت ہی قوی ہو کر اُبھرا ہے' لیکن جان لو کہ اسے حدِ اعتدال میں اگر نہ رکھا تو حضورﷺ کے اُسوہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ آپؐ کا اُسوہ اور سنت تو درحقیقت اس اعتدال پر مبنی ہے کہ نفس کا بھی حق ہے۔ جیسے ایک جگہ آپؐ نے فرمایا: ((وَاِنَّ لِنَفْسِکَ عَلَیْکَ حَقًّا)) ''اور یقیناً تیرے نفس کا بھی تم پر حق ہے''۔

صحیح بخاری کی روایت ہے کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی شخصیت پر بھی اسی طرح کا زہد کا غلبہ ہو گیا تھا۔ آپؓ پوری پوری رات نماز پڑھتے تھے اور ہمیشہ روزہ رکھتے تھے۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ حضورﷺ نے مجھے بلا کر جواب طلبی فرمائی: ((یَا عَبْدَ اللّٰہِ اَلَمْ اُخْبَرْ اَنَّکَ تَصُوْمُ النَّھَارَ وَتَقُوْمُ اللَّیْلَ)) ''اے عبداللہ! مجھے تو یہ بتایا گیا ہے کہ تم ہمیشہ روزہ رکھتے ہو اور پوری رات نماز پڑھتے ہو؟'' اب وہ حضورﷺ کے سامنے کیسے چھپائیں۔ عرض کیا: بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ''حضورؐ! ایسا تو یقیناً ہے''۔ آپؐ نے فرمایا: ((فَلَا تَفْعَلْ' صُمْ وَاَفْطِرْ وَقُمْ وَنَمْ' فَاِنَّ لِجَسَدِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَاِنَّ لِعَیْنِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَاِنَّ لِزَوْجِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَاِنَّ لِزَوْرِکَ عَلَیْکَ حَقًّا)) ''ایسا مت کرو! روزہ بھی رکھو اور

افطار (ناغہ) بھی کرو' رات کو قیام بھی کرو اور آرام بھی کرو۔ یقیناً تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے' تمہاری آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے' تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے ملاقاتیوں کا بھی تم پر حق ہے''۔ تمہارے اوپر جو بھی حقوق ہیں ان سب کو ایک اعتدال اور توازن کے ساتھ ادا کرو۔

مندرجہ بالا طویل متفق علیہ حدیث کی ایک اور روایت (version) بھی ہے جو سنن النسائی میں ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان تین اشخاص کی بات پر حضورﷺ نے باقاعدہ اجتماع میں بھی خطاب فرمایا۔ یعنی ایک تو ان تینوں اشخاص کے پاس جا کر آپؐ نے ان کو تنبیہہ فرمائی کہ یہ میرا راستہ اور طریقہ نہیں ہے' اچھی طرح کان کھول کر سن لو کہ ((مَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ)) لیکن اس پر مستزاد یہ کہ آپﷺ نے باقاعدہ ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ روایت میں ہے: فَبَلَغَ ذٰلِکَ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ فَحَمِدَ اللّٰہَ وَاَثْنٰی عَلَیْہِ ثُمَّ قَالَ: ((مَا بَالُ اَقْوَامٍ یَقُوْلُوْنَ کَذَا وَکَذَا لٰکِنِّیْ اُصَلِّیْ وَاَنَامُ وَاَصُوْمُ وَاُفْطِرُ وَاَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ ' فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ)) اس روایت سے یہ بات ظاہر ہو رہی ہے کہ حضورﷺ نے جب یہ دیکھا کہ یہ صرف ان تین افراد کا معاملہ نہیں' بلکہ یہ ایک رجحان ہے' اور ممکن ہے یہ چیز مسلمانوں کی جماعت کے اندر زیادہ بڑے پیمانے پر سرایت کر جائے تو حضورﷺ نے لوگوں کو جمع کر کے خطبہ ارشاد فرمایا۔ پہلے اللہ کی حمد و ثناء کی' اس کے بعد عمومی الفاظ کی شکل میں فرمایا: ''کیا ہو گیا ہے لوگوں کو کہ ایسی ایسی باتیں کر رہے ہیں؟'' کوئی یہ کہہ رہا ہے کہ میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا' کبھی ناغہ نہیں کروں گا۔ کوئی کہتا ہے کہ میں پوری پوری رات نماز پڑھا کروں گا اور کوئی کہتا ہے کہ میں زندگی بھر شادی نہیں کروں گا۔ لیکن غور سے سن لو: ''(میرا طریقہ یہ ہے کہ) میں نوافل بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں' اور روزہ رکھتا بھی ہوں اور ناغہ بھی کرتا ہوں' اور میں نے عورتوں سے نکاح بھی کیے ہیں (میں تو ازدواجی زندگی گزار رہا ہوں)' تو جو بھی میری سنت سے اعراض کرے گا (یا جسے بھی میری سنت پسند نہیں ہے) اس کا پھر مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے''۔

اس سے دو باتیں اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ پہلی بات یہ کہ اسلام دینِ فطرت ہے۔ جیسے فرمایا گیا ہے: ﴿فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا ؕ﴾ (الروم:۳۰) ''اللہ کی فطرت وہ ہے جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے''۔ اس میں اعتدال اور توازن ہے۔ ضبطِ نفس (self control) درکار ہے لیکن نفس کشی (self annihilation) ہرگز پسندیدہ نہیں ہے' یہ رَہبانیت خلافِ فطرت ہے۔ اس کے خلافِ فطرت ہونے کے باعث بسا اوقات انسان اپنے آپ سے شکست کھا جاتا ہے۔ وہ نفس کشی کا فیصلہ تو کر لیتا ہے لیکن اس کی پابندی نہیں کر پاتا (اسی آیت مبارکہ کے آخر میں یہ مضمون آئے گا)۔ اور دوسری بات' جو اصل میں اس کلائمس اور اینٹی کلائمکس کے مابین ربط قائم کرتی ہے' وہ یہ ہے کہ اسلام درحقیقت یہ چاہتا ہے کہ انسان کا رُخ اقامت دین کی طرف رہے۔ یعنی وہ انقلابی عمل میں مصروف ہو۔ اس کی اصل توجہ ظلم کے خاتمہ اور باطل کے استیصال کی طرف رہے۔ بدی کے ساتھ پنجہ آزمائی ہو۔ اس کے دوران بھی ظاہر بات ہے کہ تکالیف اور مصائب آئیں گے۔ فاقے بھی آئیں گے' پیٹوں پر پتھر بھی باندھنے پڑ جائیں گے' راتوں کو سونا نصیب نہیں ہوگا۔ مختصراً یہ کہ وہ ساری مشکلات اور مصائب جو خواہ مخواہ ایک تکلف و تصنّع کی شکل میں اس نظامِ رہبانیت میں انسان اپنے اوپر طاری کرتا ہے' سب کے سب آئیں گے' لیکن وہ کارآمد (productive) ہوں گے' اس اعتبار سے کہ معاشرے میں عدل قائم ہو' انصاف کا دور دورہ ہو۔ اور یہ رَہبانیت کا نظام تو درحقیقت ایک اعتبار سے ظلم کو' باطل کو' بدی کو اور شر کو تقویت پہنچاتا ہے۔ اس لیے کہ جو نیک لوگ ہیں وہ میدان سے گویا ہٹ گئے' وہ معاشرے کو چھوڑ کر کہیں غاروں کے اندر بیٹھ گئے اور یہ دنیا اب ظالموں اور شریر لوگوں کے لیے خالی ہوگئی اور انہیں کھلی چھوٹ حاصل ہوگئی کہ اور کھل کھیلیں۔ ان کو کوئی چیلنج کرنے والا نہیں رہا۔ اس اعتبار سے میں کہتا ہوں کہ یہ شیطان کا اغوا اور اضلال ہے۔ علامہ اقبال نے ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں اس کی بہترین تعبیر کی ہے۔ ابلیس نے اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ ؎

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں!

لہٰذا اس نے اپنے چیلے چانٹوں کو ہدایات دیں کہ ؎

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے!

اپنی توجہ آیت زیر مطالعہ پر مرکوز کیجیے۔ فرمایا: ﴿وَرَهۡبَانِیَّۃَ ۨابۡتَدَعُوۡهَا مَا کَتَبۡنٰهَا عَلَیۡهِمۡ﴾ ''رہبانیت کی بدعت انہوں نے خود ایجاد کی' ہم نے اسے اُن پر لازم نہیں کیا تھا''۔ یہاں اس لفظ ''بدعت'' کو سمجھ لیجیے۔ ایک ہے اجتہاد۔ یعنی کتاب و سنت میں جو اصول دیے گئے ہیں ان سے اجتہاد کرتے ہوئے نئی صورت حال میں شریعت کا حکم تلاش کرنے کی کوشش کرنا۔ جبکہ بدعت سے مراد ہے ایک ایسی چیز جس کی کوئی اصل ہے ہی نہیں' یعنی بے بنیاد بات۔ اور یہاں پر اِس رَہبانیت کو بحیثیت ایک ادارے' نظام اور فلسفے کے قرآن مجید بدعت قرار دے رہا ہے۔ آگے ارشاد ہے: ﴿اِلَّا ابۡتِغَآءَ رِضۡوَانِ اللّٰهِ﴾ ''مگر اللہ کی خوشنودی کی تلاش میں''۔ اس سے دو مفہوم مراد لیے گئے ہیں۔ یہ مقام مشکلاتِ قرآن میں سے ہے۔ یہ بھی جان لیجیے کہ یہ قرآن مجید کا اعجاز ہے کہ جہاں کہیں اس طرح کا احتمال ہوتا ہے کہ دو مفہوم ہو سکتے ہیں' دو امکانات ہیں' تو وہاں پر دونوں ہی اپنی جگہ پر قیمتی ہوتے ہیں۔ لہٰذا ﴿مَا کَتَبۡنٰهَا عَلَیۡهِمۡ اِلَّا ابۡتِغَآءَ رِضۡوَانِ اللّٰهِ﴾ کی ایک ترجمانی یوں کی جاتی ہے کہ ''ہم نے نہیں فرض کیا تھا اُن پر کچھ بھی سوائے اس کے کہ اللہ کی رضا حاصل کرنے کی کوشش کریں''۔ یعنی ہم نے یہ تو فرض کیا تھا کہ اللہ کو راضی کرو' لیکن یہ رَہبانیت ہم نے فرض نہیں کی تھی۔ جبکہ ایک ترجمانی یوں کی گئی ہے کہ انہوں نے جو رَہبانیت کی بدعت ایجاد کی وہ اللہ کی رضا کے حصول کے لیے تھی۔ یعنی بدنیتی نہیں تھی۔ بسا اوقات نیکی کا جذبہ حدِّ اعتدال سے تجاوز کر کے بدی کے راستے پر پڑ جاتا ہے۔ جیسا کہ مذکورہ بالا تین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معاملہ معاذ اللہ کسی بدنیتی پر مبنی تو نہیں تھا۔ نیکی اور خیر کا جذبہ ہی تھا۔ اللہ سے لو لگانے کا جذبہ ہی تھا۔ لیکن بعض اوقات بدنیتی کے بغیر بھی کوئی شے کسی شر کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس کے لیے درحقیقت ہمارے پاس تحفظ کا ذریعہ اسوۂ رسول ﷺ ہے۔ چنانچہ ہمارے اس منتخب نصاب کے درس نمبر۲ [آیۂ بر (البقرۃ:۱۷۷)] کا مضمون یہی ہے کہ نیکی کا ایک ماڈل سامنے ہونا چاہیے جس کے حوالے سے آپ مختلف چیزوں کے مابین نسبت و تناسب کو معین کر سکیں۔ دیکھئے حضور ﷺ نے مختلف تقاضوں کو کس خوبصورتی اور تناسب سے سمویا ہے! حضور ﷺ نے ان چیزوں کے مابین جو امتزاج پیدا کیا ہے اس میں توازن کس درجے ہے! اعتدال کس درجے کا ہے! سیرت النبی ﷺ کا سب سے بڑا حسن یہی جامعیت کبریٰ ہے۔

اس موضوع پر میں نے ایک مرتبہ مقالہ بھی لکھا تھا۔ صدر ضیاء الحق نے سیرت نبویؐ کی کانفرنسوں کا آغاز کیا تھا تو اس میں میرے مقالے کا موضوع یہی تھا کہ حضور ﷺ کی سیرت کا سب سے زیادہ نمایاں اور امتیازی وصف توازن اور اعتدال ہے۔ آپ ﷺ نے مختلف بلکہ متضاد تقاضوں کو اپنی شخصیت میں سمویا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دین کا صحیح فہم عطا فرمائے۔ آمین!

اُمت مسلمہ میں رہبانیت کا نفوذ اور اس کے اسباب

جیسے کہ میں نے عرض کیا تھا کہ متبعین مسیح علیہ الصلاۃ والسلام میں اگر رَہبانیت کا نظام آیا تو جہاں اس میں شیطان کے اغوا و اِضلال کا معاملہ ہوا کہ اس نے انہیں جہاد و قتال' انقلاب اور اللہ کے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد سے ہٹا کر ان کی صلاحیتوں کو اس رخ پر موڑ دیا وہاں اس کے لیے کچھ اسباب بھی موجود تھے۔ لیکن حضور ﷺ کی امت میں اگر یہ معاملہ آیا ہے تو وہ میرے نزدیک اس کی نسبت سینکڑوں درجے زیادہ قابل مذمت ہے' اس لیے کہ ان اسباب میں سے کوئی سبب یہاں موجود نہیں تھا۔ حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور آپ کا اُسوہ نہایت جامع اور نہایت متوازن ہے اور اس میں دین و دنیا کا مکمل اور خوبصورت امتزاج ہے۔ یہاں تک کہ تعدّدِ ازدواج اس ضمن میں سیرت کی سب سے نمایاں بات ہو سکتی ہے' لیکن یہ کڑوی گولی عیسائیوں کے حلق

سے قطعاً نہیں اترتی۔ اس لیے کہ ان کا آئیڈیل حضرات مسیح اور یحییٰ علیہما السلام ہیں اور انہوں نے ایک ایک شادی بھی نہیں کی‘ جبکہ حضور اکرم ﷺ نے گیارہ شادیاں کیں اور کنیزیں ان کے علاوہ تھیں۔ تو اس حوالے سے ان کے لیے تو کوئی نہ کوئی عذر موجود ہے‘ لیکن ہمارے ہاں اس کے باوجود اگر رَہبانیت کا نظام آیا ہے تو یہ بہرحال زیادہ قابل مذمت ہے۔ دوسرے یہ کہ وہاں پر تو جہاد و قتال کا راستہ شروع ہی نہیں ہوا‘ جبکہ یہاں نہ صرف شروع ہوا بلکہ بھرپور طریقے پر اس کے سارے مراحل و مدارج طے ہوئے ہیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ ؓ نے اس ضمن میں ہمارے لیے کس درجے واضح سنگ ہائے میل اور نشاناتِ راہ چھوڑے ہیں! اور پھر حضور ﷺ کی صریح احادیث بھی ہیں کہ جب تک پورے کرۂ ارضی پر اللہ کے دین کا غلبہ نہیں ہو جاتا‘ جہاد و قتال کا یہ عمل جاری رہے گا۔ اس حوالے سے ہم نے اگر اس راستے سے انحراف کیا ہے تو یقیناً ہم زیادہ بڑے مجرم ہیں بہ نسبت حضرت مسیح علیہ السلام کے متبعین کے۔

البتہ ہمارے ہاں کچھ حضرات اس راستے پر چلے گئے ہیں تو میں اصولی طور پر یہ بات کہنے کے بعد ان کی طرف سے کچھ معذرت پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ اپنے دل میں کسی فرد کے ساتھ کوئی سوءِ ظن مت آنے دیجیے! حدیث نبویؐ ہے: ((اُذْکُرُوْا مَوْتَاکُمْ بِالْخَیْرِ)) ’’اپنے فوت شدگان کو بھلے الفاظ میں یاد کیا کرو‘‘۔ ہمیں نہیں معلوم کس کے ساتھ کیا مجبوری تھی‘ کس کے کیا ذاتی حالات تھے‘ کس کا کیا معاملہ تھا۔ ایسے اشخاص کی طرف سے میں دو معذرتیں (apologies) پیش کر رہا ہوں اور انہیں ریکارڈ پر لے آنا چاہتا ہوں۔

ایک یہ کہ مسلمانوں کے حکمران جب فاسق و فاجر ہوں تو ان کے بارے میں اس بات کی بڑی تاکید آئی ہے کہ ان کے خلاف خروج میں حد درجہ احتیاط برتی جائے۔ ظاہر بات ہے کہ جب حکومت قائم ہو گئی ہے تو اب اس کا ایک نظم ہے‘ ایک سربراہ ہے‘ چاہے وہ ظالم اور فاسق و فاجر ہے‘ لیکن ہے تو مسلمان! اب اس کے زیر قیادت قتال کا معاملہ بھی ہو گا۔ کچھ عرصہ اس طرح ہوتا رہا کہ جہاں جہاں مسلمانوں کی سرحدیں تھیں وہاں پر مسلمان جہاد و قتال کا معاملہ آگے بڑھاتے رہے۔ لیکن پھر ہوتے ہوتے ایک نظم مملکت کے اندر ساری چیزیں حکومت کے تابع ہو جاتی ہیں۔ اب عام آدمی اپنے طور پر اس قسم کا بڑا کام نہیں کر سکتا جب تک ان فساق و فجار حکمرانوں کو نہ ہٹایا جائے۔ چنانچہ اس کے لیے علیحدہ سے کسی جماعت‘ کسی تحریک کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کام کو لے کر اُٹھ کھڑی ہو۔ تو خروج پر حضور ﷺ کی طرف سے شدید بندشیں اور شرائط عائد کی گئی ہیں۔ میں اس وقت تفصیل میں نہیں جانا چاہتا‘ اس بارے میں امامِ اعظم امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے —— اور میں اسے صحیح سمجھتا ہوں —— کہ ’’فاسق و فاجر مسلمان حکمرانوں کے خلاف مسلح بغاوت جائز ہے‘ بشرطیکہ اتنی قوت فراہم ہو چکی ہو کہ بظاہر احوال کم سے کم کامیابی یقینی ہو جائے‘‘۔ اب ایسے ماحول میں اس قوت کا فراہم ہونا جبکہ ان کا ایک مستبد نظام قائم تھا‘ محالات کے درجے میں تھا۔ لہٰذا اُس دور میں جہاد و قتال ایک طرح کا Imperialist extension کا مرحلہ تو بن گیا لیکن اس کی نوعیت اُس جہاد و قتال کی نہیں رہی جو غلبۂ دین کے لیے تھا۔

اسی طرح سے ایک دوسرا عامل یہ تھا کہ ابھی تک انسان کا تمدنی اور عمرانی شعور اس درجے تک نہیں پہنچا تھا کہ ’’ریاست‘‘ اور ’’حکومت‘‘ کے درمیان فرق ہو۔ حکومت کو بدلنے کے لیے بھی سوائے مسلح بغاوت کے کوئی چیلنجز ابھی موجود نہیں تھے‘ جیسے کہ آج ہمارے سامنے حکومت کو بدلنے کے لیے چیلنجز ہیں۔ آج کم از کم عالم اسلام کے وہ ممالک جہاں کسی درجے میں جمہوریت ہے اور وہاں حقوق انسانی اور شہری حقوق کا تصور موجود ہے وہاں کے عوام کو یہ حق حاصل ہے کہ حکومت کو بدلیں‘ چاہے ووٹ کے ذریعے بدلیں‘ چاہے ایجی ٹیشن کے ذریعے بدلیں۔ ایجی ٹیشن بھی وہ جو پرامن ہو‘ منظم ہو‘ جس سے کسی کی جان اور املاک کو نقصان نہ پہنچے‘ صرف یہ کہ گھیراؤ کر کے حکومت کی مشینری کو بلاک کیا جا رہا ہو تو یہ بھی ان کا جائز اور دستوری حق ہے۔ چونکہ دورِ ملوکیت میں اس طرح کے حقوق کا تصور موجود نہیں تھا لہٰذا بہت سے حضرات نے تصوف اور رہبانیت کا راستہ اختیار کر لیا۔

اس حوالے سے آج کے دور میں ہمیں یہ سہولتیں حاصل ہو گئیں جو سابقہ ادوار میں نہیں تھیں۔ جہاں تک تمدنی حقوق کا تعلق ہے، بعض ممالک جیسے سعودی عرب اور عرب امارات میں تو ان کا تصور ہی سرے سے نہیں ہے اور کہیں صرف دکھاوا ہے، جیسے کہ مصر اور لیبیا وغیرہ۔ ان ممالک میں بڑی شدید آمریت ہے، یک جماعتی حکومت کا نظام چل رہا ہے۔ لہٰذا یہاں انتخاب اور ایجی ٹیشن کا کوئی امکان پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن جہاں کہیں بھی حقوق کا یہ تصور موجود ہے اُن ممالک میں سے ایک خوش قسمت ملک ''پاکستان'' بھی ہے جس میں ہمیں یہ حقوق آزادانہ طور پر حاصل ہیں۔ پھر اگر ہم ان حقوق کو استعمال نہ کریں اور رہبانیت کا راستہ اختیار کر جائیں اور اس پگڈنڈی کی طرف مڑ جائیں تو پھر ہمارے لیے کوئی دلیل، کوئی عذر نہیں ہے۔ جیسے قرآن مجید میں اہل کتاب سے کہا گیا: ﴿یٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَیْءٍ حَتّٰى تُقِیْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ (المائدۃ:۶۸) ''اے اہل کتاب! تمہاری کوئی بنیاد نہیں ہے یہاں تک کہ تم تورات اور انجیل کو اور جو کچھ تم پر تمہارے ربّ کی طرف سے نازل کیا گیا اس کو قائم اور نافذ کرو''۔ اس آیت کو اگر ہم اپنے اوپر منطبق کریں تو یوں کہا جائے گا: "یا اھل القرآن لستم علی شیء حتی تقیموا القرآن وما انزل الیکم من ربکم" ''اے اہل قرآن (اے مسلمانو!) تمہارا تو کوئی بھی مقام نہیں ہے (ہم سے بات کرنے کا منہ نہیں ہے) اگر تم قائم نہیں کرتے ہو قرآن کو اور جو کچھ بھی اللہ کی طرف سے تمہاری جانب نازل کیا گیا ہے''۔

ہمارے ہاں جو دانش ور کہلانے والے حضرات ہیں وہ یہاں بھی گریز کا راستہ اختیار کرتے ہیں کہ یا تو صرف دعوت و تبلیغ ہوتی رہے یا کوئی علمی و تحقیقی کام ہوتا رہے، بس صرف قیل و قال ہوتا رہے، کسی جہاد، قتال، انقلاب کی طرف پیش رفت نہ ہو۔ تو میرے نزدیک ان کا کوئی عذر، سند، مقام، بنیاد نہیں ہے اور ''لَسْتُمْ عَلٰى شَیْءٍ'' والی بات ان پر بتمام وکمال منطبق ہوتی ہے۔

آیت ۲۸ کی تاویلِ خاص

آگے فرمایا: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ﴾ (آیت ۲۸) ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اس کے رسول (محمدﷺ) پر ایمان لاؤ''۔ ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ کے مفہوم کو معین کرنے سے آیت کی دو تاویلات ہوں گی۔ پچھلی آیت ان الفاظ پر ختم ہوئی تھی: ﴿فَاٰتَیْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَكَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ﴾ یعنی متبعین مسیح علیہ السلام میں سے جو لوگ صاحبِ ایمان ہوئے، ہم نے انہیں ان کا بھرپور اجر عطا کر دیا، لیکن ان کی بھی کثیر تعداد فاسقین پر مشتمل ہے۔ متبعین مسیحؑ میں سے جو لوگ صاحب ایمان ہوئے ان سے مراد کیا ہے! ایک مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ حضرت مسیح علیہ السلام کے صحیح دین پر رہے، ایمان پر قائم رہے، اب ان لوگوں کو درحقیقت ترغیب دی جا رہی ہے کہ اب لاؤ ایمان محمدﷺ پر۔ فرمایا جا رہا ہے: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾: یعنی ''اے وہ لوگو جو (مسیح علیہ السلام پر صحیح معنی میں) ایمان رکھتے ہو'' —— اب اللہ کو چونکہ وہ پہلے سے مانتے ہیں، لہٰذا یہاں ''اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ'' کا لفظ نہیں آیا، بلکہ فرمایا: ﴿اِتَّقُوا اللّٰهَ﴾ ''اللہ کا تقویٰ اختیار کرو''۔ جس اللہ کو تم پہلے سے مانتے ہو تمہاری زندگی کے اندر بالفعل اس کا خوف اور اس کے محاسبے کا احساس برقرار نظر آنا چاہیے! ﴿وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ﴾ ''اور ایمان لاؤ اُس کے رسولؐ پر''۔ یہ گویا تمہارے لیے نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ کا معاملہ ہوگا۔ تمہارے اس ایمان کا جو تم عیسیٰ علیہ السلام پر رکھتے ہو، اگر وہ سچا ایمان ہے، لازمی تقاضا بھی یہی ہے۔ اب اگر تم ایمان نہیں لا رہے محمدﷺ پر تو گویا تمہارا حضرت مسیحؑ پر ایمان کا دعویٰ بھی باطل ہو جائے گا۔ حضرت محمدﷺ پر ایمان لانے میں اب تمہیں کوئی عصبیت نہ روکے کہ یہ نیا نبی ہے، نئی قوم کے اندر آیا ہے، یہ اُمیین میں سے ہے۔ بلکہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور عصبیت، ضد، ہٹ دھرمی، مغائرت میں سے کسی چیز کو اپنے راستے میں رکاوٹ نہ بننے دو۔ تو اس تاویل کی رو سے اس آیت کا مفہوم یہ ہے۔

اب اس تاویل کی رو سے آیت کا مفہوم مکمل کر لیجیے! فرمایا: ﴿یُؤْتِكُمْ كِفْلَیْنِ مِنْ

رَّحْمَتِہٖ﴾ ’’(اگر تم ایسا کرو گے تو) اللہ تمہیں عطا کرے گا اپنی رحمت میں سے دوگنا حصہ‘‘۔ ”کِفْلٌ“ کہتے ہیں ترازو کے ایک پلڑے کو۔ تو کِفْلَیْن کا مطلب ہوگا ’’دو پلڑے‘‘۔ اب اس اعتبار سے مفہوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دوہرا اجر عطا فرمائے گا۔ ﴿وَیَجْعَلْ لَّکُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِہٖ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ط﴾ ”اور تمہیں وہ نور عطا فرمائے گا جس کو لے کر چل سکو گے اور تمہیں بخش دے گا‘‘۔ جو خطائیں اور غلطیاں ہوں گی‘ سابقہ زندگی کی بھی اور آگے کی بھی‘ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے گا۔ ﴿وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴾ ’’اور اللہ غفورٌ رحیم ہے‘‘۔ یہ تاویل بڑی مسلسل (continuous) تاویل بنتی ہے۔ پچھلی اور اگلی دونوں آیتوں کے ساتھ اس کا ربط بہت گہرا جڑ رہا ہے۔

اس تاویل کے حق میں ایک متفق علیہ حدیث بھی ہے:

عَنْ اَبِیْ بُرْدَۃَ بْنِ اَبِیْ مُوْسٰی عَنْ اَبِیْہِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: ((ثَـلَاثَۃٌ یُؤْتَوْنَ اَجْرَھُمْ مَّرَّتَیْنِ : رَجُلٌ مِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ آمَنَ بِنَبِیِّہٖ وَاَدْرَکَ النَّبِیَّ ﷺ فَـآمَنَ بِہٖ وَاتَّبَعَہٗ وَصَدَّقَہٗ فَلَہٗ اَجْرَانِ‘ وَعَبْدٌ مَمْلُوْکٌ اَدّٰی حَقَّ اللّٰہِ تَعَالٰی وَحَقَّ سَیِّدِہٖ فَلَہٗ اَجْرَانِ‘ وَرَجُلٌ کَانَتْ لَہٗ اَمَۃٌ فَغَذَّاھَا فَاَحْسَنَ غِذَاءَ ھَا ثُمَّ اَدَّبَھَا فَاَحْسَنَ اَدَبَھَا‘ ثُمَّ اَعْتَقَھَا وَتَزَوَّجَھَا فَلَہٗ اَجْرَانِ))

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے صاحبزادے حضرت ابو بردہؓ اپنے والد کے حوالے سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ’’تین قسم کے لوگ وہ ہوں گے جنہیں (قیامت کے دن) دوہرا اجر ملے گا: ایک اہل کتاب میں سے وہ شخص جو ایمان رکھتا تھا اپنے نبی (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) پر اور اس نے نبی آخر الزمان ﷺ کا زمانہ بھی پا لیا (یعنی حضور ﷺ کو پہچان لیا‘ چاہے وہ حضور ﷺ کے زمانے میں نہیں بھی تھا) اور وہ ان پر بھی ایمان لے آیا اور آپ ﷺ کا اتباع کیا اور آپ ﷺ کی تصدیق کی تو ایسے شخص کے لیے دوہرا اجر ہے۔ اور دوسرا وہ غلام جس نے اللہ تعالیٰ کا حق بھی ادا کیا اور اپنے آقا کا حق بھی ادا کیا (یعنی خدا اور رسول کی اطاعت کے ساتھ ساتھ اپنے آقا کا حق بھی بحسن و خوبی ادا کیا) تو اس کے لیے بھی دوہرا اجر ہے۔ اور ایک ایسا شخص کہ جس کی کوئی کنیز (باندی) تھی‘ تو اُس نے اسے اچھی غذا دی (اس کو کھلایا‘ پلایا‘ پالا پوسا) اور اس کی عمدہ اخلاقی تربیت کی (اس کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا) پھر (جب وہ جوان ہوگئی تو) اسے آزاد کر دیا اور اس سے باقاعدہ نکاح کیا (یعنی پہلے تو اس کی لونڈی کی حیثیت تھی‘ اب اسے آزاد کر کے اپنے عقد نکاح میں لا کر برابری کا درجہ عطا کر دیا) تو اس شخص کے لیے بھی دو اجر ہیں‘‘۔

بہرحال آخر الذکر باتیں ہمارے موضوع سے متعلق نہیں ہیں‘ جبکہ پہلی بات اس آیت کی مذکورہ بالا تاویل کی پوری طرح تائید کر رہی ہے۔ اس چوتھے رکوع کے مضمون کے ساتھ (یعنی ماقبل آیات سے) اس تاویل کی کامل مطابقت ہے۔ اس لیے کہ اس میں رہبانیت کا تذکرہ ہو رہا ہے‘ حضرت مسیح علیہ السلام کا تذکرہ ہو رہا ہے‘ حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان لانے والوں کا ذکر ہو رہا ہے اور اب ان کو دعوت دی جا رہی ہے کہ تم جب اپنے نبی حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان رکھتے ہو تو اب اس کا تقاضا یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ پر بھی ایمان لاؤ اور اس کے بدلے میں تمہارے لیے دوہرا اجر ہوگا۔

تاویل عام کے اعتبار سے آیت کا مفہوم

اس آیت کی ایک تاویل عام بھی ہے اور وہ ہمارے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اس لیے کہ اِس سورۂ مبارکہ کا یہ حصہ سورۃ الحدید کا نقطۂ عروج بھی ہے۔ اس اعتبار سے یہاں پر گویا مخاطب عام اہل ایمان ہیں‘ صرف متبعین مسیحؑ ہی نہیں ہیں‘ لہٰذا ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ کا مطلب ہے: ’’اے اہل ایمان!‘‘ یعنی وہ تمام مسلمان جو حضور ﷺ پر ایمان لائے‘ چاہے وہ پہلے تھے‘ چاہے آج ہیں‘ چاہے ہمیشہ ہوں گے‘ سب اس خطاب میں شامل ہیں۔ فرمایا: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِہٖ﴾ ’’اے اہل ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور ایمان رکھو اس کے رسول (ﷺ) پر‘‘۔ یہاں ایمان بالرسولؐ پر جو emphasize کرنا پیش نظر ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ درحقیقت ایمان

بالرسول اور اطاعت رسول ﷺ ہی میں اصل ہدایت مضمر ہے۔ ہدایت عملی کا سارے کا سارا دار و مدار اطاعت رسول اور ایمان بالرسول ﷺ پر ہے۔ ایمان بالرسول یہ ہے کہ انسان کو یہ یقین ہو کہ جو خیر ملے گا یہاں سے ملے گا' جو بھلائی ملے گی یہاں سے ملے گی۔ اب اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ حضور ﷺ کو اسوۂ کاملہ ماننے والا شخص کبھی بھی گھر گرہستی کی زندگی کو گھٹیا نہیں سمجھ سکتا' یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر دل میں حضور ﷺ کی عظمت ہے' حضور ﷺ سے عقیدت اور محبت ہے' اور معلوم ہے کہ ''جا ایں جاست'' ہدایت کا منبع اور سرچشمہ حضور ﷺ کی سیرت ہے' تو کیسے ممکن ہے کہ مزاج کے اندر کہیں رہبانیت کا رُخ پیدا ہو سکے! ﴿وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ﴾ ''اور اللہ کے رسول (ﷺ) پر پورا ایمان رکھو'' کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ یہ جو تمہارے اوپر انقلاب کا ایک فریضہ عائد کیا گیا ہے کہ ہم نے تمہیں جو نظامِ عدل وقسط عطا کیا ہے اس کو قائم کرو' تو اس کے قیام کا طریقِ کار اور منہج جاننے کے لیے اپنی مائیکروسکوپ کو سیرتِ محمد ﷺ پر مرتکز کر دو۔

میں اس سے پہلے بھی کئی مواقع پر عرض کر چکا ہوں کہ قرآن مجید میں اقامتِ دین کی فرضیت' اعلاءِ کلمۃ اللہ کی اہمیت' تکبیر ربّ اور ''اظھارُ دینِ الحقّ علی الدّین کُلّہ'' کے لیے جہاد وقتال کی فرضیت ''یَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّـــــهٗ لِلّٰہِ'' کے مقصد کے لیے جدوجہد کی اہمیت اور اس کی فرضیت' یہ چیز بہت ہی واضح اور اظہر من الشّمس ہے' بشرطیکہ کسی کے دل میں کھوٹ نہ ہو اور گریز اور فرار کی نیت نہ ہو۔ اب سوچنا یہ ہے کہ ان بدلے ہوئے حالات میں یہ کام کیسے کیا جائے؟ اس کے لیے درحقیقت قرآن مجید سے براہِ راست ہدایت نہیں ملتی۔ اس لیے کہ ترتیبِ مصحف ترتیبِ زمانی کے اعتبار سے نہیں ہے۔ قرآن مجید میں وہ سورتیں بھی کہ جن کا تعلق سیرتِ محمدی ﷺ سے ہے اور جن کا اکثر و بیشتر حصہ سیرت کے واقعات سے بحث کرتا ہے' زمانی ترتیب سے نہیں ہیں' مثلاً سورۃ التوبۃ دسویں گیارھویں پارے میں آ گئی ہے جس میں غزوۂ تبوک کا ذکر ہے جبکہ سورۃ محمدؐ چھبیسویں پارے میں ہے جو کہ غزوۂ بدر سے پہلے نازل ہوئی ہے۔

اسی طرح سورۃ الاحزاب اکیسویں پارے میں ہے جس کے اندر غزوۂ احزاب کا ذکر ہے جو ۵ ھ میں ہوا ہے۔ جو سورتیں مکی دور کے بالکل ابتدائی ایام میں نازل ہوئی ہیں وہ مصحف میں اخیر میں ہیں۔ تو اس حوالے سے قرآن مجید میں وہ ترتیب نہیں ہے جو نزولی اعتبار سے ہے۔ یہ ترتیب ملے گی سیرت النبی ﷺ سے۔

اقامتِ دین کی جدوجہد میں سیرتِ نبویؐ سے راہنمائی

میں نے بعض مواقع پر مثال دی ہے کہ جس علاقے میں بھی امید ہو کہ یہاں سے تیل نکل آئے گا تو وہاں ارب ہا ارب ڈالر ڈرلنگ کے اوپر خرچ کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ یقین بھی نہیں ہے' بس کچھ خیال اور امید ہے کہ یہاں سے ہمیں وہ سیال سونا مل جائے گا تو اسی امید پر وہاں بہت بڑی مہم چلائی جاتی ہے۔ تو اگر یہ یقین ہو جائے کہ یہ ہدایت کہ دین کیسے قائم ہو گا' ہم اپنے اس فریضۂ اقامت دین سے کیسے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں' اس کی عملی شکل کیا ہو گی' صرف سیرتِ محمدیؐ سے ملے گی تو پھر آپ اپنی توجہ اسی پر مرکوز کریں گے' اس پر غور کریں گے' تدبر کریں گے۔ اقبال نے قرآن پر غور و تدبر کی دعوت دیتے ہوئے یہ الفاظ استعمال کیے ہیں ؏ ''قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں!'' اسی طرح سیرتِ محمدیؐ میں غوطہ زن ہوئے بغیر طریقِ انقلاب آپ کے سامنے واضح نہیں ہو گا۔ تو میرے نزدیک اس آیت مبارکہ کا تعلق زیر درس سورۃ کے اس عمود کے ساتھ جڑ جاتا ہے کہ:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَیْبِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ ﴿۲۵﴾﴾

''ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیاں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا اور اُن کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تا کہ لوگ انصاف پر قائم ہوں' اور ہم نے لوہا اتارا جس میں بڑا زور ہے اور لوگوں کے لیے منافع ہیں۔ یہ اس لیے کیا گیا ہے تا کہ اللہ کو معلوم ہو جائے (اور وہ لوگوں پر واضح کر دے) کہ کون اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے غیب میں رہتے ہوئے۔ یقیناً اللہ بڑی

قوت والا اور زبردست ہے‘‘۔

اب اس کا عملی طریق کار تمہیں کہاں ملے گا؟ فرمایا: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ﴾ ’’اے (تمام) اہل ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اس کے رسولوں پر ایمان پختہ رکھو!‘‘ سارا زور اطاعت و اتباعِ رسولؐ کے اوپر ہے۔ جیسے کہ آیۂ استخلاف (النور:۵۵) سے ماقبل آیت (نمبر۵۴) میں بھی اطاعت رسول پر زور ہے۔ فرمایا:

﴿قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَیْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ؕ وَاِنْ تُطِیْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ۝﴾

’’کہہ دیجیے (اے محمدﷺ) کہ اللہ کے مطیع بنو اور رسولؐ کے تابع فرمان بن کر رہو۔ لیکن اگر تم منہ پھیرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ رسول پر جس فرض کا بار رکھا گیا ہے اس کا ذمہ دار وہ ہے اور تم پر جس فرض کا بار ڈالا گیا ہے اس کے ذمہ دار تم ہو۔ اس کی اطاعت کرو گے تو خود ہی ہدایت پاؤ گے‘ ورنہ رسولؐ کی ذمہ داری اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ صاف صاف حکم پہنچا دے۔‘‘

اور مابعد آیت (نمبر۵۶) میں بھی اطاعتِ رسولؐ پر زور ہے: ﴿وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝﴾ ’’اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے‘‘۔ درحقیقت اس طویل آیت آیۂ استخلاف کے اوّل و آخر سارا زور ہے اللہ کے رسولؐ کی اطاعت پر۔ تو اس حوالے سے منہج انقلابِ نبویؐ کی اہمیت سامنے رہے۔ اور اس کے لیے بہرحال ہمارے پاس فہم و ادراک کا سرچشمہ اور ذریعہ سوائے سیرت النبیﷺ کے اور کوئی نہیں ہے۔ اور اس کے لیے بھی یہ بات پیش نظر رہے کہ جیسے قرآن کو سمجھنے کے لیے کوئی ایک تفسیر کفایت نہیں کرتی اسی طرح اگر کسی ایک کتابِ سیرت پر اکتفا کر کے بیٹھ رہیں گے تو سیرت کے بہت سے پہلو اوجھل رہ جائیں گے۔ ہر سیرت نگار کا اپنا نقطۂ نظر ہے‘ جیسے ہر مفسر کا اپنا ایک نقطۂ نظر ہے‘ ہر مفکر کا اپنا ایک زاویۂ نگاہ (angle of view) ہے۔ ایک ہی شے کو اِدھر والے دیکھ رہے ہیں تو ان کے پردۂ بصارت پر اس کی تصویر کچھ اور بن رہی ہے‘ جبکہ اُدھر والے دیکھ رہے ہیں تو ان کے retina پر اس کی تصویر کچھ اور بن رہی ہے۔ مختلف زاویۂ نگاہ سے زمین و آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایک ہی قرآن ہے‘ اس کو ایک شخص پڑھ رہا ہے‘ تدبر کر رہا ہے‘ سمجھ رہا ہے‘ اور یہ سب کچھ نیک نیتی سے کر رہا ہے‘ لیکن اس کے سامنے کچھ اور پہلو زیادہ اجاگر ہو رہے ہیں۔ دوسرا شخص بھی نیک نیتی سے اپنی امکانی حد تک محنت کر رہا ہے‘ جہاد کر رہا ہے‘ اجتہاد کر رہا ہے‘ لیکن اس کے سامنے کچھ دوسرے پہلو نمایاں ہو رہے ہیں۔ تو کوئی ایک کتاب تفسیر بھی کبھی کفایت نہیں کرے گی اور کوئی ایک کتابِ سیرت بھی کبھی کفایت نہیں کرے گی۔ اس کے لیے مختلف کتابوں سے استفادہ کرنا چاہیے‘ لیکن یہ طے ہو جائے کہ ’’جا این جاست‘‘ جو کچھ ملے گا یہیں سے ملے گا‘ لہٰذا اس کارِ عظیم کا طریق کار سیرتِ نبویؐ سے ماخوذ ہو گا‘ اور خاص طور پر طریق تنظیم۔

انقلابِ نبویؐ کے طریقِ کار کے مختلف مراحل تو پھر بھی قرآن مجید میں مل جاتے ہیں‘ لیکن یہ کہ اس کے لیے جمعیت کس بنیاد پر فراہم ہو گی‘ اس کے بارے میں قرآن میں سوائے اشاروں کے کچھ ہے ہی نہیں‘ جبکہ اس کا پورا نقشہ آپ کو سیرتِ نبویہؐ سے ملے گا۔ اسی طرح سیرت میں بیعت کا ایک مکمل نظام ہے‘ حالانکہ حضورﷺ کے لیے تو بیعت ضروری تھی ہی نہیں۔ آپ تو رسول تھے۔ جو ایمان لے آیا اسے تو ہر حال میں آپؐ کی اطاعت کرنی ہی کرنی تھی۔ کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی اطاعت نہ کرے۔ تو ایک علیحدہ سے قول و قرار اور اطاعت کا معاہدہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی‘ لیکن آپﷺ نے درحقیقت بعد میں آنے والوں کے لیے یہ اسوہ سے چھوڑا ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ ’’تمہارے لیے رسول اللہ کی زندگی میں ایک بہترین (اور مکمل) نمونہ ہے‘‘۔ اس اعتبار سے یہ بیعت کا نظام میرے‘ آپ کے لیے اور اِس وقت کے تمام مسلمانوں کے لیے ہے‘ چاہے حضرت مسیح علیہ السلام کے متبعین میں سے کوئی ایمان لے آئے‘ چاہے یہودیوں میں سے کوئی ایمان لے آئے‘ جیسے حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں‘

چاہے مشرکین عرب میں سے کوئی ایمان لائے' وہ انصار میں سے ہو یا مہاجرین میں سے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں پر ''کِفْلَیْنِ'' کے کیا معنی ہوں گے؟ اس لیے کہ پچھلی تاویل کے اعتبار سے تو مذکورہ بالا حدیث نبویؐ کی رو سے ''کِفْلَیْنِ'' کے معنی معین ہو گئے کہ اہل کتاب میں سے جو محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آئیں گے انہیں دوہرا اجر ملے گا' اس لیے کہ وہ پہلے اپنے نبی پر بھی ایمان لائے ہوئے تھے' انہوں نے تعصب کی کسی پٹی کو اپنی آنکھوں پر بندھنے نہیں دیا اور حضور ﷺ پر بھی ایمان لے آئے۔ لیکن یہ کہ متبعین محمد ﷺ جو عام ہوں' ان کے لیے ''کِفلین'' کس اعتبار سے ہوگا؟ مثلاً ہم تو پیدا بھی ہوئے امت محمدؐ میں۔ یا کچھ لوگ وہ تھے جو پہلے کسی بھی نبی کے ماننے والے نہیں تھے' وہ حضور ﷺ پر ایمان لے آئے اور حضور ﷺ کا اتباع کرتے ہیں' آپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں تو اُن کے لیے ''کِفلین'' کس اعتبار سے ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے سورۂ سبا کی آیت ۳۷ کا مطالعہ کیجیے جو دیگر تمام مسلمانوں کے لیے بھی کِفلین کا مفہوم دے رہی ہے۔ فرمایا: ﴿وَمَا اَمْوَالُکُمْ وَلَا اَوْلَادُکُمْ بِالَّتِیْ تُقَرِّبُکُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰی اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا﴾ ''(دیکھو مسلمانو!) وہ چیزیں جن کے ذریعے سے تم ہمارا تقرب حاصل کر سکتے ہو وہ تمہارے اموال اور اولاد نہیں ہیں' سوائے اُس کے جو ایمان لائے اور عمل صالح کرے''۔ ایمان اور عمل صالح کے بعد تو مال بھی تقرب الی اللہ کا ذریعہ بن جائے گا' اسے اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے' اولاد بھی ذریعۂ تقرب بن جائے گی' اسے اللہ کے دین کے لیے تیار کیا جائے' اس کے اندر وہی جذبہ پیدا کیا جائے اور ان کی تربیت کی جائے۔ لیکن ایمان اور عمل صالح کے بغیر اولاد سے اور مجرد مال سے تقرب حاصل نہیں ہوتا۔ آگے فرمایا: ﴿فَاُولٰٓئِکَ لَھُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا﴾ ''تو ایسے لوگوں کے لیے ان کے اعمال کا دوہرا اجر ہو گا''۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ دوہرا اجر کیوں ہوگا؟ یہ دوہرا اجر اس اعتبار سے ہے کہ ہر مسلمان جب دین پر عمل کرتا ہے تو وہ اپنے عمل کے ذریعے سے اپنے پیچھے والوں کے لیے بھی ایک اُسوہ چھوڑ رہا ہوتا ہے۔ فرض کیجیے کوئی شخص رشوت لیتا تھا' اس کی زندگی میں اللے تللے تھے' عیش ہو رہی تھی۔ اب اس نے سمجھا کہ یہ حرام ہے اور اسے چھوڑ دیا تو اب یہ چیز کسی اور کے لیے بھی مثال بن جائے گی کہ اگر اُس کا بغیر رشوت کے گزارا ہو رہا ہے تو ہمیں بھی موت نہیں آ جائے گی' فاقہ نہیں آ جائے گا اگر میں اِس حرام سے رُک جاؤں۔ یا فرض کیجیے کوئی شخص کسی بینک کے اندر ملازم تھا' پندرہ بیس ہزار روپے تنخواہ لے رہا تھا' لیکن اب اس نے وہاں سے ملازمت چھوڑ دی ہے اور کہیں دوسری جگہ تین چار یا پانچ ہزار کی تنخواہ پر گزارا کر رہا ہے تو اس کے اس عمل سے کسی اور شخص کے اندر بھی عزیمت پیدا ہو سکتی ہے کہ اگر وہ ہمت کر سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ مجھے بھی ہمت دے سکتا ہے۔ تو یہ صاحب عزیمت انسان بعد والوں کے لیے یا خود اپنے زمانے کے لوگوں کے لیے چونکہ نمونہ بن جاتا ہے' ان کی ہمت افزائی اور حوصلہ افزائی کا ذریعہ بن جاتا ہے' لہٰذا ایسے لوگوں کے لیے اجر دوہرا ہے۔ قرآن مجید میں اس کی دوسری مثال سورۃ الاحزاب میں حضرت محمد ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے ضمن میں آئی ہے۔ ان سے فرمایا گیا کہ اگر تم نیک کام کرو گی تو تمہیں اجر بھی دوہرا ملے گا اور اگر کوئی غلط حرکت کرو گی تو سزا بھی دوہری ملے گی۔ اس لیے کہ تمہاری ایک خصوصی حیثیت ہے کہ تمہیں تمام اُمت مسلمہ کی خواتین کے لیے اُسوہ بننا ہے۔ عورتوں کی زندگیوں کا جو خالص نسوانی اور صنفی پہلو ہے اس اعتبار سے ظاہر بات ہے کہ حضور ﷺ تو ان کے لیے مکمل نمونہ نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ آپؐ بہرحال مرد ہیں۔ تو وہ اسوہ اللہ نے ازواجِ مطہرات کے ذریعے سے فراہم کیا ہے۔ اس حوالے سے فرمایا کہ اگر تم نے کوئی غلط حرکت کی تو سزا دوہری ہوگی اور اگر نیکی پر چلو گی تو تمہارا اجر بھی دوہرا ہے۔ اس معنی میں ''کِفْلَین'' کا مفہوم بھی معین ہو گیا۔

اس تاویل سے آیت کا اگلا ٹکڑا بہت زیادہ نکھر رہا ہے کہ: ﴿وَیَجْعَلْ لَّکُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِہٖ﴾ ''اور وہ تمہیں نور دے گا جس کو لے کر تم چل سکو گے''۔ ''تَمْشُوْنَ

بِہٖ'' کا ایک پہلو تو سورۃ الحدید کی آیت ۱۲ کے حوالے سے سمجھ لیجیے کہ قیامت کے دن میدانِ حشر میں جب اہل ایمان اور منافقوں کو علیحدہ کرنے کے لیے چھلنی لگے گی تو اہل ایمان کو نور عطا ہوگا۔ وہ نور ان کے سامنے بھی ہوگا اور داہنے ہاتھ کی طرف بھی ہوگا۔ اس سے مراد ایک تو یہ نورِ ایمان ہے' اور خاص طور پر اللہ کے نبی ﷺ پر ایمان کا نور جس کو لے کر اہل ایمان چل سکیں گے۔ لیکن میرے نزدیک اس امکان کے باوجود یہ تاویل زیر درس آیت کے ساتھ زیادہ مناسبت نہیں رکھتی۔ اب آپ اس کی اصل مناسبت سمجھ لیجیے! آپ دین کی انقلابی جدوجہد میں مصروف ہیں' اس راہ میں جدوجہد کر رہے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ کوئی پگڈنڈی اِدھر مڑ رہی ہے' کوئی اُدھر مڑ رہی ہے۔ اب قدم قدم پر سوال آئے گا کہ کہاں جاؤں؟ اب اگر رسول اللہ ﷺ پر گہرا ایمان ہے' اور یقین ہے کہ ''جا ایں جا است'' کہ یہیں سے ملے گا جو کچھ ملے گا تو پھر یہ نور تمہارے ساتھ ہوگا' یہ قدم قدم پر تمہاری راہنمائی کرے گا اور کسی غلط موڑ پر مڑنے سے بچا لے گا۔ ﴿وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ﴾ سے مراد دراصل یہ ہے۔ لہٰذا اِس وقت اُسوۂ رسول ﷺ کو سامنے رکھو! ذاتی زندگی کے معاملات ہوں یا تحریکی معاملات ہوں' اجتماعی اور انقلابی جدوجہد ہو' ہر جگہ اسوۂ رسولؐ سامنے رہنا چاہیے! البتہ جہاں کہیں معین طور پر بالکل نئی صورتِ حال ہو' وہ حالات نہ ہوں جو حضور ﷺ کے زمانے میں تھے تو نئے تبدیل شدہ حالات کے اندر پھر اجتہاد کیا جائے گا۔ اور اجتہاد بھی کتاب و سنت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ وہیں سے استنباط کرنا ہوتا ہے۔ جیسے آپ کو راجباہ سے پانی لے کر آنا ہے تو وہاں سے نالی کھینچنا ہوگی' ورنہ اگر نالی کا تعلق راجباہ کے ساتھ ہی نہیں ہے تو پانی کہاں سے آ جائے گا؟ تو اصل راہنمائی تو قرآن و سنت ہی سے ملے گی' وہیں سے اجتہاد کر کے راہنمائی حاصل کرنی ہے۔ اور یہ اجتہاد بھی صرف اُسی جگہ ہوگا جہاں پر قطعیت کے ساتھ ثابت ہو جائے کہ یہ بالکل نئی صورتِ حال ہے جو اُس وقت کے حالات سے بالکل مختلف ہو چکی ہے' اور پھر اس کا تعین بھی کرنا ہوگا کہ جتنی جگہ پر اجتہاد کی ضرورت ہے اس سے آگے تجاوز نہ ہو' ایسا نہ ہو کہ اس کو generalize کر کے پورے کے پورے منہجِ انقلابِ نبویؐ کی بساط لپیٹ دی جائے' بلکہ صرف اُس Particular Issue کی حد تک اجتہاد کیا جائے۔ بہرحال میرے نزدیک یہ مفہوم ہے اس آیۂ مبارکہ کا!

اس سورۂ مبارکہ کا عمود اس کی آیت ۲۵ ہے۔ اس کا مفہوم ذہن میں رکھتے ہوئے براہ راست اس آیت پر آ جائیے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ﴾ ''اے اہل ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو''۔ تمہارے اندر قوت وصلاحیت اور ایثار وقربانی کا مادہ تو اللہ کے تقویٰ سے پیدا ہوگا' یعنی اللہ کا خوف اور اس کی محبت۔ تقویٰ کے اندر ایک پہلو محبت کا بھی تو ہے! یعنی کسی محبوب ہستی کے کسی حکم سے بھی سرتابی نہ کرنا کہ مبادا وہ ناراض ہو جائے' اس طرزِ عمل کی اصل بنیاد محبت ہے۔ یہی تمہاری source of energy ہے۔ تمہاری جدوجہد اور صلاحیتوں کے لیے ایک رخ متعین کرنے والی شے تو اللہ کا تقویٰ ہے' لیکن یہ نیت' جذبہ' جوش وخروش' جدوجہد' جہاد وقتال عملاً کس راستے پر direct ہوں؟ فرمایا: ﴿وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ﴾ ''اور ایمان لاؤ اس کے رسولؐ پر''۔ اب اس کے لیے طریق کار اور منہج محمد رسول اللہ ﷺ کا اُسوۂ کاملہ اور آپؐ کی سیرتِ مطہرہ میں ہے۔ اگر یہ کرو گے تو اللہ کا وعدہ ہے کہ ﴿يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ﴾ ''وہ تمہیں اپنی رحمت کا دوہرا حصہ عطا فرمائے گا''۔ اس لیے کہ تم خود بھی دوسروں کے لیے اسوہ بن جاؤ گے' اسوۂ محمدی کو transmit کرنے کا ذریعہ بن جاؤ گے۔ تم بھی گویا ایک لنک بن جاؤ گے اس اُسوۂ محمدیؐ کو دوسرے لوگوں یا اگلی نسلوں تک منتقل کرنے کے لیے۔ ﴿وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ﴾ ''اور وہ تمہیں نور عطا کرے گا جس میں تم چل سکو گے''۔ تمہاری اجتماعی جدوجہد کو قدم قدم پر راہنمائی فراہم کرنے کے لیے وہ نورِ سیرتِ محمدیؐ ہر وقت تمہاری دستگیری کے لیے موجود ہوگا۔ ﴿وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ ''اور (اگر کوئی خطا ہو ہی گئی تو) اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے گا۔ اور اللہ غفور ہے' رحیم ہے''۔

آیت ۲۹ کا تفسیری اشکال اور اس کا حل

﴿ لِئَـلَّا يَعۡلَمَ اَهۡلُ الۡكِتٰبِ اَ لَّا يَقۡدِرُوۡنَ عَلٰى شَىۡءٍ مِّنۡ فَضۡلِ اللّٰهِ وَاَنَّ الۡفَضۡلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِيۡمِ ﴾

”(یہ اس لیے ہے) تا کہ اہلِ کتاب یہ نہ سمجھ لیں کہ اللہ کے فضل پر اب ان کا کوئی حق نہیں ہے‘ اور یہ کہ اللہ کا فضل اس کے اپنے ہی ہاتھ میں ہے‘ جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے‘ اور وہ بڑے فضل والا ہے“۔

اس آیت کی تاویل میں بڑا قیل وقال ہے اور میرے نزدیک اس بحث کا اکثر و بیشتر حصہ بالکل بغیر کسی بنیاد کے ہے۔ بدقسمتی سے بعض مقامات پر ہمارے مفسرین خواہ مخواہ کی بحثوں میں بہت الجھ گئے ہیں۔ یہاں ”لِئَـلَّا“ میں جو ”لَا“ ہے اس کے بارے میں اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ یہ زائد ہے اور اصل میں مراد یہ ہے: ”لِـــكَىۡ يَعۡلَمَ اَهۡلُ الۡكِتٰبِ اَنۡ لَّا يَقۡدِرُوۡنَ عَلٰى شَىۡءٍ“ یعنی ”تا کہ یہ معلوم ہو جائے تمام اہلِ کتاب کو کہ ان کی کوئی اجارہ داری نہیں ہے (کوئی ٹھیکے داری نہیں ہے) اللہ کے فضل پر“۔ یہود کا تصور تھا کہ نبوت ورسالت تو ہماری میراث تھی‘ دو ہزار برس تک تو یہ ہمارے پاس رہی‘ اب یہ آخری نبوت و رسالت کہاں چلی گئی! تو فرمایا کہ ان پر یہ بات کھل جائے‘ واضح ہو جائے کہ یہ کوئی تمہاری اجارہ داری نہیں تھی‘ نبوت و کتاب کا یہ معاملہ اب ہم نے بنی اسماعیل کے حوالے کیا ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ خاتم النبیین اور سید المرسلین کی حیثیت سے مبعوث ہو گئے ہیں۔ تو یہ بات ان کے سامنے کھل جانی چاہیے اور کوئی اشتباہ نہیں رہنا چاہیے کہ نبوت و کتاب پر ان کا کوئی اختیار‘ کوئی ٹھیکیداری‘ کوئی اجارہ داری نہیں ہے۔ یہ تو اللہ کا فضل ہے جو اللہ ہی کے اختیار میں ہے‘ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ خوب جانتا ہے کہ نبوت و کتاب کس کو دینی ہے۔ ازروئے الفاظ قرآنی: ﴿اَللّٰهُ اَعۡلَمُ حَيۡثُ يَجۡعَلُ رِسٰلَـتَـهٗ﴾ (الانعام:۱۲۵) ”اللہ خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت کہاں رکھے“۔ اللہ جو فیصلہ کرتا ہے اپنے علم کامل کی بنیاد پر کرتا ہے۔

﴿لِئَـلَّا يَعۡلَمَ اَهۡلُ الۡكِتٰبِ﴾ اس کا ایک تو یہ مفہوم ہے‘ لیکن اس میں ”لَا“ زائد ماننا پڑتا ہے۔ اس لائے زائدہ کے بارے میں مَیں مولانا اصلاحی صاحب اور ان کے ہم خیال لوگوں سے بالکل متفق ہوں کہ قرآن مجید میں کہیں کوئی لفظ زائد نہیں آیا۔ کتابت میں ضرور کچھ حرف زائد آ گئے ہیں۔ چنانچہ کسی جگہ پر آپ دیکھتے ہوں گے کہ ”الف“ لکھا ہوا ہے اور اوپر گول دائرہ بنا ہوا ہے اور یہ الف پڑھنے میں نہیں آتا۔ وہ کتابت کا مسئلہ ہے اور کتابت خالص انسانی معاملہ تھا۔ قرآن لکھا ہوا نازل نہیں ہوا۔ وہ تو حضرت جبرائیل علیہ السلام سے حضور ﷺ نے سنا ہے اور حضور ﷺ سے صحابہ رضی اللہ عنہم نے سنا ہے۔ کتابت ایک اگلا مرحلہ ہے جو انسانی ہاتھوں سے ہوا ہے۔ ہمارے ہاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا جو رسم عثمانی ہے‘ یہ سب سے زیادہ ثقہ (authentic) ہے‘ اس میں بھی بعض حروف اضافی ہیں‘ لیکن قرآن مجید کے ٹیکسٹ میں کوئی لفظ زائد از ضرورت نہیں ہے۔

ایک ”لا“ جو عام طور پر قسموں کے شروع میں آجاتا ہے‘ جیسے ﴿لَاۤ اُقۡسِمُ بِهٰذَا الۡبَلَدِ ۙ﴾ اور ﴿لَاۤ اُقۡسِمُ بِيَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ ۙ﴾ بہت سے مفسرین اس کے بارے میں بھی کہہ دیتے ہیں کہ ”لا“ زائدہ ہے۔ حالانکہ اس کی صحیح ترین تاویل مولانا فراہی نے کی ہے جس کی مولانا اصلاحی نے وضاحت کی ہے کہ یہاں پر اصل میں مخاطب کے کسی خیال کی نفی سے بات شروع کی جا رہی ہے کہ تم جو کچھ سوچ رہے ہو حقیقت وہ نہیں ہے۔ چنانچہ: ﴿لَاۤ اُقۡسِمُ بِيَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ﴾ کا ترجمہ ہو گا Nay, I swear the day of Judgement ”نہیں‘ میں قیامت کے دن کی قسم کھاتا ہوں“۔ تمہارے خیالات‘ تمہارے شکوک پادرِہوا ہیں‘ بے بنیاد ہیں‘ ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ مجھے قیامت کے دن پر اتنا یقین ہے کہ میں اس پر قسم کھا رہا ہوں۔ یہ بہت ہی بلیغ اسلوب ہے۔ تو جتنی بھی قسموں کے شروع میں ”لَا“ آگیا ہے وہ لاءِ زائد نہیں ہے بلکہ وہ اصل میں مخاطبین کے خیالات کی نفی ہے۔ اسی طرح بعض مقامات پر ”لَا“ مجرد تاکید کے لیے آیا ہے۔ جیسے: ﴿مَا مَنَعَكَ اَنۡ لَّا تَسۡجُدَ﴾ (الاعراف:۱۲) ”تجھے کس چیز

نے سجدہ کرنے سے روکا؟'' جب شیطان نے سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا تو اس سے فرمایا کہ ''کس چیز نے تجھے روکا کہ تو سجدہ نہیں کر رہا؟'' حالانکہ روکنے میں نہ کرنے کا مفہوم داخل ہے۔ اگرچہ ''مَا مَنَعَکَ اَنْ تَسْجُدَ'' سے بھی بات پوری ہو جائے گی لیکن یہاں پر ''لَا'' تاکید مزید کے لیے ہے' بےکار و بےمعنی نہیں ہے۔ ہر زبان کے اندر یہ اسلوب ہوتے ہیں کہ کسی چیز پر زور دینے کے لیے نفی کا اضافہ کرتے ہیں۔ جس طرح سورۃ الانبیاء کی آیت ۹۵ ہے: ﴿وَحَرَامٌ عَلٰی قَرْیَۃٍ اَھْلَکْنٰھَا اَنَّھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ۝﴾ ''اور حرام ہے ان بستیوں پر جن کو ہم نے ہلاک کیا کہ وہ اب لوٹیں گے نہیں''۔ حَرَامٌ کے بعد یہاں پر ''لَا'' کی ضرورت نہیں ہے' لیکن یہ بھی اصل میں تاکید مزید کے لیے ہے۔ چنانچہ یہاں پر بھی ہم ''لَا'' کو ہرگز زائد اور بےمعنی نہیں کہہ سکتے۔

ہمارے ایک کرم فرما ہندوستان کے عالم دین مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب کی رائے اس قسم کے اشکالات میں سب سے زیادہ صائب ہوتی ہے۔ چنانچہ مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی اور حیرانی ہوئی کہ انہوں نے صاف کہا ہے کہ یہاں پر ''لَا'' قطعاً زائد نہیں ہے ''لَا'' اپنی جگہ پر صحیح ہے اور اس سے اصلاً مراد یہ ہے کہ ''تاکہ نہ سمجھیں وہ لوگ جو اہل کتاب تھے کہ وہ اب ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے ہیں اللہ کے فضل سے''۔ یہاں پر ''لَا یَقْدِرُوْنَ'' اجارہ داری کی نفی کے لیے نہیں ہے' اس کا مفہوم یہ ہے کہ اب وہ یہ نہ سمجھیں کہ محروم ہو گئے ہیں بلکہ اب بھی ان کے لیے راستہ کھلا ہے۔ آئیں اور ایمان لے آئیں محمدﷺ پر۔ اس کی مثال سورۂ بنی اسرائیل کے شروع میں آئی ہے جہاں بنی اسرائیل سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ﴿عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یَّرْحَمَکُمْ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا﴾ (آیت ۸) ''ہو سکتا ہے کہ اب تمہارا رب تم پر رحم کرے! لیکن اگر تم نے پھر (اپنی سابق روش کا) اعادہ کیا تو ہم بھی پھر (اپنی سزا کا) اعادہ کریں گے''۔ یعنی اب بھی تمہارا ربّ تم پر رحم فرمانے کے لیے تیار اور آمادہ ہے' اس کی آغوشِ رحمت وا ہے' آؤ' ایمان لاؤ۔ اگلی آیت میں فرمایا: ﴿اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ یَھْدِیْ لِلَّتِیْ ھِیَ اَقْوَمُ﴾ ''یقیناً یہ قرآن ہدایت دے رہا ہے سیدھے راستے کی طرف''۔ تو وہی بات یہاں پر کہی جا رہی ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ تم اب راندۂ درگاہ ہو گئے ہو' محروم ہو گئے ہو' تمہارے لیے خیر کا کوئی راستہ کھلا رہ ہی نہیں گیا ہے' جیسے کہ اس سے پہلے اسی سورۃ الحدید کی آیت ۱۷ میں فرمایا گیا ہے کہ ''جان لو! اللہ تعالیٰ زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد زندہ کر دیتا ہے'' تو اگر تمہارے دلوں میں بھی مردنی ہے تو ہم تمہیں بھی دوبارہ زندگی عطا کر دیں گے۔ تو جیسے تشویق و ترغیب کا پہلو وہاں آیا ہے درحقیقت وہی تشویق و ترغیب یہاں اہل کتاب کے لیے ہے' چاہے وہ یہود ہوں یا نصاریٰ ہوں۔ لہٰذا فرمایا جا رہا ہے کہ نہ سمجھیں وہ لوگ جو اہل کتاب میں سے ہیں کہ اب وہ اللہ کے فضل پر بالکل ہی کوئی قدرت نہیں رکھتے' اب اللہ کا فضل ان کی دسترس سے ہی باہر ہو چکا ہے' اب فضلِ خداوندی کے دروازے ان پر مستقلاً اور کلیتاً بند ہو گئے ہیں۔ نہیں' اللہ کے فضل کا دروازہ اب بھی کھلا ہوا ہے' اس کی رحمت کی آغوش وا ہے' آؤ اور اللہ کی رحمت سے ہمکنار ہو جاؤ' اور اس کا راستہ یہی ہے کہ قرآن پر ایمان لاؤ اور محمد رسول اللہﷺ پر ایمان لاؤ!

میں یہ تحقیق کر کے حیران ہوا کہ ''لَا یَقْدِرُوْنَ'' کا لفظ قرآن مجید میں صرف تین جگہ آیا ہے۔ ایک تو یہی سورۃ الحدید کا مقام ہے' باقی دو مقامات وہ ہیں جہاں آخرت میں مسلمان ریاکاروں کی نیکیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ایک تو سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۶۴ ہے جہاں انفاق کا موضوع اپنی پوری تکمیلی شان کے ساتھ آیا ہے۔ فرمایا: ﴿لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ مِّمَّا کَسَبُوْا﴾ ''جو بھی کمائی انہوں نے کی ہو گی اس میں سے کچھ بھی ہاتھ پلے نہیں آئے گا''۔ دوسرا مقام سورۂ ابراہیم کی آیت ۱۸ ہے جہاں الفاظ کی ترتیب میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ فرمایا گیا: ﴿لَا یَقْدِرُوْنَ مِمَّا کَسَبُوْا عَلٰی شَیْءٍ﴾ ''وہ کوئی بھی قدرت نہیں رکھتے اس پر انہوں نے جو بھی کمائی کی تھی''۔ اب یہاں اجارہ داری کا تو کوئی بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں پر جن لوگوں نے اجارہ داری اور ٹھیکے داری کا مفہوم شامل کیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ وہ نظائر

قرآنی سے سرے سے استفادہ نہیں کرتے۔ میں نے دیکھا ہے کہ اکثر و بیشتر ایسے معاملات کے اندر شاہ عبدالقادرؒ سے صحیح رہنمائی ملتی ہے۔ یہاں پر میرا وہ اصول بھی پختہ ہوگیا کہ قرآن مجید میں اہم مضامین کم از کم دو جگہوں پر ضرور آتے ہیں اور اکثر و بیشتر ترتیب عکسی ہو جاتی ہے۔تو منافقین سے فرمایا جارہا ہے کہ جن کو وہ نیکیاں سمجھ رہے تھے وہ تو محض سراب ہے۔جیسے سورۃ الفرقان میں فرمایا گیا:﴿وَقَدِمۡنَاۤ اِلٰی مَا عَمِلُوۡا مِنۡ عَمَلٍ فَجَعَلۡنٰہُ ہَبَآءً مَّنۡثُوۡرًا﴾ اورسورۂ ابراہیم میں ارشاد ہوا:﴿مَثَلُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِرَبِّہِمۡ اَعۡمَالُہُمۡ کَرَمَادِ ۨاشۡتَدَّتۡ بِہِ الرِّیۡحُ فِیۡ یَوۡمٍ عَاصِفٍ ؕ﴾ (آیت ۱۸) ''جولوگ اپنے ربّ کے منکر ہوئے ان کا حال یہ ہے کہ ان کے اعمال اس راکھ کی مانند ہیں جس پر زور کی ہوا چلے آندھی کے دن۔'' جیسے کہ راکھ کا ایک ڈھیر تھا' ایک جھکڑ آیا اور وہ راکھ بکھر گئی' ایسے ہی ان کی نیکیاں اور اعمال ہوں گے۔''لَا یَقۡدِرُوۡنَ'' مذکورہ بالا دونوں جگہ پر انہی الفاظ میں تھوڑی سی لفظی تأخیر وتقدیم کے ساتھ آیا ہے اور دونوں جگہ اِس کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی چیز دسترس سے باہر ہو جائے' کسی کی قدرت میں نہ رہے' کسی کے لیے قابل حصول نہ رہے۔ وہی مفہوم یہاں آرہا ہے کہ نہ مایوس ہو جائیں' نہ بددل ہوں اہل کتاب کہ اب تو اللہ کے فضل میں سے کچھ بھی ان کی دسترس میں نہیں رہا' وہ تو محرومِ مطلق ہو گئے' وہ تو ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ ہو گئے۔نہیں' ابھی ان کے لیے دروازہ کھلا ہے' ایمان لاؤ محمدﷺ پر اور اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت کے مستحق بن جاؤ۔اور آیت ماقبل میں بھی یہی بات فرمائی گئی ہے۔

اب آگے فرمایا جارہا ہے:﴿ وَاَنَّ الۡفَضۡلَ بِیَدِ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ﴾ ''اور فضل تو کُل کا کُل اللہ کے اختیار میں ہے' جس کو چاہتا ہے دیتا ہے''۔اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرو اور اہل ثابت کرنے کے لیے نیت درست کرلو' تمہارے اندر واقعتاً طلب صادق ہو۔ واقعتاً اگر ہدایت' حق اور خیر کے خواہاں اور طالب ہو تو اللہ تعالیٰ تمہیں ہدایت کی دولت عطا فرمائے گا۔ ﴿وَاللّٰہُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ ﴾ ''اور اللہ بڑے فضل والا ہے''۔اس کے فضل کے خزانے میں کوئی کمی نہیں ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ ہم نے انہیں اپنے فضل سے نواز دیا ہے تو تم محروم ہو گئے ہو۔ ہمارے خزانے تو لامتناہی ہیں' لہٰذا آؤ اور اس فضل خداوندی سے فیض یاب ہو جاؤ!

اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو پورے قرآن مجید پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میں خاص طور پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہا ہوں کہ سورۃ الحدید کے درس کی تکمیل کے ساتھ مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کا جو درس ہم نے ازسرِنو شروع کیا تھا وہ آج اپنی تکمیل کو پہنچ گیا ہے۔

بارك الله لی ولکم فی القرآن العظیم ' ونفعنی وایاکم بالآیات والذکر الحکیم